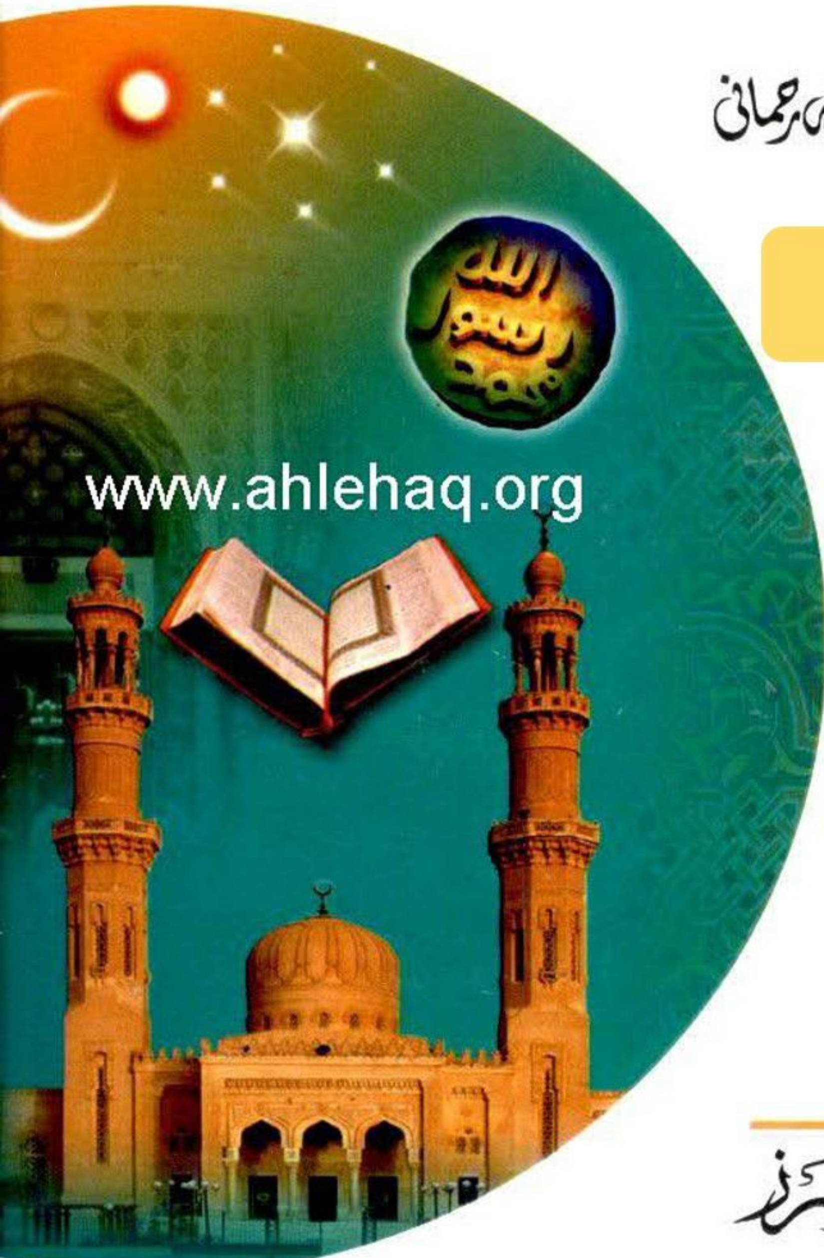
راہِ عمل

۱۔ نقوشِ موعظت
۲۔ حقائق اور غلط فہمیاں
۳۔ نئے مسائل، اسلامی نقطۂ نظر

تالیف
مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

جِلدُ سوم



زمزم پبلشرز

راہِ عمل (۳)

نئے مسائل
اسلامی نقطۂ نظر

جس میں موجودہ دور میں پیش آنے والے جدید
وقدیم مسائل پر دعوتی وتذکیری اُسلوب میں
روشنی ڈالی گئی ہے اور اِسلامی نقطۂ نظر کو
واضح کیا گیا ہے۔

تالیف
مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر
زمزم پبلشرز
نزد مقدس مسجد اُردو بازار کراچی

کتاب کا نام ——— زادِ عمل
نئے مسائل اسلامی نقطۂ نظر

تاریخ اشاعت ——— جون ۲۰۰۹ء

مطبع ——— احباب زمزم پبلشرز

ناشر ——— زمزم پبلشرز کراچی

شاہ زیب سینٹرز ومقدس مسجد، اُردو بازار کراچی

فون: 021-2760374

فیکس: 021-2725673

ای میل: zamzam01@cyber.net.pk

ویب سائٹ: http://www.zamzampub.com

ملنے کے دیگر پتے

- دارالھدیٰ اردو بازار کراچی۔ فون۔ 2726509
- دارالاشاعت، اُردو بازار کراچی
- قدیمی کتب خانہ بالمقابل آرام باغ کراچی
- مکتبہ رحمانیہ، اُردو بازار لاہور

Madrassah Arabia Islamia
1 Azaad Avenue P O Box 9786-1750
Azaadville South Africa
Tel : 00(27)114132786

AL FAROOQ INTERNATIONAL
68, Asfordby Street Leicester LE5-3QG
Tel . 0044-116-2537640

ISLAMIC BOOK CENTRE
119-121 Halliwell Road, Bolton
Bl1 3NE U S A
Tel/Fax . 01204-389080

Azhar Academy Ltd.
54-68 Little Ilford Lane
Manor Park London E12 5QA
Phone 020-8911-9797

فہرست مضامین

پیش لفظ

اس حقیر کے مضامین کا مجموعہ ''راہ عمل'' کا یہ تیسرا حصہ ہے، اس حصہ میں زیادہ تر موجودہ دور میں پیدا ہونے والے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے، خواہ وہ نئی ایجادات کا نتیجہ ہوں، یا سماجی اور معاشی اقدار میں تبدیلیوں کا، ان میں بعض وہ مسائل بھی آگئے ہیں، جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے جدید نہیں ہیں، لیکن وقتاً فوقتاً پیش آنے والے واقعات سے متعلق ہیں، جیسے قنوت نازلہ اور نماز استسقاء وغیرہ، چوں کہ ان کی نوبت گاہے گاہے پیش آتی ہے، اس لئے لوگوں کو ان سے متعلق شرعی احکام واضح کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔
قارئین کو یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ یہ مضامین اخبارات کے لئے لکھے گئے ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ عام لوگ استفادہ کریں، اس لئے ان تحریروں میں علم وتحقیق اور طویل عربی عبارتوں کے بجائے دعوتی اور تذکیری اسلوب اختیار کیا گیا ہے، اور عربی عبارتوں سے گریز کرنے کی کوشش کی گئی ہے، نیز اس بات کی بھی سعی کی گئی ہے کہ مسائل کو خشک قانونی زبان میں بیان کرنے کے بجائے اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو بھی واضح کیا جائے، تاکہ دل کے ساتھ دماغ بھی اسے قبول کرنے کو تیار ہو۔

اس مجموعہ کی ترتیب کے سلسلہ میں عزیزی گرامی قدر مولوی محمد نعمت اللہ قاسمی زادہٗ اللہ علماً نافعاً وعملاً صالحاً مقبولاً کا مجھے بھی شکر گذار ہونا چاہئے اور قارئین کو بھی، کہ انہوں نے ایک تو مختلف جگہوں سے ان مضامین کو اکٹھا کرنے کی زحمت اٹھائی اور نہایت ہی خوش سلیقگی کے ساتھ اسے مرتب کیا، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں زیادہ سے زیادہ دین اور علم دین کی خدمت کی توفیق میسر فرمائے، اور یہ مجموعہ اس حقیر کے لئے بھی اور عزیزی سلمہٗ کے لئے بھی دنیا وآخرت میں فلاح کا باعث بنے۔ آمین۔

۱۲ شعبان ۱۴۲۵ھ

خالد سیف اللہ رحمانی

۱۹ ستمبر ۲۰۰۴ء

خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

عرض مرتب

مذہب اسلام کی اگر چند امتیازی خصوصیات کو شمار کیا جائے، تو ان میں اس کی فطرت انسانی سے ہم آہنگی اور ہر دور اور زمانہ میں انسانیت کو درپیش مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت سے معمور ہونے کی خصوصیت سرفہرست ہوگی، چنانچہ انسانی تاریخ کی یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اسلام نے جس طرح آج سے چودہ سو سال قبل جب کہ دنیا تمدنی ترقی کے اعتبار سے ابتدائی مرحلہ میں تھی۔ لوگوں کے مسائل کو حل کیا اور انہیں شاہراہ زندگی پر چلنے کا سلیقہ سکھایا، اسی طرح آج جب کہ دنیا صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں اپنی معلوم تاریخ میں ترقی کی آخری انتہاء کو پہونچ رہی ہے، اسلام اسی طرح انسانیت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔

اسلام نے اپنے بنیادی عقائد واحکام میں جن چیزوں کا حکم دیا ہے، شریعت کے تفصیلی احکام انہیں بنیادی اصول اور ہدایات کی تطبیق سے عبارت ہیں، کیوں کہ قانون کی پاسداری انسانی فطرت اور اس کا امتیاز ہے اور یہی انسانوں اور جانوروں کے درمیان امتیاز کا ایک بنیادی اور اہم پہلو ہے، چنانچہ جن لوگوں نے اس فطری مذہب اور خدائی قانون کو قبول کرنے سے انکار کیا، اللہ کی کتاب انہیں "جانور بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ" (اولئك كالأنعام بل هم أضل) سے تعبیر کرتی ہے کہ جانوروں کو کسی قانون یا طرز حیات کی ضرورت نہیں۔

اسلام کے دو بنیادی سرچشمے کتاب اللہ (قرآن مجید)، سنت نبوی (حدیث) میں ظاہر ہے کہ موجودہ زمانہ کے تمام مسائل کے بارے میں شرعی حکم کی صراحت نہیں ملتی اور یہی عین قرین مصلحت ہے، کیوں کہ زمانہ اور حالات کے لحاظ سے قانون کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں، لیکن ان میں ایسے اصول وقواعد ضرور بیان کردیے گئے ہیں، جن کی

روشنی میں صبح قیامت تک پیدا ہونے والے مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے اور علماء ــــ جنہیں انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہے ــــ کی ذمہ داری ہے کہ شریعت کے رہنمایانہ اصول وقواعد اور مزاج و مذاق کی روشنی میں جدید مسائل کا حل نکالیں، نئے مسائل کا حل تلاش کرنے والے علماء کے لئے بیک وقت جہاں نصوص شرعیہ پر گہری نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے، وہیں فقہاء کی بیان کردہ جزئیات کے ساتھ ساتھ ان کے مستنبط کردہ اصول و قواعد سے مکمل آشنائی بھی اسی قدر اہمیت رکھتی ہے، اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی نظر اپنے عہد کے حالات اور رواجوں پر بھی ہو۔ مؤلف کتاب حضرت مولانا ہمیشہ ہم لوگوں سے تاکید کرتے کہ فقہاء کی جزئیات تو اپنے حالات و زمانہ کے تابع ہوتی ہیں، آپ کی نظر اصول وقواعد پر ہونی چاہئے، جن پر حالات و زمانہ کا بہت کم اثر ہوتا ہے، مولانا مدظلہ کو اللہ تعالیٰ نے فقہ اسلامی میں جو نہایت اعلیٰ مقام عطا کیا ہے، وہ محتاج بیان نہیں، فکر رسا، ذہن اخاذ اور فکری اعتدال کی صفت سے اللہ نے آپ کو خاص طور پر نوازا ہے، جو اس فن کے حاملین کے لئے خضر طریق کا درجہ رکھتی ہیں، چنانچہ فقہ اسلامی سے متعلق آپ کی تحریریں جہاں علماء کے لئے سامان آسودگی فراہم کرتی ہیں، وہیں عوام بھی زبان وتعبیر کے سہل و عام فہم ہونے کی وجہ سے اس سے اسی قدر استفادہ کرتے ہیں، جدید فقہی مسائل (پانچ حصے) قاموس الفقہ (پانچ جلدیں)، اسلام کا نظام عشر و زکوٰۃ، آپ کی وہ تصنیفات ہیں، جو یقیناً فقہ اسلامی کی لائبریری میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں اور بہت ہی مختصر مدت میں برصغیر کے افق پر نیر تاباں بن کر چھا گئی ہیں۔

پچھلے چھ سالوں سے ہندوستان کے کثیر الاشاعت روزنامہ ''منصف'' حیدرآباد کے جمعہ ایڈیشن مینارۂ نور میں شمع فروزاں کا کالم آپ کے قلم گہر بار سے مزین ہوتا آرہا ہے، جس میں کبھی سماجی مسائل کی طرف رہنمائی کی جاتی ہے، تو کبھی قارئین کو حالات کے پس منظر میں صحیح سمت رہنمائی کی جاتی ہے، اور کبھی آپ اپنے فطری فقہی

ذوق کی مناسبت سے نئے مسائل کے بارے میں اسلامی تعلیمات سے لوگوں کو باخبر کرتے ہیں، فقہی مضامین اس لحاظ سے بھی اسلامی قلم کاروں کے لئے نمونہ ہیں کہ علم و تحقیق کی رعایت کے ساتھ سہل اور بہتر اسلوب تحریر اختیار کیا جائے کہ جس سے عوام و خواص دونوں کو استفادہ میں سہولت ہو۔

یہ کتاب جو ابھی آپ کے ہاتھوں میں ہے، ان ہی فقہی مضامین کا گلدستہ ہے، جس کے غنچۂ دگل ''منصف'' کی سرزمین پر تھے، راقم الحروف نے ان بکھرے ہوئے پھولوں کو مختلف لائبریریوں سے جا کر منصف کی قدیم فائلوں سے اکٹھا کیا ہے، ظاہر ہے کہ اس درمیان احقر خود بھی ان گلہائے سدا بہار کی خوشبو سے عطر بار اور شاد کام ہوا ہے، یقیناً راقم اپنے لئے افتخار و سعادت کا باعث سمجھتا ہے۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ کا سایہ تادیر قائم رکھے، اور یہ کتاب خدا کی بارگاہ میں قبولیت سے نوازی جائے اس کا فیض عام سے عام ہو، اور مصنف کے ساتھ ساتھ احقر کے لئے بھی ذریعہ نجات بنے۔ آمین۔

محمد نعمت اللہ قاسمی

(اسکالر معہد)

بنیادی انسانی حقوق کا اولین منشور

بیسویں صدی کا ابتدائی حصہ انسانی خوں آشامی کے لئے نہایت تکلیف دہ اور ناقابل فراموش زمانہ رہا ہے، جس میں معلوم تاریخ کی دو بڑی لڑائیاں ہوئیں، جو جنگِ عظیم کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔ اس جنگ نے نئی دنیا امریکہ سے لے کر مشرقِ بعید جاپان تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور جنگ کا یہ عفریت اس وقت تک آسودہ خاطر نہیں ہوا جب تک کہ اس نے لاکھوں انسانوں کے خون سے اپنی تشنہ لبی کو دور کرنے کا سروسامان نہ کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی بھی شئی جب اپنی انتہاء کو پہنچ جاتی ہے تو مائل بہ زوال ہونے لگتی ہے، چنانچہ جب یہ جنگی جنون اپنی نہایت پر پہنچ گیا اور انسانیت بلبلا اُٹھی تو درندگی کی اسی شب تاریک سے آدمیت کی ایک کرن طلوع ہوئی اور وہ یہ کہ مختلف ممالک میں انسانی حقوق سے متعلق قانون سازی کا عمل شروع ہوا اور دنیا بھر کے سنجیدہ اور انصاف پسند لوگوں نے یہ آواز اٹھائی کہ کچھ ایسے بنیادی انسانی حقوق ہونے چاہئیں کہ جن کا احترام جنگ و امن ہر دو حالتوں میں ضروری ہو۔ بالآخر یہ خواب اس طرح شرمندۂ تعبیر ہوا کہ ۱۰ ردسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کا منشور مرتب کرنے اور پاس کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اسی پس منظر میں ۱۰ ردسمبر کو عالمی سطح پر ''بنیادی انسانی حقوق'' کے دن کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، ہر چند کہ یہ منشور عملاً ایک کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، کیوں کہ رکن ممالک اول تو اس منشور پر دستخط کرنے اور نہ کرنے کے معاملہ ہی میں آزاد ہیں۔ دوسرے یہ منشور کسی فرد کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس سلسلہ میں اپنے مقدمہ کو بین الاقوامی عدالت میں لے جاسکے، لیکن پھر بھی یہ ایک بڑی کامیابی ہے اور اُمید کی جاسکتی ہے کہ اس میں جو کچھ خامیاں ہیں وہ بتدریج دور ہوسکیں گی۔

یہ منشور تیس دفعات پر مشتمل ہے، جن میں زندگی کا حق، آزادی اور وقار و حقوق کے معاملہ میں مساوات، نسل و رنگ، جنس، زبان اور مذہب کی بناء پر عدمِ تفریق، قانونِ مساوات، عدالتی چارہ جوئی کا حق، بلا جواز گرفتاری یا جلاوطنی کی ممانعت، الزامات کے مقابلہ صفائی کا حق، نجی زندگی کے تحفظ کا حق، ملک کی حدود میں نقل و حرکت اور رہائش کی مکمل آزادی، بیرونِ ملک جانے اور اپنے ملک واپس آنے، شہریت حاصل کرنے، اپنی مرضی سے شادی کرنے، تنہا یا مشترک جائداد رکھنے، ضمیر و عقیدہ اور تبدیلی مذہب، اظہارِ خیال اور اجتماع و تنظیم، اپنے ملک کی سیاست میں حصہ داری، اپنی پسند کے پیشہ کا انتخاب، حصولِ تعلیم وغیرہ کے حقوق کا ذکر ہے، اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً خواتین اور بچوں کے حقوق، نیز نسلی امتیاز اور غلامی کے انسداد کے لئے بھی اقوام متحدہ نے مختلف قرار دادیں منظور کی ہیں، جو گویا اسی منشور کا تکملہ ہیں۔

اگر واقعی دیانت داری کے ساتھ اس منشور کا نفاذ عمل میں آتا، تو یہ انسانیت کے لئے بارانِ رحمت ثابت ہوتا، لیکن افسوس کہ ایسا ہو نہیں پایا، ایک تو یہ تحریک ہی رضا کارانہ ہے، دوسرے مختلف ملکوں نے انسانی حقوق کے الگ الگ پیمانے قائم کر لئے ہیں۔ اقوام متحدہ کی بے بسی کا کھلا ہوا ثبوت ماضی قریب ہی میں یورپ کے قلب ''بوسنیا'' میں ساری دنیا نے دیکھا ہے۔ ۳۰ر نومبر ۱۹۷۳ء کو جب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے نسلی امتیاز کو قابل سرزنش جرم قرار دینے کی غرض سے ایک تجویز پاس کی، تو امریکہ اور برطانیہ بھی اس تجویز کے مخالفین میں تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خود قانون بنانے والوں کی نگاہ میں ان حقوق کی کیا اہمیت ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ آج کل یہ ترقی یافتہ ممالک کی طرف سے ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کو ڈرانے، دھمکانے اور ان کا استحصال کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور بس۔

مسلمانوں کی تصویر آج کچھ اس طرح مسخ کر دی گئی ہے کہ لوگ ''مسلمان'' اور ''دہشت گرد'' کو مترادف الفاظ تصور کرنے لگے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اسلام میں انسانی قدروں کے احترام کا کوئی تصور نہیں ہے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ علم و دانش کی موجودہ

دُنیا کو انسانی حقوق کا سب سے پہلا سبق اسلام ہی نے پڑھایا اور آج دُنیا میں جو کچھ انسانی حقوق کی بات کی جارہی ہے، وہ دراصل اسلام کے عقیدۂ توحید اور مساواتِ انسانی کے تصور کی بازگشت ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر جو جامع خطبہ ارشاد فرمایا تھا، وہ بنیادی انسانی حقوق کے لئے متن کا درجہ رکھتا ہے۔ اس خطبہ کے چند اقتباسات کچھ اس طرح ہیں:

○ لوگو! تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ تم میں سے اللہ کے نزدیک معزز وہ ہے جو زیادہ تقویٰ شعار ہے، کسی عربی کو کسی عجمی پر تقویٰ کے سوا فضیلت نہیں۔ ہاں جاہلیت کے تمام دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں اور جاہلیت کے تمام آثار و مفاخر ختم کئے جاتے ہیں، صرف سدانہ (کعبہ کی نگرانی و نگہبانی) اور سقایہ (حاجیوں کو پانی پلانے) کے عہدے باقی رہیں گے۔

○ قتل عمد کا بدلہ قصاص ہے، عمد کے مشابہ وہ قتل ہے جو لاٹھی یا پتھر سے وقوع میں آئے، اس کی دیت سو اونٹ مقرر ہے، جو زیادہ چاہے گا وہ اہلِ جاہلیت میں سے ہوگا۔ اہلِ قریش! ایسا نہ ہو کہ خدا کے حضور تم اس طرح آؤ کہ تمہاری گردنوں پر دُنیا کا بوجھ لدا ہوا ہو، جب کہ دوسرے لوگ سامانِ آخرت لے کر پہنچیں اور اگر ایسا ہوا تو میں خدا کے سامنے تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا، اہلِ قریش! خدا نے تمہاری جھوٹی نخوت کو خاک میں ملا دیا ہے اور باپ دادا کے کارناموں پر تمہارے لئے تفاخر کی کوئی گنجائش نہیں رکھی۔

○ لوگو! تمہارا خون اور تمہارا مال تمارے لئے حرام (محترم) ہیں، یہاں تک کہ قیامت میں خدا کے سامنے پیش ہو، جس طرح اس دن اور اس مہینے کی حرمت تمہاری نزدیک مسلم ہے، اور عنقریب تم سب خدا کے آگے جاؤ گے، پس وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس فرمائے گا۔

○ تمام سودی کاروبار آج سے ممنوع قرار پاتا ہے، البتہ تم کو اپنی اصل رقم لینے کا حق ہے، جس میں نہ اوروں کا نقصان ہے اور نہ تمہارا۔ اللہ نے یہ بات طے کر دی ہے کہ سود کی گنجائش نہیں اور جہاں تک عباس (ابن عبدالمطلب) کے سود کا تعلق ہے، تو میں ان

تمام سود کو باطل کرتا ہوں، اور زمانۂ جاہلیت کے خون کے سارے انتقام اب کالعدم ہیں اور (اپنے خاندان میں سے) پہلا انتقام جسے میں معاف کرتا ہوں ربیعہ بن الحارث کے دودھ پیتے بچے کا، جسے بنو ہذیل نے قتل کر دیا تھا۔

○ قرض قابلِ ادائیگی ہے، عاریتاً لی ہوئی چیز واپس کرنی چاہئے، تحفہ کا بدلہ دینا چاہئے اور جو کوئی کسی کا ضامن بنے تو اسے تاوان ادا کرنا چاہئے۔

○ لوگو! تمہارے اوپر جس طرح تمہاری عورتوں کے حقوق ہیں اسی طرح ان پر تمہارے کچھ حقوق واجب ہیں، عورتوں پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی ایسے شخص کو نہ سلائیں جسے تم پسند نہیں کرتے اور وہ کوئی بے حیائی کا کام نہ کریں، پس اگر وہ ایسا کریں تو خدا کی جانب سے اس کی اجازت ہے کہ تم انہیں بستروں پر اکیلا چھوڑ دو اور ایسی مار مارو جو زیادہ تکلیف دہ نہ ہو، پھر اگر وہ باز آجائیں تو (حسب حیثیت) ان کا کھانا، کپڑا تمہارے ذمہ ہے۔ پس عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو اور ان سے بہتر سلوک کرو، کیوں کہ وہ تمہاری پابند ہیں اور خود اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتیں، تم نے ان کو خدا کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے اور اسی کے نام پر وہ تمہارے لئے حلال ہوئی، اور کسی عورت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کا مال اس کی اجازت کے بغیر کسی کو دے۔

○ لوگو! میری بات سنو اور سمجھو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے کچھ لے، سوائے اس کے جو اس کا بھائی برضاء ورغبت عطا کردے۔ اپنے نفس اور دوسروں پر زیادتی نہ کرو۔

○ اور ہاں تمہارے غلام! ان کا خیال رکھو، جو تم کھاؤ اس میں سے ان کو کھلاؤ، جو تم پہنو اسی میں سے ان کو پہناؤ، اگر وہ کوئی ایسی خطا کریں جسے تم معاف نہ کرنا چاہو تو اللہ کے بندو! انہیں فروخت کر دو اور انہیں سزا نہ دو۔

○ لوگو! سنو اور اطاعت کرو، اگر چہ تم پر کوئی نکٹا حبشی غلام ہی کیوں نہ امیر بنا دیا جائے، جو تم پر کتاب اللہ کو قائم کرے۔

غور کیا جائے تو آپ ﷺ کا یہ خطبہ بنیادی انسانی حقوق کا اصل منشور ہے، جس

میں انسانی مساوات، جرم وسزا میں یکسانیت، انسانی زندگی کا احترام، معاشی استحصال کی ممانعت، مال وجائداد کا تحفظ، ہر شخص کی دوسرے کے جرم سے براءت، عورتوں کے حقوق، غلاموں کے حقوق اور سیاسی مساوات کا واضح اعلان واظہار ہے۔ اسلام نے ان حقوق کو محض کاغذی پیرہن عطا نہیں کیا، بلکہ اس کو برت کر دکھایا، کمزوروں کی دادرسی کی اور پست کو بلند کیا۔ قرآن وحدیث میں اور پھر قرآن وحدیث سے اخذ کر کے کتب فقہ میں انسانی بنیادی حقوق کو اتنی وضاحت وتفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے اوران کو سامنے رکھ کر ایک پورا قانونی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا ہے کہ شاید کہیں اوراس کی مثال مل سکے۔ اسلام نے حقوق کو صرف دنیا ہی سے متعلق نہیں رکھا، بلکہ ان حقوق کی ادائیگی اورعدم ادائیگی سے آخرت کے احتساب کے تصور کو بھی وابستہ رکھا۔ یہ تصور انسان کو ان حقوق کے بارے میں زیادہ سنجیدہ بناتا ہے، اس لئے اگر دنیا کو واقعی انسانی حقوق کی پاسداری مطلوب ہے، تو اسے اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع کرنا چاہئے، کہ اسلام کسی ایک قوم کی میراث نہیں، بلکہ پوری انسانیت کی امانت ہے۔

(۱۱؍دسمبر ۱۹۹۸ء)

بین قومی اتحاد ——— اسلام کی نظر میں

دنیا میں دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء جاری رہی، اس جنگ نے پوری دنیا کی کمر توڑ دی، مفتوحین تو کیا فاتحین کے بھی ہوش ٹھکانے لگ گئے، نہ جانے، کتنی بے قصور جانیں جنگ کے اس مہیب وخوں آشام عفریت کی غذا بن گئیں، نازیوں کی یہود دشمنی میں کتنے یہود کام آئے؟ اس کی صحیح تعداد جاننا مشکل ہے، اڑسٹھ لاکھ سے زیادہ تو وہ یہودی تھے جن کو گیس چیمبروں میں ڈال کر فنا کر دیا گیا، یہ گویا ایک پوری قوم اور نسل کو تہہ تیغ کر دینے کی شیطانی سازش تھی، ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر اب تک کی تاریخ میں اور آخری بار ایٹم بن گرایا گیا، اس سے ہونے والی تباہ کاری یہودیوں کی نسل کشی سے بھی آگے بڑھ گئی اور افسوس کہ یورپ نے اس واقعہ پر افسوس کرنے کی بجائے چراغاں کیے اور خوشیاں منائیں، آخر اگست ۱۹۴۵ء میں یہ جنگ اختتام کو پہونچی، اس سے پہلے ۲۴؍ جون ۱۹۴۵ء کو ۵۰؍ ممالک کے نمائندوں نے بین الاقوامی امن اور صلح کی غرض سے سان فرانسسکو میں ایک اجتماع منعقد کیا تھا، اب چار ماہ بعد ۲۴؍ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو اگلا اجلاس منعقد ہوا، جس میں اقوام متحدہ کے منشور پر پچاس ممالک نے دستخط کیے، اور اس طرح ادارہ ''اقوام متحدہ'' کا وجود عمل میں آیا، اقوام متحدہ اس نوعیت کا پہلا ادارہ نہیں تھا، بلکہ اس سے پہلے ۱۹۱۹ء میں صدر امریکہ مسٹر ویلن کی تحریک پر لیگ آف نیشنس (مجلس اقوام) قائم ہو چکی تھی، جس میں دنیا کے پچیس ممالک شامل تھے، لیکن دوسری جنگ عظیم کو روکنے میں ناکام ہونے کی وجہ سے عملاً اس تنظیم کا خاتمہ ہو گیا، اور دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ نے اس کی جگہ لی، اب اس وقت اقوام متحدہ کی رکن ممالک کی تعداد ایک سو پچاسی ۱۸۵ تک پہونچ چکی ہے، گو عملاً یہ عالمی تنظیم محض پانچ ممالک، امریکہ، برطانیہ، چین، روس اور

فرانس کی یرغمال ہے، لیکن بہر حال عالمی سطح پر انسانی مسائل حل کرنے کے لئے ادارہ کا وجود ایک ضرورت ہے۔

اقوام متحدہ کے قیام کا مقصد ظاہر ہے کہ عالمی سطح پر انصاف کا حصول، قوموں کو قانون جنگ کا پابند رکھنا، انسانی حقوق کا تحفظ اور متصادم اقوام و ممالک کے درمیان صلح و صفائی کی کوشش، نیز انسانی بنیادوں پر مصیبت زدہ انسانوں کی مدد کرنا ہے، گو یہ کہنا مشکل ہے کہ اقوام متحدہ ان مقاصد کو حاصل کرنے میں کس حد تک کامیاب ہے؟ اور کیا طاقت ور ممالک کو بھی عدل و انصاف کا پابند بنانے میں اس نے کامیابی حاصل کی ہے؟ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ یہ نہایت اہم اور اعلیٰ مقاصد ہیں، اور موجودہ حالات میں جب کہ پوری دنیا ایک گھر بن چکی ہے، بہ مقابلہ پہلے کے اس کی اہمیت کہیں بڑھ گئی ہے، اس پس منظر میں ہمیں دیکھنا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں ایسی بین قومی وحدت کی کیا اہمیت ہے؟ اور اسلام اس سلسلہ میں کیا تصور رکھتا ہے؟۔

امن و امان کا قیام اور عدل و انصاف کی فراہمی اسلام کے اہم ترین مقاصد میں سے ایک ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن کی جس آیت میں عدل و احسان کا حکم دیا گیا ہے، اس کو خطبۂ جمعہ کا جزو بنا دیا گیا اور ہر جمعہ کو یہ آیت پڑھی جاتی ہے، ان اللہ یامر بالعدل والاحسان ،(النحل:۹۰) قرآن مجید ہمیں تلقین کرتا ہے کہ کسی کی عداوت و دشمنی بھی تمہاری طرف سے عدل و انصاف کی راہ میں رکاوٹ بننے نہ پائے، لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ اَلَّا تَعْدِلُوْا (المائدہ:۸) اس لئے قیام امن کی جو بھی سعی ہوگی وہ اسلام کی نگاہ میں پسندیدہ اور مطلوب ہوگی، قرآن نے اپنے آپ پر یقین کرنے اور اس کی تعلیمات کو تسلیم کرنے والوں کے لئے دو الفاظ استعمال کئے ہیں، مومن اور مسلم، ''مومن'' امن سے ماخوذ ہے، اور اس کے معنی ہی ہیں: دوسرے کو امن دینے والے کے، اور مسلم ''سلم'' سے ہے، جس کے معنی صلح اور بچاؤ کے ہیں، گویا مسلم وہ ہے جس سے دوسرے لوگ حفاظت و سلامتی میں رہیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کی نظر میں امن و امان اور صلح و آشتی کی کیا

اہمیت ہے؟

خود رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بھی اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں، اسی سلسلہ کی ایک کوشش نبوت سے پہلے ہوئی، جس کو "حلف الفضول" کہتے ہیں، اس تحریک میں آپ پیش پیش رہے، ہوا یوں کہ بنو زبید کے ایک صاحب مکہ آئے ہوئے تھے، ان سے عاص بن وائل نامی شخص نے ایک سامان خریدا، اور سامان کی قیمت ادا کرنے سے مکر گئے، زبیدی نے ہزار ہا کوشش کی اور مکہ کی باا ثر شخصیتوں سے رابطہ کیا، لیکن کسی نے اس کی بات پر کان نہ دھرا، بالآخر اس شخص نے عربوں کے قدیم طریقہ کے مطابق ٹھیک طلوعِ آفتاب کے وقت بوقبیس کی پہاڑی پر چڑھ کر اپنی فریاد بلند کی، اہل مکہ عام طور پر اس وقت کعبہ کے گرد وپیش بیٹھے رہتے تھے، اس فریاد نے لوگوں کو چونکا دیا، زبیر بن عبد المطلب اٹھے اور مکہ کے شریف لوگوں کو عبد اللہ بن جدعان کے مکان میں جمع کیا، اور طے کیا کہ ہم کسی شخص پر ظلم نہ ہونے دیں گے، اور مظلوموں کو ان کا حق دلائیں گے، چنانچہ عاص بن وائل سے سامان واپس لیا گیا، اور زبیدی کو اس کا سامان حوالہ کیا گیا، اس وقت عمر مبارک بیس سال تھی، آپ ﷺ بھی اس انجمن میں ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے شریک ہوئے، اتفاق سے اس معاہدہ میں اشرافِ مکہ میں تین ایسے لوگ شریک تھے جن کا نام فضل تھا، اسی مناسبت سے یہ تنظیم "حلف الفضول" کہلائی، نبوت کے بعد بھی آپ ﷺ اس کا ذکر فرماتے اور کہتے کہ آج بھی مجھے اس کی طرف دعوت دی جائے تو میں اس کو قبول کروں گا۔

(البدایہ والنھایہ لابن کثیر: ۲/۹۳۔۲۹۱)

ا۔ سیرت میں اس سلسلہ کا دوسرا واقعہ وہ ہے جس کو "میثاقِ مدینہ" سے موسوم کیا جاسکتا ہے، آپ ﷺ جب مکہ سے مدینہ تشریف لائے، تو وہاں ایک گروہ مہاجرین و انصار کا تھا، جو آپ ﷺ پر ایمان لا چکے تھے، اور دوسرا گروہ یہودیوں کا تھا، جو اہلِ کتاب میں سے تھے، اور غالباً خال خال مشرکین بھی موجود تھے، آپ ﷺ نے ان کے درمیان معاہدہ کرایا، اس معاہدہ کی رو سے مدینہ میں بسنے والی تمام مذہبی اور خاندانی اکائیوں کو مذہبی آزادی دی گئی، جان و مال کے تحفظ کے حق کو تسلیم کیا گیا، اور یہ بات

طے پائی کہ اگر مدینہ پر باہر سے کوئی دشمن طاقت حملہ آور ہو، تو سب مل کر دفاع کا فرض انجام دیں گے، نیز اس معاہدہ میں ان لوگوں کو بھی شریک کیا گیا جو کسی فریق کے ساتھ دوستی کا معاہدہ رکھتے ہیں۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے: البدایہ والنہایہ لابن کثیر: ۲۲۵/۳)

صلح حدیبیہ کا مقصد بھی بین قومی امن وامان کا قیام ہی تھا، یہ بات محتاج اظہار نہیں کہ مسلمانوں نے طاقت ور ہونے کے باوجود مشرکین مکہ کی تمام شرطوں کو قبول کرتے ہوئے یہ صلح کی، بعض حضرات کا خیال تھا کہ صلح کی یہ شرطیں یک طرفہ ہیں، اسی لئے حضرت عمرؓ وغیرہ کو صلح پسند نہیں تھی، لیکن جنگ کے ماحول کو ختم کرنے اور امن کو حاصل کرنے کی غرض سے آپ ﷺ نے بہ ہر قیمت صلح فرمائی، یہ صلح نہ صرف مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان تھی، بلکہ ان دو فریقوں کی جن عرب قبائل سے مصالحت ہو، آپ ﷺ نے ان کو بھی صلح میں شریک قرار دیا، اس طرح اس ''میثاق امن'' کا دائرہ پورے جزیرۃ العرب تک وسیع ہوگیا، یہ صلح بھی بقاء باہم اور ایک دوسرے کے بنیادی حقوق اور آزادی کے احترام کے اصول پر مبنی تھی۔

اس لئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسلام نے ڈیڑھ ہزار سال پہلے عالمی امن اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کسی ادارہ اور تنظیم کی تشکیل کا تصور دیا ہے، مجلس اقوام ہو یا اقوامِ متحدہ، یا اس طرح کی دوسری تنظیمیں، وہ اسی تصور کی بازگشت ہیں، یہ عجیب بدبختی ہے کہ اس وقت اقوام متحدہ کو کچھ مغربی اقوام نے اغواء کیا ہے، جن کے دباؤ کی وجہ سے نا منصفانہ فیصلے ہوتے ہیں، اسرائیل کئی ملکوں کی سرحدات کو پار کر کے عراق کے نیوکلیر مرکز پر حملہ کرسکتا ہے، امریکہ غیر قانونی طور پر سوڈان اور افغانستان کے اندرونی علاقوں کو نشانہ بنا سکتا ہے، روس چیچنیا میں معصوم شہریوں کو دیوانہ وار ہلاک کر رہا ہے، بوسینیا اور کوسوو میں روس نے ننگی جارحیت کا علانیہ تعاون کیا ہے اور نہ جانے کتنے ہی چھوٹے ممالک اور کمزور اقوام ہیں کہ بڑی طاقتوں کے ہاتھ ان کے خون سے رنگین ہیں، اس کے باوجود فلسطین اور چیچنیا کے مظلوم مسلمان تو دہشت گرد کہلاتے ہیں، اور امریکہ و روس امن وانسانیت کے

علمبراد، اور یہ ساری ظالمانہ اور غیر انسانی حرکتیں خود اقوام متحدہ کے زیر سایہ انجام پا رہی ہیں۔ اسلام یقیناً عالمی امن اور بین قومی اتحاد و یکجہتی کا علمبردار ہے، لیکن وہ صاف وشفاف عدل اور مساویانہ سلوک و برتاؤ کا داعی اور نقیب ہے، اور حقیقی عالمی امن کا قیام ان اصولوں کے بغیر ممکن نہیں۔

اسلام اور تصوّرِ آزادی

آج کل شہروں میں چڑیا خانے (Zoo Logical Park) بنے ہوتے ہیں، ان چڑیا خانوں کی تزئین و آرائش اور حفاظت وصیانت پر بہت بڑی رقم خرچ ہوتی ہے، پورا چڑیا خانہ رنگ برنگ کے خوب صورت اور مہکتے ہوئے پھولوں، لمبے، ہرے بھرے درختوں اور پانی کی چھوٹی چھوٹی جھیلوں کی وجہ سے خوش منظر بنا رہتا ہے، پھر انواع واقسام کے حیوانات اور پرندوں کے لئے الگ الگ احاطے بنے ہوتے ہیں، جانوروں کی دیکھ بھال اور آسائش کا جو انتظام ان چڑیا خانوں میں ہوتا ہے، یقیناً وہ ان کو جنگلات میں بھی میسر نہیں، اپنی غذا کے لئے نہ ان کو شکار تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور نہ چارہ ڈھونڈھنے کی حاجت، بلکہ خود چڑیا خانہ کا عملہ ان کی غذائی ضروریات وقت پر اور فراوانی کے ساتھ فراہم کرتا ہے، حفظانِ صحت کی جو رعایت یہاں کی جاتی ہے، جنگلات میں ان کا میسر آنا ممکن نہیں، باضابطہ ڈاکٹر اور معالج متعین ہیں، بلکہ ان کے علاج کی اتنی فکر کی جاتی ہے کہ انسانوں کے لئے بھی اتنی فکر نہیں کی جاتی، جانوروں کی حفاظت وصیانت کا بھی اعلیٰ درجہ کا نظام موجود ہے، نہ کسی جانور کو اس کا خطرہ ہے کہ اس سے زیادہ طاقت ور جانور اسے اپنی خوراک بنالے گا، نہ شکاریوں سے کوئی خوف ہے، غرض حیوانات کی ضروریات کی تکمیل اور ان کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو چڑیا خانے ان کے لئے ایسی راحت گاہ ہیں کہ انسانوں کو بھی ایسی سہولت وآسائش میسر نہیں۔

لیکن اگر کسی شخص کو جانور کی زبان آتی، وہ ان سے ہم کلام ہوسکتا اور ان جانوروں سے ان کی دلی آرزو اور سب سے پیاری خواہش کے بارے میں سوال کرتا تو یقیناً ان کا جواب یہی ہوتا کہ خدارا مجھے اس خوب صورت، آراستہ و پیراستہ ''سونے کے قفس'' سے

نکال کر بے ترتیب اور انسان کے ذوق خوش آرائی سے محروم جنگلات میں پہنچا دو، جہاں گو وقت پر کھانا نہیں آئے گا، اپنی خوراک کے لئے دوڑ بھاگ کرنی ہوگی اور علاج کے لئے کوئی ڈاکٹر بھی میسر نہیں ہوگا، ایسے خوش رنگ، سجے سجائے، سنوارے اور دلہن بنائے گل بوٹے نظر نہیں آئیں گے، مگر پھر بھی ہم "آزاد" ہوں گے، حصار بندیوں نے مجھے قید نہیں کیا ہوگا، میں اپنی مرضی سے ہر جگہ آنا جانا کر سکوں گا۔

جب حیوانات جو عقل وشعور کے اعتبار سے بمقابلہ انسان بہت ادنیٰ درجہ کی مخلوق ہے، کے اندر آزادی کی ایسی طلب بلکہ تڑپ ہے، تو انسان میں اس کا داعیہ کتنا شدید ہوگا، وہ محتاجِ اظہار نہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال جیل اور قید خانے ہیں، یہاں قیدیوں کی اکثر بنیادی ضروریات پوری کی جاتی ہیں، لیکن اس کے باوجود ہر قیدی رہائی کے لئے بے چین اور بے قرار رہتا ہے۔ اس لئے آزاد رہنے کی خواہش انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے۔ جب کوئی قوم دوسری قوم پر غلبہ پالیتی ہے تو اپنی غلامی کا احساس اس کو تڑپاتا رہتا ہے، اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے آپ سے محروم کر دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں آزادی کی جدوجہد اور غلامی سے نجات کی کوشش میں بیشمار اور بے پناہ قربانیاں دی گئی ہیں، جان و مال کی، اولاد کی، گھر وبار کی اور بعض مواقع پر عزت ووقار کی بھی، خود ہمارا ملک ہندوستان اس کی روشن مثال ہے، قفس چاہے سونے کا ہو وہ قفس ہی ہے، وہ انسان کی طبعِ آزاد پسندی سیری کا سامان نہیں۔

اسی لئے اسلام نے آزادی کو انسان کا فطری اور پیدائشی حق تسلیم کیا ہے، وہ تمام انسانیت کو بحیثیت انسان مساوی قرار دیتا ہے، اس لئے کسی انسانی طبقہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کو اپنا غلام بنالے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس انقلابی تصور کا اعلان اس طرح فرمایا:

> "اے لوگو! تمہارا رب ایک ہی ہے اور تم سب ایک ہی باپ کی اولاد ہو، تم سب آدم سے پیدا کئے گئے اور آدم کی تخلیق مٹی سے کی گئی ہے، تم میں اللہ کے نزدیک سب سے شریف اور باعزت وہ ہے جو سب سے

زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والا ہو، کسی عرب کو کسی عجمی پر تقویٰ کے علاوہ کسی اور سبب سے کوئی فضیلت نہیں ہو سکتی۔''

یہ توحید اور انسانی وحدت کا عقیدہ وہ انقلابی عقیدہ ہے جو نسلی، خاندانی جغرافیائی اور لسانی بنیادوں پر ایک طبقہ کے دوسرے انسانی طبقہ کو غلام بنانے، ان کو کمتر سمجھنے اور اپنے تئیں برتری کے احساس کی بنیاد ہی کو منہدم کر دیتا ہے۔

یہ مذہبی خوش عقیدگی اور مبالغہ آرائی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ گذشتہ چند صدیوں میں انسان کے حق آزادی اور مساوات و برابری کا جو تصور ابھرا ہے، وہ دراصل اسلامی تعلیمات ہی کا اثر ہے۔ اسلام جس وقت دنیا میں آیا اس وقت، بادشاہت اور ملوکیت کا تصور ذہنوں پر چھایا ہوا تھا، اس وقت دنیا میں جتنی قابل ذکر حکومتیں تھیں وہ سب خاندانی بادشاہت کے نظام پر مبنی تھیں، ایران و روم کی حکومتیں اسی تصور پر قائم تھیں، ہندوستان اور چین میں بھی ایسی ہی چھوٹی بڑی ریاستیں تھیں، لوگ اس کے اس قدر خوگر ہو چکے تھے کہ جمہوریت اور آزادی کے تصور سے بھی وہ محروم تھے۔

یورپ افلاطون اور اس کے شاگرد ارسطو کو جمہوری طرز فکر کا بانی تصور کرتا ہے اور افلاطون کی کتاب ''جمہوریت'' (Republic) کو اس موضوع پر پہلی کتاب خیال کیا جاتا ہے، لیکن افلاطون کے جمہوری تصور کا حال یہ ہے کہ اس کے نزدیک صرف فلاسفہ کو حکمرانی کا حق حاصل ہے اور وہ سماج کے بقیہ افراد کو فوجیوں، کاشتکاروں اور غلاموں میں تقسیم کرتا ہے، اس کے نزدیک ان سب کی تخلیق کا خمیر بھی الگ الگ ہے، فلاسفہ کو خدا نے سونے سے بنایا ہے، ان کے معاونین کو چاندی سے، پھر کاشتکار اور دستکار وغیرہ کو لوہے اور پیتل سے'' یہ ہے جمہوریت اور انصاف کا وہ تصور جو افلاطون نے پیش کیا ہے۔

افلاطون کے بعد مشہور فلسفی اور افلاطون کے شاگرد ''ارسطو'' کو نظام جمہوری کا مفکر تصور کیا جاتا ہے۔ ارسطو کے یہاں سماج کی طبقاتی تقسیم اتنی نمایاں ہے کہ ایک دانشور سے ایسے غیر منصفانہ خیالات کا صدور حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ ارسطو کا خیال ہے کہ ''غریب امیروں کے پیدائشی غلام ہیں، وہ بھی، ان کی بیویاں بھی اور ان کے بچے بھی۔''

ارسطو کو مساوات اور حکومت میں غریبوں کی شرکت نہایت ناگوار خاطر ہے۔ جب فلاسفہ روزگار اور دانش ورانِ عصر کے فکر ونظر کا یہ حال ہو تو عام لوگوں کی سوچ کا اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ اسلام ہے جس نے انسانی وحدت اور تکریم آدمیت کا انقلابی پیغام دیا اور اسکو برت کر دکھایا اور آج پوری دنیا میں آزادی کے تصور نے جو تقویت پائی ہے، وہ یقیناً اسی انقلابی فکر کی بازگشت ہے۔ انسانی وحدت کا تصور مسلم سماج میں ایک عقیدہ کی طرح رچ بس گیا تھا اور ایک معمولی سے معمولی انسان فرماں روائے وقت کے خلاف اپنی زبان کھولنے اور اپنا مقدمہ پیش کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتا تھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ہم لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تھے کہ مصر کے ایک قبطی نے فریاد کی، آپ رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا تو اس نے کہا: عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مصر میں گھوڑ دوڑ کرائی، جس میں میرا گھوڑا آگے نکل گیا اور لوگوں نے اسے دیکھا بھی، مگر محمد بن عمرو بن العاص کہنے لگے کہ بخدا! یہ میرا گھوڑا ہے، وہ جب قریب آئے تو میں نے انہیں پہچان کر کہا کہ نہیں بخدا وہ میرا گھوڑا ہے، اس پر مجھے کوڑوں سے مارنے لگے، انہوں نے کہا کہ جانتے نہیں کہ میں ''ابن الاکرمین'' (شریف زادہ) ہوں۔

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا اچھا بیٹھو! پھر عمر بن العاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ میرا خط دیکھتے ہی تم اور تمہارے بیٹے محمد حاضر ہو جائیں، راوی کہتا ہے کہ عمر بن العاص رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو بلا کر پوچھا کہ کیا تم نے کوئی جرم کیا ہے؟ اس کے بعد وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہو گئے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے پاس تھے کہ عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ کو ایک لنگی اور چادر میں آتے دیکھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ دیکھنے لگے کہ انکا بیٹا بھی ساتھ ہے یا نہیں، جو ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصری کو بلایا اور حکم دیا کہ درّہ لے کر ابن الاکرمین (شریف زادہ) کی خبر لو، راوی کہتا ہے کہ اس نے اسے اچھی طرح مارا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ عمر کے سر پر بھی گھماؤ، کیوں کہ انہیں کے سہارے پر اس نے تمہیں مارا تھا، مصری کہنے لگا کہ میں مارنے والے کو مار چکا، حضرت

عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر تم انہیں مارتے تو میں بیچ میں نہ پڑتا، جب تک کہ تم ہی نہ انہیں چھوڑ دیتے، پھر فرمایا عمرو! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا، حالاں کہ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا؟ پھر مصری کی طرف متوجہ ہوکر کہا کہ اطمینان سے جاؤ، اگر کوئی بات پیش آئے تو مجھے لکھنا۔ (سیرت عمر بن جوزی: ۹۷-۸۶)

دنیا نے بہت بعد کو آزادی کی لذت چکھی ہے، روس تو ۱۷۵۰ء میں بھی شکوہ سنج تھا کہ ''انسان آزاد پیدا ہوا تھا، لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔'' یہ عجیب بات ہے کہ مغربی اقوام جو آج حقوقِ انسانی، حقِ آزادی اور جمہوریت کا سہرا اپنے سر باندھے ہوئی ہیں، نصف صدی پہلے تک انہوں نے ہی نصف دنیا سے زیادہ حصہ کو اپنا غلام بنایا تھا اور اب بھی دنیا کے بعض خطوں کو وہ اپنی نوآبادی بنائے ہوئے ہیں۔ ۳۰/نومبر ۱۹۷۳ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے نسل پرستی کو قانونی جرم قرار دینے کے سلسلے میں ایک قرارداد منظور کی، تو چار ملکوں نے اس کی مخالفت کی اور حیرت کے کانوں سے سنئے کہ ان چار ملکوں میں جنوبی افریقہ اور پرتگال کے ساتھ امریکہ اور برطانیہ بھی تھا۔ آج بھی امریکی صدر کے لئے ضروری ہے کہ وہ گوری نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ ہیں آزادی اور انسانی حقوق کے عالمی ٹھکیدار!!

یہ ایک حقیقت ہے اور اس کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ خود ہمارے ملک ہندوستان میں آزادی کی لڑائی مسلمانوں نے شروع کی۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی جو ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک نوے سال پر مشتمل ہے، اس کا پہلا نصف حصہ یعنی ۴۵/سال زیادہ تر مسلمانوں ہی کی قربانی سے عبارت ہے اور اس عرصہ میں ملک کا کوئی چپہ نہیں جس کو مسلمانوں نے اپنے خون اور لہو کا نذرانہ پیش نہ کیا ہو، جنگ آزادی کا یہ حصہ جس میں سب سے زیادہ خوں ریزی اور تباہی و بربادی ہوئی، مسلمانوں کے مذہبی طبقہ کی قربانیوں اور فدا کاریوں کی تاریخ ہے، سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، ان کے عالی ہمت خلفاء، علماء صادق پور، مولانا فضل حق خیرآبادی اور کتنے ہی علماء و مشائخ ہیں جنہوں نے اس عہد میں جان و مال کی زبردست قربانیاں دی ہیں۔

اگلے پینتالیس سال میں جو مسلمان جنگ آزادی میں شریک ہوئے ان میں غالب اکثریت علماء اور اہل دین کی تھی، خلافت کمیٹی، جمیعۃ علماء ہند، مجلس احرار وغیرہ تو قائم ہی اسی مقصد کے لئے ہوئیں، افسوس کہ لوگ ان تحریکوں کو فراموش کر گئے، انہوں نے صرف کانگریس کو یاد رکھا، جو محض انگریز کی خوشامد اور ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان روابط کو پروان چڑھانے کی غرض سے قائم کی گئی تھی، ریشمی رومال تحریک اور ہندوستان کی جلاوطن حکومت میں بھی زیادہ حصہ علماء اور خصوصیت سے شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کے شاگرد مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا تھا۔ علماء اور مسلمانوں کے مذہبی طبقہ کی تحریک آزادی میں یہ پر جوش شرکت اور قربانی کچھ اس لئے نہیں تھی کہ ان کو آئندہ حکومت میں حصہ داری کی طمع تھی اور وہ وزارتوں میں اپنا حصہ چاہتے تھے، انہوں نے یہ سب کچھ تحسین وتعریف کی تمنا اور عہدہ اور مال وزر کی حرص وطمع سے آزاد ہو کر صرف اللہ کو راضی کرنے کے لئے کیا تھا، کیوں کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ آزادی ہر انسان کا فطری اور پیدائشی حق ہے اور کسی قوم کو غلام ومحکوم بنا لینا ایک ایسا ظلم ہے کہ اس کے خلاف آواز اٹھانا ''جہاد'' اور اس راہ میں اپنے آپ کو قربان کرنا ''شہادت'' ہے۔

عدل کے نفاذ میں مساویانہ سلوک

گذشتہ کئی ہفتوں سے مشہور سیاسی قائد جناب بال ٹھاکرے کی گرفتاری اور ان کے مقدمہ نے ایسی ہنگامہ خیز اور حشر انگیز صورت اختیار کر لی کہ گویا بکریوں کے ریوڑ میں کوئی شیر گھس آیا ہو، کمزور دل کمزور تن اور کمزور حوصلہ بکریاں چاہتی ہوں کہ شیر کو اس کی چیرہ دستیوں پر سزا دی جائے۔ اور کیفر کردار تک پہونچایا جائے، لیکن کسی کو ہمت نہ ہوتی کہ آگے بڑھ کر اس طاقت ور اور ظالم صفت کا ہاتھ تھام سکے، یہ ہے ہمارے ملک کی جمہوریت، قانون کی بالادستی، اور انصاف کی حکمرانی! اگر کوئی مسلمان، عیسائی یا دلت جناب بال ٹھاکرے کے مقابلہ دس فیصد کم ہی مجرم ہوتا تو شاید اسکا پولیس انکاؤنٹر ہو چکا ہوتا، ورنہ ٹاڈا کے تحت ضرور وہ موت سے زیادہ تکلیف دہ اذیتوں کا مستحق گردانا جاتا۔ لیکن یہاں ایک شخص علانیہ اپنی مجرمانہ روش پر مصر ہے۔ اور ملک کے پورے نظام قانون کو چیلنج کر رہا ہے، لیکن اس کے باوجود کیا مجال کہ کوئی اس کی زبان روک سکے، اور اس کے ہاتھ باندھ سکے۔

تمام افراد اور قوموں کے ساتھ عدل کا منصفانہ رویّہ اور انصاف کا برتاؤ اس ملک کی حفاظت کی ضمانت ہے، غنڈہ گردوں اور لاقانونیت برتنے والوں کی ناز برداری اور ان کے ساتھ نرم خوئی و دل داری سماج کے لئے نہایت ہی نقصان دہ اور مضرت رساں عمل ہے، اسی لئے اسلام نے عدل اور عدل کے معاملہ میں مساویانہ سلوک کی قدم قدم پر تلقین کی ہے، رسول اللہ ﷺ کو مدینہ میں اسلام کے سب سے بڑے دشمن یہودیوں کی بابت حکم دیا گیا کہ جب آپ ﷺ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو پورا انصاف ملحوظ رکھیں۔ ’’وان حکمت فاحکم بینھم بالقسط ان اللہ یحب المقسطین ‘‘(المائدہ:۴۲)

رسول اللہ ﷺ نے عملی زندگی میں اس کو برت کر دکھایا، فتحِ مکہ کے موقع سے عرب کے معزز قبیلہ کی ایک خاتون نے کچھ چوری کر لی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، جو اسلام میں چوری کی سزا ہے، آپ کے محبوب حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے اس خاتون کے حق میں سفارش کی، تو آپ اتنے برہم ہوئے کہ کم آپ ﷺ اس طرح غضبناک ہوا کرتے تھے، اور خاص اس موضوع پر صحابہؓ سے خطاب فرمایا، آپ ﷺ نے اپنے اس خطاب میں فرمایا کہ اگر اس خاتون کی جگہ محمد کی بیٹی فاطمہؓ نے چوری کی ہوتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے۔ چنانچہ آپ ﷺ کے حکم سے اس کے ہاتھ کاٹے گئے (بخاری: عن عائشۃ رضی اللہ عنہا، حدیث نمبر (۳۴۷۵) کتاب أحادیث الأنبیاء، باب ''أم حسبت أن أصحاب الکھف والرقیم'' الکہف: ۹)

یہی مزاج آپ ﷺ سے آپ ﷺ کے صحابہؓ نے پایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک بار جمعہ کے دن اعلان کیا کہ کل اونٹوں کی زکوٰۃ لے کر یہاں حاضر ہوں، کہ ہم اسے تقسیم کریں، اور کوئی شخص میرے پاس بلا اجازت نہیں آئے۔ دوسرے دن ایک صاحب اونٹنی کی نکیل لے کر آگئے۔ کہ شاید تقسیم میں اونٹ مل جائے۔ تو لے جانے میں آسانی ہو۔ جس حصہ میں اونٹ رکھے گئے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ وہاں داخل ہوئے۔ ساتھ ہی یہ صاحب بھی آگئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اعلان کے باوجود ان صاحب کی بے وقت آمد پر غصہ آگیا۔ اور آپ رضی اللہ عنہ نے اونٹ کی نکیل لے کر ایک آدھ بار انہیں رسید کیا، جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اونٹ کی تقسیم سے فارغ ہوئے، تو اس شخص کو بلایا اور ہاتھ میں نکیل دی اور فرمایا کہ تم مجھ سے بدلہ لے لو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ نہ وہ بدلہ لے گا، اور نہ آپ اس طریقہ کو رواج دیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پھر قیامت کے دن مجھے کون اللہ سے بچائے گا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ انہیں راضی کر لیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ اسے ایک اونٹنی مع کجاوہ، ایک چادر اور پانچ دینار دیئے جائیں اور اس طرح اسے راضی کیا۔ (کنز العمال: ۳/۱۲۷)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عدالت میں ایک مسلمان اور یہودی کا مقدمہ آیا تو آپ رضی اللہ عنہ

نے یہودی کے حق میں فیصلہ فرمایا (الترغیب والترہیب: ۳ / ۲۲۵) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ اپنے غلام کی گوشمالی کی۔ تو پھر اس سے اصرار کر کے اپنے کان پکڑوائے اور جب اس کو لحاظ کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ سختی سے کان ملو، دنیا میں بدلہ ادا کردینا بہ مقابلہ آخرت میں بدلہ ادا کرنے کے بہتر ہے؟ (مختصر حیاۃ الصحابہ للکاندھلوی: ۲۴۳) جعد بن ہبیرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ آپ رضی اللہ عنہ کے پاس دو شخص آتے ہیں، جن میں سے ایک آپ رضی اللہ عنہ سے اپنی جان سے بھی بڑھ کر محبت رکھتا ہے، اور یہ دوسرا آپ رضی اللہ عنہ سے اس قدر بغض رکھتا ہے کہ اگر بس چلے تو آپ رضی اللہ عنہ کو ذبح کردے، لیکن آپ اس محبت رکھنے والے کے مقابلہ بغض رکھنے والے کے حق میں فیصلہ کرتے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر یہ فیصلہ میرے اختیار کی چیز ہوتی تو میں وہی کرتا جو تم خیال کرتے ہو، لیکن یہ اللہ کے اختیار کی چیز ہے۔ ''لو کان لی فعلت ، انما ذا شئی للہ''۔

(حوالۂ سابق: ۲۴۴)

عدل میں مساویانہ سلوک کا حال یہ تھا کہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے عہد خلافت میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے یہاں مقدمہ کے فریق بن کر آئے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے ازراہِ احترام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے قریب بیٹھانا چاہا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بات پسند نہیں آئی، اور فرمایا کہ یہ تمہارا پہلا ظلم ہے، میں اپنے فریق کے ساتھ ہی بیٹھوں گا۔ (کنزل العمال: ۳ / ۱۷۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسی طرح کا واقعہ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ کے اجلاس عدالت میں بھی پیش آنا منقول ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے عہدِ خلافت میں ایک غسانی رئیس مسلمان ہوئے، اور مدینہ آئے، ان کا نام ''ایہم'' تھا، اسلام تو قبول کرلیا تھا، لیکن ابھی اسلامی مزاج و مذاق سے ناآشنا تھا۔ طواف کے درمیان لباس فاخرہ پر ایک بدو کا پاؤں پڑ گیا، طبع نازک کو گوارا نہ ہوا، اور تھپڑ رسید کردیا، مقدمہ دربار خلافت میں آیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فیصلہ فرمایا کہ بدو بدلہ لے گا، یا اس سے معاف کراتا ہوگا، ایہم کا مذاق جاہلی اس کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھا، ایک دو دنوں کی مہلت لی، اور اسی درمیان راہ فرار اختیار کی اور مرتد ہوگیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو

ایک بڑے رئیس کے یوں چلے جانے سے کوئی ملال نہیں ہوا۔ بلکہ استقامت کی جو توفیق میسر آئی، اس پر اللہ کا شکرادا کیا۔

عدل وانصاف کے معاملہ میں اسلامی نظام نے عدلیہ کو پوری طرح آزاد رکھا ہے، اور کسی بڑے سے بڑے عہدیدار کے لئے بھی اس میں مداخلت کی گنجائش نہیں رکھی ہے۔ حضرت علی ؓ نے خود اپنے عہدِ خلافت میں قاضی شریح کی عدالت میں ایک یہودی کے خلاف مقدمہ دائر کیا، اور گواہان کی حیثیت سے صاحبزادہ گرامی مرتبت حضرت حسن ؓ اور اپنے غلام قنبرہ کو پیش فرمایا، قاضی صاحب نے دونوں گواہیاں رد کردیں، اور کہا کہ نہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں معتبر ہے، اور نہ غلام کی گواہی اپنے آقا کے حق میں قابل قبول، اور بالآخر فیصلہ یہودی کے حق میں اور امیر المومنین کے خلاف ہوا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی ظاہری شکست سے فتح کا سامان پیدا کیا، یہودی غلطی پر تھا، اس نے مسلمانوں کے اس عدل کو دیکھ کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اسلام سے مشرف ہوا۔

انصاف کو یقینی بنانے اور مساویانہ سلوک برقرار رکھنے کے لئے فقہاء نے قاضی کے لئے اس بات کو بھی منع کیا کہ وہ مقدمہ کے فریقین یا جن لوگوں کا مقدمہ آنا متوقع ہو ان سے ہدیہ قبول کرے۔ اسی سلسلہ میں دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص حضرت عمر ؓ کی خدمت میں اکثر اونٹ کی ران پیش کیا کرتے تھے، اتفاق سے اسی شخص کا مقدمہ آپ ؓ کے سامنے آیا، اس شخص نے حضرت عمر ؓ سے عرض کیا کہ جیسے اونٹ کے ران کی بوٹیاں ہڈیوں سے الگ کی جاتی ہیں، اسی طرح آپ ؓ بھی اس معاملے کا صاف صاف فیصلہ کر دیجئے۔ حضرت عمر ؓ اس شخص کے اشارہ کو سمجھ گئے، اور قاضیوں کو خاص طور پر حکم جاری فرمایا کہ وہ کسی بھی قسم کا تحفہ قبول کرنے سے گریز کریں۔ (کنزل العمال: ۳/۱۷۷)

عدل پروری کا یہ معاملہ حضرات صحابہؓ ہی تک محدود نہیں تھا، بلکہ مسلمان بادشاہوں نے ہمیشہ رعایا میں عدل وانصاف اور مساویانہ سلوک کو سامنے رکھا، خود ہندوستان کے مسلم سلاطین کے ایسے بیسیوں واقعات موجود ہیں، سلطان ناصرالدین محمود تغلق اور غیاث الدین بلبن خاندان غلاماں سوری، اور مغل بادشاہوں میں کتنے ہی حکمراں گذرے ہیں، کہ رعایا

ان کو بے لاگ عدل کے لئے ضرب المثل بنائے ہوئے تھے، جہانگیر نے اپنے ایک نہایت مقرب وزیر مقرب خاں کو ایک معمولی بڑھیا کی فریاد پر مقرب خاں اور اس کے متعلقین کو سخت سزا دی (سچی کہانیاں: ۲/۱۴۲)

آج کل فوج اور پولیس کے معاملہ میں اس کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے، بابر کی فوج ۱۵۱۹ء میں بھیرہ میں داخل ہوئی۔ بابر کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ بھیرہ میں کچھ لوگوں نے رعایا کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ فوراً معاملہ کی تحقیق ہوئی اور بعض سپاہیوں کو سزائے موت دی گئی، اور بعضوں کی ناک کٹوا کر انہیں عوام میں پھرایا گیا تاکہ پھر آئندہ ان کو ایسی زیادتی کی جرأت نہ ہو (سچی کہانیاں: ۲/۱۱، سید صباح الدین عبدالرحمان)

جو جمہوریت انسان کو انصاف بھی نہ دے سکے۔ اور جو ظالم کا ہاتھ تھامنے میں بھی چہرے اور چہرے میں فرق کرتی ہو، اس سے کیسے کوئی مظلوم اپنے حقوق کے تحفظ کی توقع رکھ سکتا ہے اور کیوں کر امید کی جاسکتی ہے کہ یہاں ظالموں کے ہاتھ تھامے جائیں گے۔

(۱۴/اگست ۲۰۰۰)

دہشت گردی اور اسلام

جیسے کسی انسان کے لئے ہوا اور غذا سب سے زیادہ بنیادی ضرورت ہے، اسی طرح انسانی سماج کے لئے سب سے بڑی ضرورت امن وسلامتی ہے، اسی لئے قرآن مجید نے عربوں کو اللہ تعالیٰ کا احسان یاد دلاتے ہوئے خاص طور پر دو باتوں کا ذکر کیا ہے، ایک یہ کہ وہ خدا ہی ہے جس نے اس وادی غیر ذی زرع میں بسنے والوں کو بھی غذا فراہم کی اور ان کے لئے بھوک سے نجات کا سروسامان پیدا کیا، دوسرے ایک ایسی سرزمین جہاں حکومت نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور لاقانونیت ہی سب سے بڑا قانون تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی نعمت سے سرفراز فرمایا: ''أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ.'' (قریش:۴)

دہشت گردی سماج کے امن وامان اور سلامتی کے لئے سمِ قاتل ہے۔ جو سماج مامون نہ ہو، جس معاشرہ میں ہر وقت انسان کو اپنی جان و مال کے بارے میں خطرہ لگا رہتا ہو اور جہاں ہر لمحہ انسان اپنی عزت و آبرو کے بارے میں اندیشہ سے دوچار ہو، وہاں علمی ترقی رک جاتی ہے، تہذیب وتمدن انحطاط پذیر ہونے لگتا ہے، اخلاقی پستی پیدا ہونے لگتی ہے اور عدم تحفظ کا احساس ہر شعبۂ زندگی میں ترقی کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے، اس لئے دہشت گردی پر فکرمند ہونا اور اس کی وجہ سے خوف زدہ ہونا ایک فطری بات ہے۔

اسلام ایک ایسا مذہب ہے کہ امن اور سلامتی اس کی خمیر میں داخل ہے۔ اس مذہب کے ماننے والوں کے لئے اس نے دو لفظ استعمال کیا ہے: ''مومن'' اور ''مسلم'' یہ دونوں ہی تعبیر اسلام کی امن پسندی کا مظہر ہے۔ مومن امن سے ماخوذ ہے، یعنی ایسا شخص جو دوسروں کو امن دینے والا ہو اور مسلم ''سلم'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی صلح اور سلامتی کے ہیں، اس طرح مسلم کے معنی ایسے شخص کے ہیں جو صلح جو ہو اور جس سے دوسروں کو

سلامتی حاصل ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعض ارشادات سے اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حقیقی مومن وہ ہے کہ جس سے اس کے پڑوس کے لوگ امن میں رہیں۔ (بخاری:۶)

لیکن سب سے پہلے خود یہ بات سمجھنے کی ہے کہ دہشت گردی ہے کیا؟ دہشت گردی دوسروں پر ظلم وتعدی اور جور وستم کا نام ہے یا ظالم کے پنجہ کو تھامنے کی کوشش بھی دہشت گردی ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی صاحب انصاف اس بات کا قائل نہیں ہوگا کہ ظلم کے خلاف احتجاج بھی دہشت گردی کہلانے کا مستحق ہے۔ دنیا کی مختلف قوموں نے ان ظالم و جابر قوموں کے خلاف احتجاج کیا ہے جنہوں نے ملکوں اور قوموں کو اپنا غلام بنانے کی کوشش کی اور آزادی کی اس لڑائی نے کتنے ہی انسانوں کی جانیں لی اور ان کے لہو سے اپنی پیاس بجھائی، تو کیا ان مجاہدین آزادی کو بھی دہشت گرد کہا جائے گا؟ خود ہمارے ملک ہندوستان میں نوے سال آزادی کی خونچکاں لڑائی لڑی گئی، یہ لڑائیاں اسی لئے ہوئیں کہ ہم انگریزوں کا طوقِ غلامی اپنی گردن سے نکال پھینکنے کے لئے بے چین تھے۔ اگر ہم غلامی کو برداشت کر لیتے، تو یقیناً بہت سے انسانیت سوز واقعات پیش نہیں آئے ہوتے، تو کیا جدو جہد آزادی کو بھی دہشت گردی شمار کیا جائے گا؟۔

نہیں اور یقیناً نہیں!! تو معلوم ہوا کہ مظلوم کا سر اٹھانا اور ظالم کے خلاف اس کا صف آرا ہونا دہشت گردی نہیں ہے بلکہ دہشت گردی کا مقابلہ ہے۔ دنیا میں کوئی مذہب نہیں جس نے ظالم سے نبرد آزما ہونے کو ظلم اور دہشت کا نام دیا ہو۔ ہندو تاریخ میں کورو اور پانڈو کی جنگ مشہور ہے اور اس موقع سے جناب کرشن جی نے ارجن کو جو اپدیش دیئے، وہ آج بھی گیتا میں محفوظ ہیں۔ اس میں یہ پیغام ہے کہ اپنے جائز حق کے لئے اٹھ کھڑا ہونا اور ناانصافی کے خلاف سینہ سپر ہو جانا دہشت گردی نہیں، بلکہ ایک ''مقدس جہاد'' ہے۔ قرآن مجید نے بھی بڑی لطیف تعبیر میں کہا ہے کہ کسی بُری بات کو کھلے عام کہنا خدا کو پسند نہیں، لیکن جو شخص مظلوم اور ستم رسیدہ ہو، اس کو یقیناً احتجاج کا حق حاصل ہے۔ ''لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ'' (النساء:۱۴۸)

عجیب بات ہے کہ اس وقت دنیا میں جو قومیں جتنی زیادہ دہشت گرد ہیں، وہ اسی قدر دوسروں کے دہشت گرد ہونے کا شور مچاتی ہیں۔ امریکہ، ایران اور سوڈان کو دہشت گرد کہتا ہے، حالاں کہ خود امریکہ نے رضا شاہ پہلوی کے واسطہ سے ایران اور سوڈان کے باغی قبائل کی آڑ میں سوڈان پر کتنے ہی مظالم ڈھائے ہیں اور بین الاقوامی دہشت گردی کا ارتکاب کیا ہے، اسرائیل، فلسطین اور شام کو دہشت گرد قرار دیتا ہے، حالانکہ وہ خود پورے فلسطین اور شام کے کچھ حصے پر ناجائز طریقے پر قابض ہے اور کئی بار عربوں کے قتل عام کا مرتکب ہو چکا ہے۔ مغربی قومیں افغانستان اور موجودہ طالبان کو دہشت گرد کہتی ہیں، حالانکہ زیادتی خود ان کی ہے کہ جو حکومت ملک کے تین چوتھائی حصوں سے بھی زیادہ پر قابض ہے وہ اس کو تسلیم نہیں کرتے اور ایسے خود ساختہ حکمرانوں کو تسلیم کرتے ہیں جن کی حکومت کا اندرون ملک کوئی وجود نہیں۔ مصر، الاخوان المسلمون اور ترکی وہاں کی اسلام پسند جماعت کو بنیاد پرست اور دہشت گرد قرار دیتے ہیں اور خود جمہوریت کا گلا گھونٹے ہوئے ہیں اور انتخاب کے بجائے اسلحہ کی طاقت کے سہارے تخت حکمرانی پر متمکن ہیں۔

ہمارے ملک کا بھی حال اس سے مختلف نہیں، جن لوگوں نے کھلے عام بابری مسجد کو شہید کیا، مظلوم اور نہتے مسلمانوں پر گولیاں برسائیں، ممبئی اور سورت میں ظلم و جور کا برہنہ رقص کیا، وہ دہشت گرد نہیں کہلائے اور جن لوگوں نے اس ظلم پر صدائے احتجاج بلند کی اور ردعمل پر مجبور ہوئے ان کو دہشت گرد کہا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ دہشت گردی کے لفظ کے ساتھ ناانصافی ہے اور کوئی بھی معقول اور منصف مزاج آدمی اس کو قبول نہیں کر سکتا۔

اس لئے سب سے پہلے خود دہشت گردی کا مفہوم متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ ظالم کو دہشت گرد کہنے سے گریز اور مظلوم کو دہشت پسند کہنا بجائے خود ایک ''اخلاقی دہشت گردی'' اور یقیناً اس سے دہشت گردی میں اضافہ ہی ہوگا اور مشکلات کا حل نہیں نکل سکے گا! تاہم اس بات کی وضاحت مناسب ہوگی کہ اسلام اس شخص کو بھی لاقانونیت اور جائز حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتا جس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہو، اسی لئے قرآن نے اصول مقرر کر دیا کہ کسی زیادتی کا بدلہ لینا اسی زیادتی کی حد تک روا ہے: جَزَآءُ

سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا (الشوریٰ:۴۰) اور آپ ﷺ نے فرمایا: لا ضرر و لا ضرار (موطاامام مالک) یعنی نہ کسی کو ابتداءً نقصان پہنچایا جائے اور نہ جواباً نقصان پہنچانے میں حد سے تجاوز کیا جائے۔

لیکن دہشت گردی کے علاج کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے ان اسباب ومحرکات پر غور کیا جائے اور ان کا سدِ باب کیا جائے جو شریف اور تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی دہشت گرد بناتے ہیں۔ بنیادی طور پر احساس محرومی اور قانونی راستہ سے حقوق کے تحفظ اور ناانصافیوں کے تدارک سے مایوسی اور نا اُمیدی دہشت گردی کو جنم دیتی ہے، کبھی معاشی محرومی، سرمایہ داری کے خلاف آتش اشتعال کو بھڑکاتی ہے، ہمارے ملک میں نیکسلائیٹ تحریک اسی پس منظر میں اُبھری ہے اور اسی اُحساس محرومی نے بے روزگار نوجوانوں کی ایک قابلِ لحاظ تعداد کو ان کے گرد اکھٹا کر دیا ہے، کبھی سیاسی محرومی دہشت گردی کا سبب بنتی ہے، کشمیر، پنجاب اور آسام اس کی کھلی مثال ہے، جن کو مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا اور اسی نے ان کو امن کی میز سے جنگ کارزار میں پہنچا دیا ہے، کبھی اس کا سبب قومی ناانصافی اور فرقہ وارانہ زیادتی بھی ہوتا ہے، پھولن دیوی کا کردار اور مایاوتی کی اونچی ذات والوں کے خلاف دشنام طرازی اس کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ ان اسباب وعوامل پر توجہ نہ دینا اور ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے ردعمل کو دہشت گردی کا نام دے کر بزورقوت ختم کرنے کی کوشش، جڑ کے بجائے ٹہنیوں پر پانی ڈالنے کے مترادف ہے۔

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ ہمیشہ مشکلات کی اصل بنیاد کو تلاش کرتا ہے اور اصل مرض کی شناخت کر کے اس کے علاج کی طرف اولین توجہ دیتا ہے۔ عرب جاہلیت سے زیادہ دہشت گردی اور لاقانونیت شاید ہی تاریخ میں کہیں رہی ہو، لیکن اسلام نے نہایت خوبی سے اس کا علاج کیا اور ان ہی لوگوں کو جن کی وحشت ضرب المثل تھی، پوری دنیا میں امن کا پیامبر بنا کر کھڑا کیا۔ اسلام کو یہ کامیابی اسی لئے ملی کہ اس نے ان اسباب وعوامل پر توجہ دی، سب سے زیادہ جو چیز انسان کو دہشت گردی پر اُبھارتی ہے وہ معاشی محرومی کا احساس ہے۔ اسلام نے اولاً تو آخرت کا یقین پیدا کیا اور دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کو ایک

فانی اور آنی جانی چیز قرار دیا۔ وما الحیوۃ الدنیا الا متاع الغرور (الحدید:۲۰)

جب دلوں میں متاعِ دنیا کی محبت کم ہوجائے اور اس کی بے ثباتی کا یقین بیٹھ جائے تو وہ دنیا کی محرومی کو آخرت کی سرفرازی میں تلاش کرنے لگا اور یہ احساس اس کو اہلِ ثروت کے خلاف بغاوت پر نہیں اکسائے گا، بلکہ وہ اپنے فقر و افلاس میں بھی ایک لذت اور حلاوت محسوس کرے گا، پھر اسلام نے دولت کے ارتکاز کو ناپسند کیا اور اس کی تقسیم اور گردش کے مربوط اور مرتب نظام کو وجود بخشا، میراث کا نظام، زکوٰۃ و صدقات، سود کی حرمت، ذخیرہ اندوزی کی ممانعت وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو ایک جگہ دولت کو مرتکز نہیں ہونے دیتیں، ان کے علاوہ محتاجوں اور ضرورت مندوں کے ساتھ حسن سلوک کی اخلاقی تعلیمات ان کے علاوہ ہیں۔ یہ وہ احکام ہیں جو اہلِ دولت میں انفاق کا جذبہ پیدا کرتے ہیں اور غرباء کو محرومی کے احساس سے محفوظ رکھتے ہیں۔

سیاسی سطح پر کسی طبقہ کو دبا کر رکھنے کی اسلام نے اجازت نہیں دی، اسلام نے ذات اور برادری کی بنیاد پر عہدے اور ذمہ داریوں کی تقسیم نہیں کی، بلکہ صلاحیت اور اہلیت کو اس کے لئے معیار بنایا، انصاف اور حفاظت و سلامتی کے باب میں اسلام نے مسلم اور غیر مسلم کا بھی کوئی فرق نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے غیر مسلموں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے مال بھی ہمارے مال کی طرح اور کے خون بھی ہمارے خون ہی کی طرح ہیں: "دمائھم کدمائنا و اموالھم کاموالنا" قرآن مجید نے عدل وانصاف پر زور دیتے ہوئے کہا کہ کسی طبقے کی برائی تم کو ناانصافی کے راستے پر نہ لے جائے اور تم ان کے ساتھ بھی انصاف کا حق ادا کرو: وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا (المائدۃ:۸) مذہبی معاملات میں بھی ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حکم دیا گیا: لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَکُمْ اَعْمَالُکُمْ (القصص:۵۵) اسلام نے اس بات کی بھی اجازت نہیں دی کہ ایک شخص کے جرم کا بدلہ دوسرے سے لیا جائے اور کچھ مجرموں کی وجہ سے بے قصور لوگوں کو نشانۂ انتقام بنایا جائے، "لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی" (فاطر:۱۸) اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ احتجاج کا قانونی راستہ ہمیشہ کھلا رکھا جائے، اگر احتجاج مبنی بر حقیقت ہے تو اسے قبول کیا جائے اور اگر خلافِ واقعہ ہے تو

ان کو مطمئن کیا جائے، ملک کے ایک عام شہری کو بھی بڑے سے بڑے حکمراں کو روکنے اور ٹوکنے کا حق حاصل ہے، اسی کا نام قرآن کی زبان میں ''نہی عن المنکر'' اور'' شہادتِ حق '' ہے۔ اگر کچھ لوگ غیر سنجیدہ طریقہ اختیار کریں تو ان کا بھی بہتر طریقہ پر جواب دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: برائی کو نرمی کے ساتھ دور کرو: اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ (مومنون:۹۶) گویا اسلام جوابی دہشت گردی کو بھی پسند نہیں کرتا۔

اسلام سراپا رحمت اور امن و آشتی ہے، وہ عدل و انصاف کا نقیب ہے، [illegible] و رعفو درگذر سے زیادہ کوئی چیز اس کی بارگاہ میں مقبول نہیں، ظلم و جور اور نا انصافی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں جو اسے ناپسند ہو، اس نے خدا کو جس نام سے بار بار یاد کیا وہ '' رحمن و رحیم'' ہے اور اس نے اپنے پیغمبر کو جس لقب سے ملقب کیا ہے، وہ '' رحمة للعالمین '' ہے، اس کا مرکز ایسا حرم مامون ہے کہ وہاں پرندوں پر بھی کنکری نہیں ماری جاتی اور خودرو پودے بھی اکھاڑنے سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ ایک ایسے مذہب کی طرف دہشت گردی کی نسبت کرنا دن کو رات کہنے کے سوا اور کیا ہے؟ درحقیقت یہ ایسا نعرہ جس میں بہت سی قوموں نے آج اپنی دہشت گردی کو چھپایا ہے۔ دہشت گردی مظلوموں کی آہ و فغاں، صدائے احتجاج اور ظلم سے پنجہ آزمائی کا نام نہیں، بلکہ دہشت گردی خود ظلم و تعدی کا نام ہے، مگر افسوس کہ ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

(۱۸/نومبر ۱۹۹۸ء)

ردعمل اور جوابی اقدام ــ اسلامی نقطۂ نظر

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ایک خاص عنصر جذبات کا رکھا ہے، یہی جذبات محبت ونفرت اور خوشی وغم کے احساس کا سرچشمہ ہے، عام حالات میں انسان کے جذبات معتدل ہوتے ہیں، لیکن جب کوئی غیر معمولی بات پیش آئے تو اسی نسبت سے انسان کی جذباتی کیفیت میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے، فرحت انگیز واقعات سے زیادہ انسان الم انگیز واقعات پر جذباتی ہوجاتا ہے، اس طرح کے واقعات سے انسان کو گہرا دکھ بھی پہونچتا ہے۔ اور اس کے جسم میں انتقام کی آگ بھی سلگنے لگتی ہے، بعض اوقات یہ کیفیت اتنی شدید ہوتی ہے کہ انسان خود اپنے قابو میں نہیں رہ پاتا، ان حالات میں اگر قانون اور اصول کے دائرہ میں ردعمل کی گنجائش فراہم نہ کی جائے اور حصول انصاف کو ممکن نہ بنایا جائے تو مزید لاقانونیت پیدا ہونے کے خطرات ہوتے ہیں۔

اسی لئے اسلام نے ظلم وتعدی کا جواب دینے اور قانونی حدود میں رہتے ہوئے ردِعمل ظاہر کرنے کی اجازت دی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

" فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدی علیکم واتقوا الله واعلموا ان الله مع المتقین "۔ (البقرۃ: ۱۹۴)

تم پر جو شخص زیادتی کرے، تو تم بھی اس پر اس کی زیادتی کے بقدر جواب دو اور اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

قرآن مجید کی اس آیت میں چند باتوں کی طرف اشارہ ہے، اوّل یہ کہ کسی پر ظلم و

زیادتی میں پہل کرنا جائز نہیں، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، اور دوست ہو یا دشمن، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی ہدایت یہاں تک ہے کہ تم انہی لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے برسرِ پیکار ہوں، جو لوگ تم سے برسرِ پیکار نہ ہوں، ان سے قتال جائز نہیں، یہ ''اعتداء'' یعنی حد سے گزرنا ہے اور اللہ تعالیٰ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔ (البقرہ:۹۰)

دوسری بات جو اس آیت سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی واقعہ کے غیر قانونی ردِ عمل کو روکنے کے لئے قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے انتقام کی گنجائش ہے، تیسرے کسی زیادتی پر یا تو عفو درگذر سے کام لینا چاہئے یا اسی کے مماثل بدلہ لینے کی گنجائش ہے، اس سے زیادہ گنجائش نہیں، اسی زیادتی کو قرآن مجید میں اعتداء سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسلام سے پہلے عربوں کا مزاج یہ تھا کہ اگر کسی قبیلے کا غلام مارا جاتا، تو خواہ اس کا قاتل غلام ہی کیوں نہ ہو، وہ کہتے کہ ہم اس کے بدلہ میں تمہارے آزاد شخص کو قتل کریں گے، اگر کوئی عورت ماری جاتی تو خواہ کوئی عورت ہی اس قتل کی مرتکب ہوئی ہوتی، لیکن لوگ اس کے بدلہ میں، دوسرے خاندان سے کسی مرد کو قتل کرنا چاہتے، اگر کسی خاندان سے ایک شخص کا قتل ہوا، تو مقتول کے لوگ چاہتے کہ اس کے بدلہ میں قاتل کے خاندان سے ایک جماعت کا قتل کیا جائے، کسی کو ایک زخم لگے تو وہ اس کے بدلے سے کئی چند زخم لگانا چاہتے۔
(مفاتیح الغیب:۴۵/۳)

اس ناروا انتقام اور بدلہ کو قرآن مجید نے منع کیا اور فرمایا گیا کہ قصاص کی اجازت ضرور ہے، لیکن جو قاتل ہے، اسی سے، خواہ وہ غلام ہو یا آزاد، اور مرد ہو یا عورت، اگر کوئی چاہے تو بجائے جانی بدلہ کے مالی جرمانہ یعنی ''خوں بہا'' بھی وصول کرسکتا ہے، اس حکم کو بیان کرتے ہوئے اخیر میں فرمایا گیا کہ جو اس کے بعد زیادتی کرے اس کے لئے دردناک عذاب ہے: ''فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ''. (البقرہ،۱۷۸)
— اس سے معلوم ہوا کہ بدلہ لینے میں قانون و آئین کے حدود کو پار کر جانا بھی جائز نہیں۔

انتقام اور ردِ عمل کے سلسلہ میں تین باتیں نہایت ہی اہم ہیں، اول یہ کہ اصل میں جس نے ظلم و زیادتی کی ہو، اس کے بارے میں مناسب تحقیق کی جائے، بلا تحقیق محض شبہ

کی بنا پر کسی کو نشانہ بنانا اور نقصان پہونچانا درست نہیں، مجرم کے بچ جانے سے زیادہ بُری بات یہ ہے کہ کوئی بےقصور سزا پا جائے، یہ بات خود رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائی ہے، اور نہ صرف اسلام بلکہ دنیا بھر کے مہذب قانونِ جرم و سزا میں اس اصول کو تسلیم کیا گیا ہے، محض شک و شبہ کی بنیاد پر اور بلا ثبوت کسی شخص کو مجرم تصور کر لینا اور اس کے ساتھ مجرموں کا سا معاملہ کرنا قطعاً درست نہیں اور سراسر تقاضاء انصاف کے خلاف ہے، افسوس کہ ان دنوں نہ صرف اشخاص و افراد بلکہ حکومتوں میں بھی یہ رجحان عام ہوتا جا رہا ہے، چند سال پہلے تک ہندوستان میں ٹاڈا کا قانون نافذ تھا، یہ بہت ہی تکلیف دہ قانون تھا، جس میں عرصہ تک ملزم بلا ثبوت پولیس تحویل میں رکھا جاتا، اسے تحت اذیت پہونچائی جاتی، اور طویل عرصہ تک اس کی ضمانت بھی منظور نہیں ہوتی، اس قانون کے تحت ہزاروں افراد گرفتار کئے گئے، لیکن ایک فیصد مقدمہ میں بھی ان پر لگائے گئے الزامات ثابت نہیں ہو سکے۔

دوسری بات جو اس آیت سے معلوم ہوئی وہ یہ کہ جب مجرم معلوم ہو اور اقرار یا ثبوت و شہادت سے اس کی تعیین ہو جائے، تو صرف وہی شخص مستحقِ سزا سمجھا جائے گا، اس کے بدلے اس کے کنبہ، علاقہ، یا قوم کے دوسرے لوگوں کو مجرم تصور کرنا اور ان کے ساتھ مجرموں کا سا سلوک کرنا درست نہیں ہوگا۔ مثلاً اگر کوئی مسلمان کسی قوم کے لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا، تو یہ درست نہیں ہے کہ اس قوم کا جو شخص بھی ہمارے ہاتھ آ جائے، ہم اس کے ساتھ قاتل کا سا سلوک کریں، سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت ''فیروز'' نامی ایرانی شخص کے ہاتھوں ہوئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادگان پر اس واقعہ کا ردِّ عمل ہوا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ''عبید'' نامی صاحبزادہ نے مدینہ میں مقیم بعض ذمیوں کو جوشِ انتقام میں قتل کر دیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ہونے کے بعد سب سے پہلا معاملہ یہی زیرِ بحث آیا، اس سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اکثر صحابہؓ کی رائے تھی کہ ان کو قصاص میں قتل کیا جانا چاہئے، لیکن مروان نے ایک قانونی نکتہ اٹھایا، کہ یہ واقعہ آپ کے منصب امارت پر فائز ہونے سے پہلے کا ہے، چنانچہ اس وقت کے حالات کے پس منظر میں اس واقعہ کے بارے میں پہلو تہی سے کام لیا گیا، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے، تو دوبارہ

آپ ﷺ نے اس مقدمہ پر کاروائی کرنی چاہی، لیکن وہ بھاگ کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے جا ملے اور جنگ صفین میں مقتول ہوئے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک وحشیانہ طریقہ ہے کہ جس قوم کے ساتھ ہمارا امن وامان اور بقاء باہم کا معاہدہ ہوا گر اس قوم کے کسی فرد نے ہمارے کسی فرد پر زیادتی کی ہو، تو اصل مجرم کو ڈھونڈ نکالے بغیر ہم اس قوم کے بے قصور اور بے گناہ لوگوں پر ہلہ بول دیں، اور ان کے جان و مال کے درپے ہو جائیں، یہ ظلم وزیادتی ہوگی اور یہ انتقام کا غیر اسلامی اور غیر قانونی طریقہ ہوگا۔

تیسری بات جو اس آیت میں کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ بدلہ میں زیادہ سے زیادہ مماثلت اور برابری کی گنجائش ہے، نہ کہ زیادتی کی، اپنے حق پر زیادتی بجائے خود ایک ظلم ہے، اور اسلام میں اس کی اجازت نہیں، قرآن مجید نے جو قانون قصاص بتایا ہے وہ اس سلسلہ میں بالکل واضح ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

> " وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ " (المائدۃ:۴۵)
>
> ہم نے ان لوگوں پر تورات میں یہ بات فرض قرار دیا تھا کہ جان کے بدلے جان لی جائے، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت، زخموں میں بھی برابری ہونی چاہئے۔

____ پس بدلہ اور انتقام میں بھی برابری ضروری ہے، اس میں بھی مبالغہ اور انصاف کی حدوں سے تجاوز درست نہیں، یہ بجائے خود زیادتی ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اگر آپ کے ساتھ آپ ہی کے ملک کے کسی شہری نے زیادتی کی ہے، تو یہ بھی ضروری ہے کہ آپ قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لیں، بلکہ مجرم کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کی کوشش کریں، کیوں کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینا خود بھی ایک خلاف قانون امر ہے، اگر ہر شخص نے اپنے طور پر معاملات

کا فیصلہ کرنے اور سزائیں جاری کرنے لگے تو پھر تو معاشرہ کا امن و امان ہی رخصت ہو جائے گا، قرآن مجید نے مقتول کے اولیاء کو یہ حق تو دیا ہے کہ وہ قاتل کے خلاف مقدمہ کا فریق بنے، لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بطورِ خود قصاص کی کاروائی کرے، قصاص کی سزا بہر حال عدالت کے واسطہ سے ہی نافذ ہوگی۔

ہاں اس سے مدافعت کی صورت مستثنیٰ ہے، جب کسی کی جان و مال یا عزت وآبرو پر حملہ ہو تو اس کو اپنے دفاع کا بھرپور حق حاصل ہے، بلکہ فقہاء حنفیہؒ کے نزدیک اپنے آپ سے دفاع واجب ہے، مَن شهر على المسلمين سيفًا وجب قتلهٗ (ہندی: ۶/۷) — اپنی مدافعت میں اگر حملہ آور کی جان بھی چلی جائے تو مدافعت کرنے والے پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں، وَلَو اشهر على رجل سلاحاً ...... فلا شئی علیه (ہندیہ: ۶/۷) — البتہ مدافعت میں بھی یہ حکم ہے کہ اگر قتل سے کم تر درجہ کا اقدام کافی ہو جائے، تو اقدام قتل سے گریز کیا جائے (دیکھئے بدائع الصنائع: ۷/۹۳) — حفاظت خود اختیاری نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کے تمام مذاہب اور نظامہائے قانون میں اس کو ہر شخص کا بنیادی حق تسلیم کیا گیا ہے۔

غرض بدلہ و قصاص اور انتقام کے باب میں بھی اسلام کی تعلیمات نہایت واضح، منصفانہ، معتدل اور متوازن ہیں، مسلمان خواہ دنیا کے کسی خطہ میں ہوں، وہ دوستوں کے درمیان ہوں، یا دشمنوں کے درمیان، بہر صورت یہ بات ضروری ہے کہ وہ اسلام کی ان معتدل تعلیمات اور قرآنی ہدایات کو ملحوظ رکھیں، کوئی قوم خواہ ہماری نگاہ میں وہ برائی اور فساد پر کاربند ہو، ہمیں بہر حال یہ بات سزاوار نہیں کہ عدل اور اعتدال کا راستہ چھوڑ دیں۔ ''وَلَا يَجرِمنكم شنآن قوم على ان لا تعدلوا'' (مائدہ: ۸)

(۸/ مارچ ۲۰۰۲ء)

مفتوحین کے ساتھ سلوک

موجودہ عہد فکری اور تہذیبی ارتقاء کا عہد کہلاتا ہے، اہلِ مغرب کا خیال ہے کہ تہذیب و ثقافت اور انسانی اقدار کا احترام جیسا کچھ آج کے عہد میں ہے، جو مغرب کے سیاسی غلبہ اور عروج کا عہد ہے پہلے کبھی نہیں تھا، لیکن یہ دعویٰ کس قدر مبنی بر حقیقت ہے؟ آئے دن کے واقعات اس پر گواہ ہیں، اس کی ایک مثال اس وقت ''چیچنیا'' ہے، یہ دوہرا رویہ ہی انصاف کو مجروح کرنے کے لئے کافی ہے کہ جارجیا، آرمیدیا اور لتھوانیا جو عیسائی ریاستیں ہیں، انہوں نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تو پورے مغرب نے ان کے اعلان آزادی کی حمایت کی اور روس کو اس کو منظور کرنے پر مجبور ہونا پڑا، لیکن اگر چیچنیا، انگوشتیا، داغستان اور قفقاز کی مسلم ریاستیں آزادی چاہتی ہیں تو نہ روس اسے قبول کرتا ہے اور نہ ہی مغرب اس کی تائید میں ہے، اور ان ریاستوں کی جنگ آزادی کو دہشت گردی اور انتہا پسندی کا نام دیا گیا ہے۔

افسوس کہ ان مجاہدین آزادی کے ساتھ کوئی زبانی کلمۂ ہمدردی کہنے والا بھی موجود نہیں، حد یہ ہے کہ مسلم ملکوں نے بھی اس موقع پر ایسی خاموشی اختیار کی ہے کہ گویا اگر کچھ احتجاج کریں گے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں مؤاخذہ ہو جائے گا، سوائے ایک افغانستان کے چیچنیا کے قتل پر کوئی دو آنسو بھی گرانے والا موجود نہیں، یہ عالم اسلام کی ایسی بے حسی ہے کہ شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے اور شاید جانور بھی اپنے ہم جنسوں کی ہلاکت پر ایسی خاموشی گوارا نہ کریں، بوسنیا میں کیسے کیسے مقتل سجائے گئے، اور مغرب خاموش تماشائی بنا رہا، کوسوو میں البانوی مسلمانوں پر کیا کچھ ستم نہیں ہوئے، لیکن انسانی ضمیر کو کوئی حرکت نہیں

ہوئی۔ چیچنیا کا سانحہ تو ان سب سے زیادہ سنگین ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ انڈونیشیا کے ایک علاقہ میں کچھ عیسائی آزادی کا مطالبہ کریں تو وہ مجاہدین آزادی ہیں، اور انڈونیشیا کو پروانۂ آزادی پر دستخط کرنے کے لئے مجبور کیا جائے، اور چیچنیا کے مسلمان آزادی کے طلب گار ہوں تو وہ دہشت گرد اور غارت گر قرار پائیں۔

چیچنیا میں کیا کچھ مظالم ڈھائے گئے، اور کس کس طرح بے گناہوں کے خون سے پیاس بجھائی گئی؟ اس بارے میں بہت کم تفصیلات، ذرائع ابلاغ تک پہونچ پاتی ہیں، لیکن روسی فوجیوں کی خوں آشامی کی ایک روایت رہی ہے، اور اس کی روشنی میں ان کے جور وستم کا اندازہ کرنا کچھ دشوار نہیں۔ ابھی اخبارات کے ذریعہ ان مظالم کا ایک منظر جو سامنے آیا ہے تنہا وہی دل دہلا دینے کے لئے کافی ہے کہ چیچنیا کے سپاہیوں اور شہریوں کی نعشوں کے پیر رسیوں کے ذریعہ ٹرک سے باندھ دیئے گئے اور کھینچے گئے۔ اور بعض رپورٹوں کے مطابق زندہ سپاہیوں کو بھی گاڑیوں سے باندھ کر کھینچا گیا، یہ ایسی شرمناک اور نفرت انگیز حرکتیں ہیں کہ ان پر جتنی بھی ملامت کی جائے کم ہے۔ حالاں کہ بین الاقوامی قانون کے تحت جنگی قیدیوں اور جنگ میں ہلاک ہونے والے فوجیوں کی نعشوں کے ساتھ احترام برقرار رکھنا ضروری ہے۔ اگر کسی مسلم ملک کی طرف سے ایسا کوئی واقعہ پیش آگیا ہوتا تو پورا مغرب ومشرق سراپا احتجاج بن گیا ہوتا، اور اس کو اسلامی دہشت گردی کا نام دیا جاتا، لیکن عجیب بات ہے کہ اس غیر انسانی رویہ اور اس کے مرتکبین کو دہشت گردی اور دہشت گرد کا عنوان نہیں دیا جاتا۔

مغرب میں انسانی خون سے آتشِ انتقام بجھانے کا ذوق زمانۂ قدیم سے ہے۔ یورپ میں اسلام سے پہلے بڑے بڑے اسٹیڈیم قائم تھے جہاں ''سیافی'' کے نام سے ایک غیر انسانی کھیل منعقد ہوتا تھا، قیدیوں کا جنگلی جانوروں یا خود دوسرے قیدیوں سے مقابلہ کروایا جاتا تھا، اور ان کی بے دردانہ ہلاکت کے تماشے نہایت ذوق وشوق سے دیکھے جاتے تھے، نپولین نے چار ہزار ترک قیدیوں کو محض اس لئے قتل کر دیا کہ ان کے کھانے پینے کا بوجھ خواہ مخواہ کیوں برداشت کیا جائے۔ بیت المقدس پر جب عیسائیوں کا قبضہ ہوا،

تو ستر ہزار مسلمان شہید کردیے گئے، اور یہودیوں کو ان کے مقدس مذبح میں ایک ساتھ نذر آتش کردیا گیا، خود عیسائی مؤرخین کے بیان کے مطابق شہر میں ہر جگہ کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں اور اعضاء نظر آتے تھے، یہ سلوک تو دوسری قوموں کے ساتھ تھا، خود عیسائیوں کے ایک فرقہ کا رویہ دوسرے فرقوں کے ساتھ کچھ کم جارحانہ نہیں تھا، کلیسائی نظام کے غلبہ و عروج کے زمانہ میں مذہبی عدالتوں کے حکم پر جو عیسائی قتل کئے گئے، ان کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ بتائی جاتی ہے۔ اور سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ مذہبی اختلاف کی بناء پر جن لوگوں کو سزائے موت دی جاتی ان پر یہ سزا زندہ جلا کر جاری کی جاتی، ایسی قوم سے نمائشی دعوؤں کی امید تو رکھی جاسکتی ہے حقیقی رحم کی توقع کیوں کر کی جاسکتی ہے؟

اسلامی تعلیمات اس سلسلہ میں بالکل واضح اور بے غبار ہیں، اسلام سے پہلے عربوں میں مثلہ کا طریقہ تھا، یعنی جب کوئی فوج اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل کرتی تو ان کے اعضاء کی قطع و برید کرتی، بلکہ بعض تاریخی اور ادبی مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اپنے دشمنوں کی کھوپڑیوں میں شراب تک پیا کرتے، خود رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی نعش کا غزوۂ اُحد میں مثلہ کیا گیا۔ اسلام نے اس غیر انسانی طریقہ سے منع کیا، اور آپ ﷺ نے صراحتاً عین جنگ کے دوران بھی مثلہ کرنے کی ممانعت فرمائی، مفتوحین کی نعشوں کے ساتھ کبھی بھی بے حرمتی کے رویہ کو آپ نے روا نہیں رکھا، غزوۂ بدر میں اہلِ مکہ میں سے بڑے بڑے سردار جو اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے، اور جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دکھ پہونچانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی، وہ قتل ہوئے، لیکن آپ ﷺ نے ان کی نعشوں کے ساتھ کوئی غیر انسانی سلوک نہیں کیا۔ بلکہ بدر ہی کے میدان میں ایک گڑھے میں مسلمانوں نے ان کو دفن کردیا۔ غزوۂ خندق کے موقعہ سے مشرکین کی فوج میں سے ایک شخص خندق پار کر کے حملہ آور ہوا، اور قتل کیا گیا، اہلِ مکہ اس لاش کا معاوضہ ادا کر کے لاش حاصل کرنا چاہتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے اس کا معاوضہ لینا گوارا نہیں فرمایا، اور یوں ہی لاش حوالہ فرمادی۔

غزوۂ بنو قریظہ میں یہودیوں کے مقرر کیے ہوئے حکم کے فیصلہ کی بناء پر خود یہودی

قانون کے مطابق قریب چار سو فوجی قتل کئے گئے، کیوں کہ انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ غداری اور معاہدہ شکنی کی تھی، اور اپنی دانست میں ایسا قدم اٹھایا تھا کہ مدینہ کی اسلامی مملکت صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائے، لیکن ان کے ساتھ بھی کوئی غیر انسانی رویہ نہیں برتا گیا۔ اوران کی نعشیں بھی دفن کی گئیں، پیغمبر اسلام ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی سزائے قتل کا مستحق ثابت ہو جائے اور اسے قتل ہی کرنا ہو تو بھلے طریقہ پر قتل کرو یعنی ایذائیں پہونچا پہونچا کر اور بے دردانہ طریقہ پر اسے ہلاک نہ کیا جائے۔

ان اسلامی تعلیمات کا مسلمانوں پر ایسا اثر تھا کہ انھوں نے اپنے دشمنوں کے ساتھ غلبہ پانے کے بعد ہمیشہ فراخ دلانہ رویہ اختیار کیا، وہ جنگ کے میدان میں جتنے بہادر تھے، صلح کی میز پر اس سے زیادہ وسیع القلب، جیسے میدان کارزار ان کی تلوار کی جھنکار سے لرزتے تھے، ویسے ہی ان کی صلح پسندی اور انسانیت نوازی دشمنوں کے دلوں کو فتح کرتی تھی، وہ میدانِ مقابلہ میں جتنے بلند ہمت تھے، صلح کی بزم میں اسی قدر عالی حوصلہ اور بامروت، اسی لئے جو علاقہ ان کے ہاتھوں فتح ہوتا وہاں کی شکست خوردہ آبادی کچھ ہی دنوں میں ان کے اخلاق و محبت اور مہر و وفا کی وجہ سے ان کی گرویدہ ہو جاتی، اور انہیں محسوس ہوتا کہ جیسے کوئی ابرِ رحمت ان پر سایہ فگن ہو گیا ہے۔

جو لوگ آج مسلمانوں کو دہشت گرد اور جنونی قرار دیتے ہیں وہ ذرا اپنے گریباں میں جھانک کر دیکھیں، اپنی انسانیت پروری کا جائزہ لیں، اور بتائیں کہ کیا کبھی مسلمانوں نے بھی اپنے مغلوب بلکہ مہلوک دشمنوں کے ساتھ ایسا انسانیت سوز برتاؤ روا رکھا ہے؟ —— ہمیں یقین ہے کہ انشاء اللہ غیر مسلموں کے تئیں مسلمانوں کے ایسے رویہ وسلوک کی ہرگز کوئی مثال نہیں ملے گی!

(۱۰/مارچ/۲۰۰۰ء)

تخفیف اسلحہ اور اسلام

۲۴ تا ۳۰/ اکتوبر کا ''ہفتہ'' اقوام متحدہ کی طرف سے عالمی سطح پر ''ہفتہ تخفیف اسلحہ'' کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، اس کا مقصد پوری دنیا کو اس جانب متوجہ کرنا ہے کہ وہ تباہ کن اور ہلاکت خیز ہتھیاروں میں کمی کریں کیوں کہ انسانیت کو تخت وتاراج اور تباہ و برباد کرنے کے سوا اس کا کوئی اور مقصد نہیں ہوسکتا، گویا مہلک اسلحہ کا ذخیرہ انسانیت کے لئے خودکشی کے مترادف ہے، اور اپنی قبر آپ کھودنا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ دنیا کی بڑی طاقتیں جو امن وامان کا نام لیتی ہیں اور اپنے آپ کو امن اور سلامتی کا پیغامبر تصور کرتی ہیں، یہی طاقتیں ہتھیاروں کی سوداگر ہیں، نت نئے مہلک ہتھیاروں کی منڈیاں گویا ''انسانیت کی قتل گاہیں'' یہی آراستہ کرتے ہیں، یہ ترقی پذیر اور پسماندہ ملکوں کو ہتھیار فراہم کرکے ایک دوسرے کے خلاف جنگ پر اکساتے بھی ہیں، اور دوسری طرف صلح وامن کی تلقین بھی کرتے ہیں، مشرق بعید کے ممالک جاپان، کوریا، ملیشیا وغیرہ نے جب سے صنعتی طور پر پیش رفت کی ہے اور ایسی صنعتوں میں قدم بڑھایا ہے جو انسان کے لئے نافع اور فائدہ بخش ہیں، تب سے خاص طور پر مغربی ملکوں نے ہتھیاروں کی صنعت پر اپنی توجہ مزید بڑھادی ہے، اور اس بات کی بھرپور کوشش بھی کی ہے کہ مشرقی ممالک دفاعی ٹکنالوجی میں آگے نہ بڑھیں تاکہ اس مہنگی اور ملکی سلامتی کے لئے ناگزیر صنعت میں ہماری اجارہ داری باقی رہے، اور پوری دنیا ہتھیاروں کی خریداری میں ہم پر ہی انحصار کرے، ایسی قوموں کی طرف سے دوسروں کو تخفیف اسلحہ کی تلقین یقیناً ایک مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے۔

تاہم ہمیں اسلامی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کا جائزہ لینا چاہئے ــــ اسلحہ کی ایک قسم وہ ہے جو مجرم اور ظالم کو تنہا نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے، مثلاً تلوار ہے، جس شخص پر وار کیا جائے وہی اس سے متأثر ہوتا ہے، تیر اور بندوق ہے اس کے نشانے بھی محدود ہوتے ہیں، آج کل جنگ کے موقعہ سے آبادیوں کا تخلیہ کرادیا جاتا ہے، اور میدان جنگ میں محدود نشانے تک وار کرنے والے ہتھیار استعمال کئے جاتے ہیں، ان کو بھی جنگی حالات میں ایسے ہی اسلحہ کے زمرہ میں رکھا جاسکتا ہے، کیوں کہ فوج اور فوجی ٹھکانے ہی ان کا اصل نشانہ ہوتے ہیں۔

دوسری قسم کے ہتھیار وہ ہیں جو بہت دور تک کے علاقہ کو نشانہ بناتے ہیں، اور محض کوئی محدود جگہ ان کا ہدف نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک بڑے علاقہ کو اس امتیاز کے بغیر کہ وہ فوجی اہمیت کا حامل علاقہ ہے یا عام رہائشی علاقہ تباہ و برباد کردیتا ہے۔ بوڑھے، بچے، عورتیں، بیمار و معذور، بے قصور شہری، جانور، مکانات، کھیتیاں اور غیر دفاعی صنعت پر مبنی کارخانے سب اس کا نشانہ بنتے ہیں، اس قسم کے ہتھیار بنیادی طور پر ظلم کی مدافعت کے لئے نہیں ہیں بلکہ دوسروں پر ظلم وستم ڈھانے اور دوسروں کی زمین ہڑپنے کے لئے ہیں۔

مدافعت اسلام کی نگاہ میں افراد و اشخاص کا بھی اور ممالک و اقوام کا بھی بنیادی حق ہے، اور جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت نہ صرف جائز بلکہ حتی المقدور واجب ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"من قتل دون دينه فهو شهيد من قتل دون ماله فهو شهيد، و من قتل دون أهله فهو شهيد" (ترمذی: ۲۶۱/۱، کتاب الدیات)	جو دین کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے اور جو اپنے اہل وعیال کی حفاظت میں مارا جائے وہ بھی شہید ہے۔

اس لئے ایسا اسلحہ جو محدود نشانہ کا حامل ہو، اور مدافعت کے لئے کافی ہو، انفرادی اور قومی ضروریات کے اعتبار سے مطلوب اور پسندیدہ ہے، غور کیجئے، صلح حدیبیہ میں مشرکین چاہتے تھے کہ مسلمان غیر مسلح ہو کر آئیں، اس وقت بھی آپ ﷺ نے اس پر اصرار

فرمایا کہ کم سے کم تلوار ضرور ساتھ ہوگی، چاہے نیام کے اندر ہو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سوتے تب بھی بستر میں تلوار رکھ کر سوتے، اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ استنجا اور نماز عید وغیرہ کے لئے آبادی سے باہر تشریف لے جاتے تب بھی نیزہ ساتھ ہوتا، کیوں کہ اس وقت مسلمان جن خطرات سے دوچار تھے، ان حالات میں اپنی حفاظت اور مدافعت کے لئے کچھ نہ کچھ مسلح رہنا ضروری تھا، معلوم ہوا کہ جیسے افراد و اشخاص اپنی حفاظت کے لئے مناسب تدبیر کے مکلف ہیں، اسی طرح ملکی اور قومی سطح پر بھی دفاعی اغراض کے تحت ہتھیار ایک لازمی حق ہے، اور اسی لئے قرآن نے مستعد رہنے کا حکم دیا ہے، " وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ " (انفال:۶۵)

ہتھیار کا استعمال دو صورتوں میں مذموم اور ناپسندیدہ ہے، ایک اس وقت جب ہتھیار حفاظت اور بچاؤ کے بجائے دوسروں پر ظلم و جور کے لئے کیا جائے، اور اسے دہشت گردی کا سامان بنالیا جائے، دوسرے جب وہ مجرموں کے ساتھ بے گناہوں اور قصور واروں کے ساتھ بے قصوروں کو نشانہ بنائے، اور جو انسان کو جنگ کے قوانین و آداب کا پابند نہیں رہنے دے، اسلام نے اس بات سے منع کیا ہے کہ جنگ کے درمیان بچوں اور عورتوں کو نشانہ بنایا جائے، ایک جنگ کے موقعہ پر دشمنوں میں سے ایک خاتون مقتول پائی گئیں، آپ ﷺ نے دیکھا تو ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کیا جائے، (بخاری، حدیث:۱۵-۱۴-۳، مسلم، حدیث نمبر۱۷۴۴) اسی طرح جو لوگ جنگ میں شریک نہ ہوں، عام شہری ہوں، ان کو بھی نشانہ بنانا جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر خاص طور سے سپہ سالار فوج حضرت خالد بن ولید کو اطلاع بھیجی کہ کسی عورت اور مزدور کو قتل نہ کریں، لایقتلن امراۃ و لاعسیفا، (ابوداؤد، حدیث نمبر:۲۶۶۹) مزدور کو قتل کرنے کی ممانعت کا منشا یہ ہے کہ بے قصور شہریوں کو نشانہ نہ بنایا جائے، اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے بوڑھے شخص پر حملے کرنے سے بھی منع فرمایا، ارشاد ہے: و لا تقتلوا شیخا ما......)(ابوداؤد، حدیث نمبر:۲۶۱۴)

اسی طرح آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ کسی کو آگ میں جلایا جائے، اور

فرمایا کہ آگ سے عذاب دینے کا حق صرف اللہ ہی کو ہے: ''ان النار لا یعذب بھا الا اللہ'' (بخاری، حدیث نمبر: ۳۰۱۶) اس حدیث سے آتشیں ہتھیاروں کا حکم معلوم ہوا کہ اسلام بنیادی طور پر ایسے اسلحہ کے استعمال کو بہتر نہیں سمجھتا، سوائے اس کے کہ مدافعت کی اس کے سوا کوئی راہ باقی نہ رہے، اسلام سے پہلے جنگ میں مثلہ کرنے کا رواج عام تھا، یعنی جب کوئی فوج اپنے دشمن پر غلبہ حاصل کر لیتی تو اس کے اعضاء کی قطع و برید کرتی، اور اس کے چہرے مسخ کر کے رکھ دیتی، اس غیر انسانی فعل کو ''مثلہ'' کہا جاتا، آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا، چنانچہ حضرت سمرہ بن جندب ؓ سے مروی ہے: و ینھانا عن المثلۃ ، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۶۶۷) آپ ﷺ کے اس ارشاد سے کیمیکل ہتھیاروں کا حکم اخذ کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ کیمیائی اسلحہ شکل وصورت کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے، اور گویا زندہ انسانوں کے حق میں ایک طرح کا مثلہ ہی ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے ان ارشادات سے واضح ہوا کہ نیوکلیر اسلحہ، اسی طرح ایسے فاصلاتی ہتھیار جو سینکڑوں میل آگے کے شہروں کو نشانہ بنا سکتے ہیں جیسے میزائیل آتشیں ہتھیار کو اسلام جنگی مقاصد کے لئے بھی پسند نہیں کرتا، کیوں کہ ان کا اثر لڑنے والے فوجیوں تک محدود نہیں رہتا، بلکہ بوڑھوں، بچوں، خواتین اور بے قصور شہریوں کی ہلاکت اور بلا امتیاز بڑی بڑی آبادیوں کی تباہی و بربادی کا باعث بنتا ہے، کتنے ہی قریوں اور شہروں کو آتش فشاں بنا دیتا ہے، اور کتنے ہی لوگوں کو اپاہج و معذور اور زندگی کی بنیادی ضرورت سے بھی محروم کر کے چھوڑتا ہے، اسلام یقیناً ایسے اسلحہ میں تخفیف وتحدید بلکہ بہ تدریج اس کے خاتمہ کا قائل ہے تاکہ اسلام نے جنگ کے جو آداب بتائے ہیں، اور جو احکام و قوانین دیئے ہیں ان کی رعایت ہو سکے۔

لیکن ظاہر ہے کہ تخفیف اسلحہ کی تحریک اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب یہ دو طرفہ بنیاد پر ہو، اور اس سلسلہ میں ہمہ قومی معاہدہ ہو سکے، اس لئے اگر کچھ قومیں تخفیف اسلحہ کے اصول پر عمل کریں اور کچھ قومیں نت نئے اسلحے بنائیں اور ان کا ذخیرہ کرنے میں بھی مشغول ہوں، تو یہ کھلی ہوئی ناانصافی اور قطعاً غیر منصفانہ بات ہوگی، بلکہ اس سے ظلم و

جور کو مدد ملے گی، اور اس میں اضافہ ہوگا۔ اگر دشمن ایسے ہتھیار سے مسلح ہوں، تو پھر اسلام ایسی تیاری کا حکم دیتا ہے جس میں دشمن کی طاقت کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہو اور مدافعت کی پوری پوری رعایت رکھی جائے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بعض غزوات میں ''منجنیق'' استعمال فرمائی ہے اور قلعہ بند فوجوں کے خلاف اس کا استعمال فرمایا ہے، ''منجنیق'' گویا اس زمانہ کی توپ تھی، جس سے بڑی بڑی چٹانیں دور تک پھینکی جاسکتی تھیں، اسی طرح آپ ﷺ نے بنونظیر کے باغات کو نذر آتش کرنے کی بھی اجازت دی، کیوں کہ مقابلہ کے لئے اس کے سوائے چارہ نہ تھا۔ (دیکھئے: ابوداؤد حدیث نمبر: ۲۶۱۵)

پس اسلام یقیناً اندھا دھند تباہی و بربادی پھیلانے والے اسلحہ میں تخفیف بلکہ اس کے خاتمہ کو پسند کرتا ہے، لیکن اس وقت جب کہ یہ عمل امتیاز اور غیر مساویانہ طرزِ عمل پر مبنی نہ ہو، بلکہ تمام قومیں اس کو دیانت داری کے ساتھ قبول کریں، تا کہ انسانیت جس خودکشی کی طرف بڑھ رہی ہے اور جس تباہی و بربادی کو خود دعوت دے رہی ہے، اس سے بچ سکے، کاش! اقوام عالم سچ مچ تخفیف اسلحہ کے تصور کو قبول کریں، اور انسانیت کو اس تباہی و بربادی سے بچانے کا سروسامان کریں، جس کی طرف وہ تیزی سے بڑھ رہی ہے، اور انسان کی جو قیمتی صلاحیت تخریب کی سمت گامزن ہے وہ انسانیت کی تعمیر اور اس کے گیسوئے پریشاں کو سنوارنے میں صرف ہو۔

(۲۹/اکتوبر ۹۹ء)

نیوکلیر اسلحہ ـــــــــ اسلامی تصور

دوسری جنگ عظیم کو جس بھیانک واقعہ نے اختتام پر پہنچایا، وہ یہ تھا کہ امریکہ نے جاپان کے دو شہروں پر ایٹم بم برسائے۔ یہ صبح کا وقت تھا اور سورج نے ابھی ابھی اپنی آنکھیں کھولی تھی، لیکن اسے خبر نہ تھی کہ اس کے اوپر اٹھنے سے پہلے ہی جاپان کے دو بڑے شہروں پر موت کی شب تاریک چھا جائے گی۔ اس حملہ نے آن کی آن میں لاکھوں آدمیوں کی جان لے لی اور بے شمار انسان معذور اور اپاہج ہو گئے، انسانی اجزاء بھنے ہوئے لاؤوں کی طرح فضا میں بکھر گئے اور آج بھی یہ زمین سبزہ سے محروم ہے۔

مغربی قوموں نے ایسا خطرناک اور ہلاکت خیز "بم" محض اپنی قوت کے اظہار اور زیادہ سے زیادہ انسان کو کم سے کم وقت میں شکار کرنے کے شوق میں بنایا تھا، لیکن مشرقی قوموں کو خوف کی نفسیات نے نیوکلیر اسلحہ سازی کی طرف پیش قدمی کرنے کی طرف مجبور کیا۔ روس اور روس کے بعد چین نے اس فن میں دادِ مہارت دی۔ ہندوستان چین کے پڑوس میں ہے اور ہندوستان کے ایک قابلِ لحاظ علاقہ پر چین اپنی فوجی طاقت کی وجہ سے قابض ہے۔ ان حالات میں ہندوستان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ بھی اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کرے، چنانچہ گزشتہ دِنوں ہمارے ملک نے بھی نیوکلیر تجربے کئے ہیں۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس مسئلہ کو محض سیاسی اور دفاعی نقطۂ نظر سے نہ دیکھیں، بلکہ اس سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر کو بھی جاننے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ ظلم سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں جو اسلام کی نگاہ میں ناپسند ہو، اور مظلوموں کی مدد اور

ظالموں کے پنجۂ ظلم کو تھام لینا ان باتوں میں سے ہے، جس کو اسلام نہایت ہی تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے ظالم بھائی کی بھی مدد کرو اور وہ یہ ہے کہ اس کو اپنے ظلم سے روک دو۔ (بخاری: ۲/۳۴۲۷ ط بیروت)

اس لئے اسلام نے ہر شخص، ہر قوم اور ہر ملک کے لئے بلا امتیاز حفاظت خود اختیاری اور مدافعت کے حق کو تسلیم کیا ہے، البتہ دوسرے اُمور کی طرح اس معاملے میں بھی وہ افراط اور حد اعتدال سے تجاوز کرنے کو پسند نہیں کرتا۔ اسلام شاید پہلا نظام حیات ہے جس نے جنگ کے قوانین مرتب کئے اور عین حالتِ جنگ میں بھی تہذیب و شائستگی کا دامن نہ چھوڑنے کی تعلیم دی اور مفتوح قوموں کے حقوق اور ان کی نسبت سے فاتحین کی ذمہ داریاں متعین کیں۔ کم لوگ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ قانون کی تاریخ میں بین ملکی اور بین قومی تعلقات اور حقوق پر پہلی کتاب امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام محمدؒ کی ہے جو ''سیر کبیر'' اور ''سیر صغیر'' کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ خود مغربی مصنفین کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ بین قومی قانون پر لکھی گئی یہ پہلی کتاب ہے۔

قانونِ جنگ کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات بہت واضح ہیں۔ آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ کسی شخص کو جنگ کے درمیان بھی نذرِ آتش کیا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ آگ سے عذاب دینے کا حق صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ (بخاری: ۲/۹۲۷ ط بیروت) آپ ﷺ نے اس پر اپنی ناخوشی اور ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ (بخاری: ۲/۹۶۲ ط بیروت) آپ ﷺ نے اس بات کو بھی پسند نہیں فرمایا کہ دشمن پر شب خون مارا جائے۔ (ترمذی: ۴/۱۲۱ ط بیروت) کیوں کہ اس میں بوڑھے، بچے، عورتیں اور عام شہری بھی حملہ کا نشانہ بن جاتے ہیں، آپ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید ؓ کو خاص طور پر ہدایت فرمائی:

''لاتقتلن امرأة ولا عسيفاً''۔ (ابوداؤد: ۲/۳۶۲)

اسلام سے پہلے جنگ میں مثلہ کرنے کا عام رواج تھا، یعنی جب کسی قوم پر غلبہ حاصل کرلیا جاتا، تو ان کے ناک، کان اور دوسرے اعضاء کاٹ لیتے اور بعض شقی القلب تو ان کا ہار بنا کر پہنتے بھی تھے، آپ ﷺ نے اس غیر مہذب طریقہ سے بھی منع فرمایا۔

(ابوداؤد: ۲/۳۶۱) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر کام میں بھلا طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، یہاں تک کہ قتل میں بھی اور جانوروں کو ذبح کرنے میں بھی۔ (مسلم عن شداد بن اوس) اسی طرح کوئی بھی ایسی صورت جس سے انسان کا چہرہ بگڑ جائے، روا نہیں۔ رحمت عالم ﷺ نے تو جانور کا چہرہ داغنے سے بھی منع فرمایا۔ (ترمذی: ۴/۲۱۱ ط بیروت) چہ جائے کہ انسان کا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی ان ہدایات سے ظاہر ہے کہ اصولی طور پر جنگ میں ایسے اسلحہ کا استعمال درست نہیں جو آتشیں ہوں، جو بلا امتیاز فوجیوں اور شہریوں کو، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کو، بیماروں اور معذوروں، نیز مردوں اور عورتوں کو اپنا نشانہ بناتے ہیں، جو اپنے نشانہ بننے والے متاثرین کا چہرہ بگاڑ دیتے ہوں اور ایک حد تک ان کا مثلہ ہو جاتا ہو۔ اگر اس پہلو سے نیوکلیر اسلحہ کے بارے میں غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلحہ ان تمام ہدایات کی خلاف ورزی پر مبنی ہیں، یہ انسانوں کے علاوہ بے زبان جانور کو بھی اپنا ہدف بناتے ہیں اور نہ صرف سرسبز کھیتوں اور درختوں کو تباہ و تاراج کرتے ہیں، بلکہ بسے بسائے شہر اور ہرے بھرے کھیت اور باغات کو ہمیشہ کے لئے بے آب و گیاہ صحراء اور ویرانہ میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ حالاں کہ آپ ﷺ نے اس بات کو بھی پسند نہیں فرمایا کہ جنگ کے درمیان ہرے بھرے کھیت ضائع کر دیئے جائیں۔

علاوہ ان وجوہ کے، اس میں بھی شبہ نہیں کہ ان اسلحہ پر بڑی لاگت آتی ہے۔ اعلیٰ ٹکنالوجی کا حصول، مختلف تجربات سے گزرتے ہوئے اس کا استعمال، نیز اس کی محافظت کی تدبیر اور اس کو اپنے نشانہ تک پہنچانے کے لئے ذرائع و اسباب کی تیاری، یہ تمام مراحل اتنے اخراجات کے متقاضی ہیں کہ ان میں لاکھوں ناخواندہ بچوں کی تعلیم اور بے سہارا یتیم بچوں کی کفالت ہو سکتی ہے اور عوام کے لئے کتنے ہی فلاحی و رفاہی کام سر انجام پا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے اتنے سارے معاشی وسائل کو محض بڑی طاقت کہلانے کے لئے بارود کے ڈھیر میں تبدیل کر دینا نہ صرف اسلامی اور مذہبی، بلکہ اخلاقی اور انسانی نقطۂ نظر سے بھی کوئی مناسب بات نہیں۔

تاہم فقہ اسلامی کا ایک عام اُصول ہے کہ جو باتیں ممنوع ہوں، مجبوری کی بناء پر ان کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لئے مجبوری کی حالت میں آپ ﷺ نے جنگ میں منجنیق بھی استعمال فرمائی۔ یہ آپ ﷺ کے زمانے کا ایک ترقی یافتہ ہتھیار تھا، جس کے ذریعے دشمن کے قلعہ پر پتھر کی چٹانیں پھینکی جا سکتی تھی، بعض اوقات دشمن سے محافظت کے لئے ہرے بھرے باغات بھی کاٹنے پڑے ہیں اور غیر ارادی طور پر ایسے لوگ بھی حملہ کی زد میں آئے ہیں، جن کے بارے میں آپ ﷺ کی ہدایت تھی کہ ان پر حملہ نہ کیا جائے، اس لئے کہ بعض اوقات ان کی مدافعت اور مقابلہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہوتا، اس لئے اقدامی طور پر تو نہیں، لیکن دفاعی نقطۂ نظر سے ایسے اسلحہ کا بنانا اور اس کی ٹکنالوجی حاصل کرنا جائز ہے، لیکن اس کے استعمال میں پہل کرنا درست نہیں، جوابی اقدام کے طور پر اس کے استعمال کی گنجائش ہوگی، یعنی نیوکلیر طاقت کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کی زبان میں قوتِ مرہبہ ہے۔ (انفال: ۶۰) جو محض اس لئے ہے کہ دشمن کو مرعوب رکھا جائے اور ان پر ایسی ہیبت طاری رکھی جائے کہ وہ حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے، یہ اس لئے نہیں ہے کہ انسانیت سوزی اور خوں آشامی کے لئے اس کو کھلونا بنا لیا جائے۔

مغربی طاقتیں اس وقت جس طرح ایشیائی ممالک خصوصاً ہندوستان کو نیوکلیر اسلحہ سازی سے باز رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں، وہ ایک عجوبہ سے کم نہیں اور سراسر امتیاز پر مبنی ہے۔ امریکہ دوسری جنگ عظیم میں ایک ایشیائی ملک کے خلاف اس طاقت کا استعمال کر کے تباہی مچا چکا ہے، لیکن وہ اپنے آپ کو اس سلسلہ میں سنجیدہ اور ذمہ دار رویہ کا حامل تصور کرتا ہے اور جن ملکوں نے ہمیشہ صبر و تحمل کا رویہ اختیار کیا ہے، ان کو مورد الزام ٹھہرایا جا رہا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ نیوکلیر طاقت ایک ایسی صلاحیت ہے جو فریقین کو محتاط رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ امریکہ و روس کی سخت باہمی کشاکش کے باوجود کوئی جنگ نہ ہو سکی۔ چین اور روس کے درمیان بھی سخت مخاصمت کے باوجود جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ خود ہمارے ملک ہندوستان نے جب سے ایٹمی دھماکہ کیا ہے، اس کے پڑوسیوں کو اس پر کوئی نئی جنگ کی ہمت نہیں ہو پائی۔ تاہم خود ایشیائی ملکوں کے لئے یہ

بات سوچنے کی ہے کہ کیا ان کی معاشی قوت اس طرح کے اقدام کی متحمل ہے؟ جہاں آج بھی لاکھوں انسانوں کے لئے آسمان کے سائے کے سوا سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں اور کتنے ہی انسان ہیں کہ ہر سال فاقہ مستی ان کی جان لے لیتی ہے، کتنے ہی یتیم بچے ہیں کہ ان کے سر پر کوئی محبت کا ہاتھ رکھنے والا نہیں، کتنی ہی بے کس بیوائیں ہیں جو اس بات کی منتظر ہیں کہ ان کی حکومتیں ان کے درد کا مداوا کریں، پھر کیا ان طاقتور ترین نیوکلیر ہتھیاروں کے ذریعہ فاقہ مستوں کی بھوک بھی مٹائی جا سکے گی اور غریبوں کے آنسو بھی پونچھے جا سکیں گے؟؟

(۲۹ رمئی ۱۹۹۸ء)

مزدوروں کے حقوق

کل یکم مئی ہے، ''مئی'' کا مہینہ آتے ہی مزدوروں کے حقوق و فرائض کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مزدوروں کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے، جس کو گذشتہ نصف صدی کے اہم ترین مسائل میں شمار کیا جاسکتا ہے اور یہ فطری بات ہے، دنیا کی ساری بہار دراصل انہی کے دم سے ہے، بلند قامت عمارتیں ہوں، صاف ستھری سڑکیں ہوں یا دیہات کے سبزہ زار کھیت اور بل کھاتی ہوئی نہریں، سب کو ان کے خون و پسینہ اور قوتِ بازو سے غذا ملتی ہے۔ یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ معاشی ترقی اور خوشحالی میں سب سے کم حصہ مزدوروں ہی کو ملتا ہے، حالاں کہ وہ سب سے زیادہ اس کے حقدار تھے۔

اسلام نے دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی طرح اس باب میں بھی مفصل اور واضح ہدایات دی ہیں، جس میں آجر اور مزدور دونوں کے حقوق کی رعایت ہے اور اعتدال و توازن بھی ہے۔

سب سے پہلے تو اسلام نے مزدوروں کو ایک بلند مقام اور منصب کا حامل قرار دیا اور عام طور پر جو اس طبقہ کو کمتر اور حقیر گردانا جاتا تھا، جواب تک باقی ہے، کی نفی کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

- حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آٹھ سال یا دس سال تک حضرت شعیب علیہ السلام کی مزدوری کی۔ (مسند احمد، ابن ماجہ عن عتبہ بن منذر رضی اللہ عنہ)
- حلال روزی کی تلاش میں محنت و کاوش کو عند اللہ پورے ایک سال امامِ عادل کے ساتھ جہاد سے افضل قرار دیا گیا۔ (ابن عساکر عن عثمان رضی اللہ عنہ)

- چھوٹے بچے، ماں باپ اور خود اپنی کفالت کے لئے دوڑ دھوپ (سعی) کو آپ ﷺ نے اللہ کی راہ میں جدوجہد بتایا۔ (طبرانی عن کعب بن عجرۃ)
- آپ ﷺ نے فرمایا سب سے پاکیزہ عمل یہ ہے کہ آدمی خود اپنے ہاتھوں کمائے (بیہقی عن علی رضی اللہ عنہ، طبرانی عن ابی بردہ رضی اللہ عنہ) اور خدا کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں ہی کی کمائی کھایا کرتے تھے۔ (بخاری عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ومقدام رضی اللہ عنہ)
- اللہ تعالیٰ ایسے مومن بندہ کو پسند کرتا ہے جو صنعت وحرفت سے واقف ہو اور اس سے کام لیتا ہو (ان اللہ یحب العبد المؤمن المحترف) (طبرانی عن ابن عمر رضی اللہ عنہ)
- آپ ﷺ نے فرمایا تمام انبیاء کرام نے بکریاں چرائی ہیں اور فرمایا خود میں بھی چند قیراطوں پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ (بخاری وابن ماجہ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ)
- کاشتکاری کو مبارک کہا گیا اور اس کا حکم دیا گیا۔ (ابوداؤد عن علی بن حسین رضی اللہ عنہ مرسلاً)
- ایک بار آپ ﷺ نے حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا سب سے حلال کمائی وہ ہے جس میں دونوں پاؤں چلیں، ہاتھ کام کریں اور پیشانی عرق آلود ہو۔ (دیلمی عن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ)

ان ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں مزدوروں کو ایک معزز اور موقر مقام حاصل ہے اور دوسرے پیشوں اور طبقوں سے ان کی حیثیت کم نہیں ہے۔

اُجرت کی مقدار

اس کے بعد مزدوروں کے حقوق کا مسئلہ آتا ہے، جس میں سب سے بنیادی اور اولین چیز اجرت کی مقدار کا تعین ہے۔ اس پر اس حدیث سے روشنی پڑتی ہے جس میں حضور ﷺ نے غلاموں کے سلسلہ میں درج ذیل ہدایات دی ہیں :

> ''وہ تمہارے بھائی ہیں، جن کو خدا نے تمہارے ماتحت رکھا ہے، لہٰذا خدا نے جس کے ماتحت اس کے بھائی کو کیا ہو، اس کو چاہئے کہ اس کو وہی کھلائے جو خود کھائے، جو خود پہنے وہی اس کو پہنائے، اس کو ایسے کام کی تکلیف نہ دے جو اس کے لئے دشوار ہو اور اگر ایسے کام کی ذمہ داری سونپ ہی دے تو پھر اس کی مدد کرے۔'' (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

پیغمبر اسلام اور ان کے اصحابؓ کا اس ہدایت پر مکمل عمل تھا، ان کے غلام اور خدام ان کے ساتھ ہی وہی کھانا کھاتے تھے جو وہ خود کھاتے تھے، غلاموں اور ان کے مالکوں کی کپڑے ایک ہی معیار کے ہوتے تھے، ایک بار ایک ہی قسم کی چادر حضرت ابوذر غفاری ؓ اور ان کے غلام اوڑھے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے عرض کیا آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ وہ چادر بھی خود ہی اوڑھ لیں، تاکہ اس کا جوڑا ہو جائے اور غلام کو کوئی اور چادر دے دیں۔ حضرت ابوذر ؓ نے اس سے انکار کرتے ہوئے حضور ﷺ کی اسی ہدایت کا حوالہ دیا کہ جو خود پہنو وہی اس کو پہناؤ۔ (بخاری عن معرور ؓ)

اس سے معلوم ہوا کہ مزدوروں اور ملازمین کی اجرت اس قدر ہونی چاہئے کہ کم از کم خوراک اور پوشاک کے معاملے میں اس کا معیارِ زندگی مالکین اور افسروں کے مساوی اور یکساں ہو۔

دوسرے اجرت کی مقدار اتنی ہو کہ وہ اہل وعیال کی بھی اسی سطح پر پرورش کر سکے، حسب ضرورت خادم رکھ سکے اور مکان بنا سکے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص ہمارا عامل (ملازم) بنے اسے چاہیے کہ بیوی حاصل کر لے، خادم نہ ہو تو ایک خادم رکھ لے اور مکان نہ ہو تو ایک مکان فراہم کر لے (ابو داؤد عن ستورد بن شداد ؓ) حضرت سیدنا ابوبکر صدیق ؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد فرمایا: میرا ذریعۂ معاش میرے اہل وعیال کے لئے کافی تھا، اب میں مسلمانوں کے کام میں مشغول کر دیا گیا ہوں، اس لئے ابوبکر کے عیال اسی سرکاری مال میں سے کھائیں گے اور ابوبکر مسلمان کے لئے کام کریں گے۔

(بخاری عن عائشہ ؓ)

اجرت کی ادائیگی

اجرت کے سلسلے میں اس اصولی ہدایت کے بعد، کہ ان کی جملہ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کی جائے، اسلام نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ اُجرت کی مقدار پہلے ہی واضح کر دی جائے اور مبہم نہ رکھی جائے۔

"ان رسول الله ﷺ نهى عن استجارة الأجير حتى

یبین له أجره"

رسول اللہ ﷺ نے کسی مزدور سے کام لینے سے منع فرمایا ہے تا آنکہ اس کی اجرت واضح کردی جائے۔

پھر آپ ﷺ کا معمول تھا کہ کسی کو اس کی مزدوری کم نہ دیتے تھے (بخاری عن انس رضی اللہ عنہ)

آپ ﷺ نے فرمایا: تین شخص ایسے ہیں کہ قیامت کے دن میں ان کا دشمن ہوں گا، ان میں سے ایک وہ ہے جو کسی مزدور کو اجرت پر رکھے، اس سے پورا کام لے لے اور اجرت نہ دے (**رجل استاجر أجيروا فاستوفى منه و لم يعطه اجره**) (بخاری عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ)

فقہاء نے لکھا ہے کہ اجرت ادا کرنے کی تین صورتیں ہیں، یا تو خود آجر (Employer) کام سے پہلے اجرت دیدے، یا مزدور نے پیشگی مزدوری دینے کی شرط لگادی ہو، اب بھی اس کو کام سے پہلے ہی مزدوری دینی ہوگی، یا مزدور اپنے کام کی تکمیل کردے تو کام کی تکمیل کے ساتھ اجرت ادا کرنی ہوگی۔ (الفتاویٰ الہندیہ: ۳/ ۵۰۶)

کام کی مقدار

مزدور سے کتنا کام لیا جائے؟ اسلام نے اس کی بھی وضاحت کردی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا غلاموں سے کوئی ایسا کام نہ لو جوان کی طاقت اور قدرت سے ماوراء ہو۔ (موطا امام مالک عن یحی بن یحی) یہ ایک اصول ہے جس کی روشنی میں کام کی نوعیت، مقدار، اوقات تینوں ہی کا تعین کیا جاسکتا ہے، مثلاً اصول صحت کی رو سے جن کاموں کو روزانہ چھ گھنٹے کیا جاسکتا ہے، ان ملازمین کے لئے یہی اوقاتِ کار ہوں گے اور جو کام آٹھ گھنٹے کئے جاسکتے ہیں، ان کے لئے روزانہ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی ہوگی۔

عموماً بعض لوگ کم عمر بچوں یا دراز عمر بوڑھوں سے اتنا کام لینا چاہتے ہیں جتنا جوان آدمیوں سے۔ اسلامی تعلیم کے تحت یہ غلط اور ظالمانہ حرکت ہے، جس پر قانون کے ذریعہ پابندی بھی عائد کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح جو مستقل ملازمین ہیں، ضروری ہے کہ ان کے لیے ہفتہ میں ایک دن آرام کے لئے رکھا جائے، اپنے اقرباء اور رشتہ داروں سے ملنے

کے لئے تعطیل لازمی ہو اور بیماروں کے لئے خصوصی رخصتیں ہوں۔ فقہ کی کتابوں میں اس کی تصریح موجود ہے۔ (ردالمحتار : ۳/۸۰)

حسنِ سلوک

مزدوروں کے ساتھ مالکین اور ذمہ داروں کا کیا سلوک ہونا چاہئے؟ اس سلسلہ میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ تمہارے بھائی ہیں (انھم اخوانکم) یعنی ان سے سلوک حاکمانہ نہیں بلکہ برادرانہ ہونا چاہئے۔ قرآن میں حضرت شعیب علیہ السلام کی بحیثیتِ آجر (Employer) یہ صفتیں بیان کی گئی ہیں:

"وما ارید ان اشق علیك ستجدنی ان شاء الله من الصالحین" (القصص:۲۷)

''میں تم کو تکلیف دینا نہیں چاہتا، ان شاء اللہ تم مجھ کو صالح و نیک پاؤ گے۔''

گویا آجر کا سلوک مزدور کے ساتھ ایسا ہو کہ اس کو تکلیف اور کسی بھی طرح کی ذہنی، جسمانی یا عملی مشقت نہ دے اور اس کے ساتھ نیک سلوک روا رکھے۔ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہمیں اس کا عملی نمونہ یوں ملتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے خاص خدام میں تھے اور بچپن سے جوانی تک آپ ﷺ کے ساتھ رہے، مگر کبھی اس کی نوبت نہیں آئی کہ آپ ﷺ نے اف بھی کہا ہو یا پوچھا ہو کہ یہ کیوں کیا؟ اور یہ کیوں نہیں کیا؟ (بخاری و شمائل ترمذی عن انس رضی اللہ عنہ) آپ ﷺ کے خادموں میں ایک یہودی لڑکا تھا، وہ بیمار پڑا تو آپ ﷺ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ (بخاری) اسی حسن سلوک کا ایک حصہ یہ ہے کہ اگر کوئی مشکل کام اس کو سونپا جائے تو اس کی انجام دہی میں بذاتِ خود بھی مدد کرے۔ (بخاری و مسلم)

منافع میں شرکت

اسلام اس بات کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے کہ مزدور کاروباری نفع میں شریک ہوں۔ ''مضاربت'' کی اصل یہی ہے۔ مضاربت یہ ہے کہ ایک شخص کا سرمایہ ہو اور دوسرے آدمی کا عمل اور محنت، پھر اس سے جو نفع حاصل ہو اس کو باہم متعینہ تناسب مثلاً

پچاس فی صد وغیرہ میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہاں دوسرے فریق کو جو کچھ نفع مل رہا ہے، وہ عامل ہی کی حیثیت سے ہوگا، اس کی طرف اس حدیث میں بھی اشارہ موجود ہے جس میں آپ ﷺ نے کھانا پکانے والے خادم کو کھانے سے کم از کم ایک دو لقمہ کھلانے کی تلقین کی ہے۔ (بخاری، ابوداؤد، ترمذی)

حقوق کا تحفظ

مزدوروں کے حقوق کے سلسلہ میں اسلام نے صرف اخلاقی ہدایت ہی سے کام نہیں لیا، بلکہ اس کو قانونی تحفظ بھی بخشا ہے اور حکومت کے لئے مداخلت کی گنجائش رکھی ہے، چنانچہ قاضی ابوالحسن ماوردی (م ۴۵۰ھ) ''محتسب'' کے فرائض پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اگر کوئی شخص مزدور و ملازم (اجیر) پر زیادتی کرے، مثلاً، اجرت کم دے یا کام زیادہ لے تو محتسب ایسا کرنے سے روکے اور حسب درجات دھمکائے اور اگر زیادتی اجیر کی طرف سے ہو، مثلاً کام کم کرے اور اجرت زیادہ مانگے تو اس کو بھی روکے اور دھمکائے اور اگر ایک دوسرے کی بات کا انکار کریں تو فیصلے کا حق حاکم کو ہے۔'' (الاحکام السلطانیہ للماوردی (مترجم)، باب ۲۰ ص: ۳۹۹)

نقصانات کی ذمہ داری

سوال یہ ہے کہ مزدور یا ملازم سے کوئی چیز ضائع ہو جائے تو اس کا ضامن کون ہوگا؟ اس سلسلہ میں تھوڑی تفصیل ہے۔ مزدوری اور ملازمت کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ معاملہ کی بنیاد کام ہو، دوسرے یہ کہ معاملہ کی اساس وقت ہو، پہلے کی مثال سلائی وغیرہ ہے کہ آپ کسی کو کپڑا سلنے کو دیں، اس صورت میں وہ وقت کا پابند نہیں ہے بلکہ کام کا پابند ہے کہ کپڑا سی کر دے، دوسرے کی مثال اس طرح ہے کہ کسی کو آپ مدرس مقرر کریں کہ وہ روزانہ پانچ یا چھ گھنٹے تعلیم دے، یہاں وہ وقت کا پابند اور اس میں حاضری کا مکلف ہے، چاہے طلبہ ہوں یا نہ ہوں اور پڑھانے کی نوبت آئے یا نہ آئے، اسی طرح دن بھر کے لئے کسی مزدور کو مکان کی تعمیر کے لئے رکھا جائے، یہاں وہ اس بات کا پابند ہے کہ دن بھر اپنا وقت دے۔

پہلے قسم کے ملازم کو"اجیر مشترک"اور دوسرے قسم کے ملازم کو"اجیر خاص" کہتے ہیں۔اجیر مشترک سے کوئی چیز ضائع ہو جائے تو وہ خود اس کا ضامن ہوگا اور تاوان ادا کرے گا،اجیر خاص سے اس کی زیادتی اور ارادہ کے بغیر جو سامان ضائع ہو جائے وہ اس کا ذمہ دار نہ ہوگا۔(فتاویٰ عالمگیری : ۳/ ۵۵۵)

بندھوا مزدور

بندھوا مزدور کی ظالمانہ رسم باوجود ارتقاء اور علم و روشن خیالی کے اب بھی بعض علاقوں میں موجود ہے،مگر اسلام میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔اسلام اس کو انسان کا خالص نجی مسئلہ تصور کرتا ہے کہ وہ کسی کا کام کرے یا نہ کرے،نہ صرف ایک فرد دوسرے فرد کو بلکہ حکومت بھی کسی فرد اور شہری کو اس پر مجبور نہیں کرسکتی،سوائے اس کے کہ کبھی ایسے خصوصی حالات پیدا ہو جائیں کہ قومی اور اجتماعی مصلحت کے تحت افراد کو کسی عمل پر مجبور کرنا پڑے۔

یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے نکاح،خرید وفروخت وغیرہ دوسرے معاملات کی طرح اس میں بھی طرفین کی رضامندی اور آمادگی کو ضروری قرار دیا ہے۔ **وامار کنها فالا يجاب و القبول** (الفتاویٰ الہندیہ: ۳/۵۰۴،کتاب الاجارۃ) اسی طرح اسلام میں ہر شخص کو نقل وحرکت اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آمد و رفت کی آزادی حاصل ہے،اور یہ اس کا خالصتاً ذاتی وشخصی مسئلہ ہے،وہ جہاں اور جس شہر وعلاقہ میں جا کر مزدوری اور ملازمت کرنا چاہے،کرسکتا ہے: " **ومن يهاجر في سبيل الله يجد في الارض مراغما كثيراً وسعة** " (النساء:١٠٠)

مزدوروں کی ذمہ داریاں

جہاں مزدور اور ملازمین کے یہ حقوق ہیں،وہیں ان کی ذمہ داریاں اور فرائض بھی ہیں، جن کی طرف قرآن مجید نے دو مختصر لفظوں میں اشارہ کردیا ہے۔حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس بنیاد پر اپنا ملازم متعین کیا،وہ ان کی صاحبزادی کی یہ اطلاع تھی کہ:

"يا ابت استاجره ان خير من استاجرت القوى الامين "

(القصص:٢٦)

''ابا جان! ان کو مزدور رکھ لیجئے، بہترین مزدور جسے آپ رکھیں گے، وہ ہوگا جو طاقتور اور امانت دار ہو''

یہاں اچھے مزدوروں کی دو صفات بیان کی گئی ہیں: ایک قوت و صلاحیت اور دوسرے امانت و دیانت۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہلیت کے بغیر کسی کام کی ذمہ داری نہ لے، اسی لئے فقہاء نے فاتر العقل طبیب (الطبیب الماجن) کو علاج سے روک دینے کا حکم دیا ہے۔ (الاشباہ والنظائر لابن نجیم)

دوسرے یہ کہ وہ اپنے کام، ذمہ داریوں اور سونپی گئی اشیاء کے معاملہ میں امانت دار اور دیانت دار ہو، اگر مفوضہ کام میں وہ قصداً کوئی نقص رہنے دے یا متعینہ وقت کا اپنی ذمہ داریوں کے لئے پورا پورا استعمال نہ کرے تو یہ بات دیانت کے خلاف ہوگی، چنانچہ علماء لکھتے ہیں:

''عدل کے ساتھ وزن کرو''، میں یہ بھی داخل ہے کہ ملازمین اپنے اوقاتِ ملازمت کا پورا پورا خیال رکھیں۔ (معارف القرآن مصنف مفتی شفیع صاحبؒ)

امانت میں یہ بھی داخل ہے کہ رشوت نہ لے۔ رشوت یہ ہے کہ اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کی انجام دہی کا الگ سے پیسہ وصول کرلے۔ حضور ﷺ نے اس سے بڑی شدت سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہے: رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں ہی دوزخ میں ہے الراشی والمرتشی کلاھما فی النار (طبرانی عن ابن عمرو ؓ) رشوت صرف وہی نہیں ہے جو رشوت کے نام پر لی جائے بلکہ وہ رقم بھی رشوت میں داخل ہے جو عالم لوگ کسی کے عہدے سے متاثر ہو کر ''ہدیہ'' اور ''نذر و نیاز'' کے نام سے پیش کریں۔ رشوت کی یہ وہ قسم ہے جس میں اچھے خاصے لوگ بھی داخل ہیں، چنانچہ فرمایا جو شخص کسی کے لئے سفارش کرے، وہ اس کے لئے تحفہ بھیجے اور وہ اس کو قبول کرے، اس نے بہت بڑا سود لیا ہے (ابو داؤد عن ابی امامہ ؓ) اور حضرت عمر ؓ نے عاملوں کو ہدایا و تحائف بیت المال میں جمع کرنے کا حکم دیا تھا، اسی لئے فقہاء نے قاضی کے لئے فریقین مقدمہ سے ہدیہ قبول کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔

ناجائز ملازمتیں

ایسی چیزوں کی ملازمت اور مزدوری جائز نہیں جو معصیت اور گناہ ہو، اس لئے کہ جس طرح گناہ کرنا جائز نہیں، اسی طرح گناہ کے لئے سبب اور ذریعہ بننا اور اس میں تعاون بھی ناجائز ہے اور جو جس درجہ کا گناہ ہو، اس میں تعاون بھی اسی درجہ کا گناہ ہے، چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں:

" لایجوز الاستجار علی شئی من الغناء والنوح والمزامیر ولاأجرلھم"

مزامیر، نوحہ زنی اور گانے بجانے وغیرہ کے کاموں پر کسی کو اجیر رکھنا درست نہیں اور وہ اجرت کے حقدار نہیں ہوتے ہیں"۔

ظاہر ہے جب ان کاموں کے لئے ملازم رکھنا درست نہ ہوگا اور کوئی شخص معاملہ طے پا جانے کے بعد یہ کام کر ہی لے تو اجرت واجب نہ ہوگی، تو خود کسی شخص کا ایسی ملازمت اختیار کرنا کیوں کر جائز ہوگا اور اس ملازمت کا فائدہ ہی کیا ہوگا جس پر کوئی مزدوری نہ ملے۔

اسی حکم میں سنیما ہال کی ملازمت، گانے بجانے کے کام، انشورنس کی ایجنسی اور انشورنس اور بینک کی ایسی ملازمتیں ہیں جن میں سودی کاروبار لکھنا پڑے یا اس میں لین دین کرنا پڑے۔

عمر ملازمت کے درمیان سبکدوشی

ملازمت کے سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ عمر ملازمت اور درمیان میں سبکدوشی اور معطلی کا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشیں کر لیجئے کہ ملازمت کے احکام کا اصل مدار فریقین کا باہمی معاہدہ ہے؟ اگر کسی ریاست کا قانون ہو کہ اس کے یہاں ملازم اپنی عمر کے ۵۵ یا ۵۸ سال تک ملازمت پر برقرار رہے گا تو یہ گویا ملازم اور حکومت کے درمیان ایک معاہدہ ہے کہ ملازم اپنی عمر اس حد تک پہنچنے تک کارگزار رہے گا اور حکومت اس کو اجیر رکھے گی۔

اب کسی معقول وجہ اور عذر کے بغیر دونوں ہی اس مدت کی تکمیل کے پابند ہوں گے،

نہ حکومت کو اختیار ہوگا کہ وہ اسے معزول کردے اور نہ ملازم کو حق ہوگا کہ بلا وجہ اور حکومت کی رضامندی کے بغیر اس کام سے سبکدوش ہو جائے، چنانچہ فقہاء مکان کے کرایہ پر لگانے کے احکام ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

> "لو قال اجرتك هذه الدار سنة، كل شهر بدرهم جاز بالاجماع فلا يملك أحدهما الفسخ قبل تمام السنة من غير عذر" (فتاویٰ عالمگیری : ۴/ ۵۰۸)
>
> "اگر کوئی شخص یوں کہے" میں نے تم کو یہ مکان ایک سال کے لئے کرایہ پر دے دیا ہے، ہر ماہ کے بدلے ایک درہم، تو بالاتفاق جائز ہے اور فریقین میں سے کوئی ایک سال کی تکمیل تک بلا عذر اس معاملہ کو توڑ نہیں سکتے"۔

ہاں اگر کوئی عذر پیش آجائے تو یک طرفہ اقدام کیا جا سکتا ہے، مثلاً ملازم کو غیر قانونی اور مجرمانہ حرکتوں پر حکومت معزول کر سکتی ہے اور ملازم اپنی ناسازی صحت وغیرہ کی بنا پر کام چھوڑ دینا چاہے تو چھوڑ سکتا ہے۔ یہ حکم جس طرح سرکاری محکموں کا ہے، ایسے ہی پرائیوٹ اداروں کا بھی ہے۔

(۳۰/اپریل ۱۹۹۹ء)

بچہ مزدوری ــــ اسلامی نقطۂ نظر

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس قدر صاحب شعور، صاحب فہم اور طاقتور بنایا ہے، انسان کا نومولود بچہ اسی قدر فہم وشعور سے عاری اور عاجز وناتواں ہوتا ہے، چوپائے کے بچے چند دنوں میں چلنے اور چرنے لگتے ہیں اور ان میں اپنی ضرورت کے مطابق نفع ونقصان کی پہچان پیدا ہو جاتی ہے، لیکن انسان ہے کہ مدتوں کروٹ بدلنے کی طاقت سے بھی محروم اور شعلۂ وشبنم کے ادراک سے بھی عاجز! ربّ کائنات نے ایسے کمزور، بے شعور بچہ کی پرورش کا یہ سروسامان کیا کہ نہ صرف والدین بلکہ عام لوگوں کے دلوں میں بھی بچوں کے لئے محبت کی وافر سوغات رکھ دی، کون صاحب دل ہے جسے بچہ کی معصوم مسکراہٹ اپنی طرف متوجہ نہ کرتی ہو اور اس کا رونا اور بلکنا سخت سے سخت انسان کو بھی تڑپا نہ دیتا ہو؟ بچہ خواہ خوش رنگ ہو یا کالا کلوٹا، صاف ستھرا ہو یا میلا کچیلا، کسی کاشانۂ عشرت میں پیدا ہوا ہو یا آشیانۂ غربت میں، اس کا بچپن کشش سے بھرپور ہوتا ہے اور ممکن نہیں کہ کوئی حساس اور فطرتِ سلیمہ کا حامل اسے دیکھے اور دل بھر نہ آئے اور ماں باپ اور خاندان کے اہلِ تعلق کا کیا کہنا، ان کو تو اپنے بچوں کے معصوم چہرہ میں لالۂ وگل کا نکھار اور غنچۂ وگل کی بوئے عطر بار کا احساس ہوتا ہے۔

اس لئے اسلام میں بچوں کی بڑی اہمیت ہے اور ان کی ایک ایک ضرورت کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں، ان ہدایات میں دو باتیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، ایک ان کی کفالت اور ضروریاتِ زندگی کی تکمیل، دوسرے ان کی تعلیم وتربیت، بچوں کی کفالت کی ذمہ داری والد اور والد نہ ہوں تو حسب مراتب رشتہ داروں پر ہے، جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے، اس لئے یتیم کی کفالت کرنے پر آپ ﷺ نے جنت کی خوشخبری دی ہے، **انا و کافل الیتیم کھاتین**، اوراس کی خاص ترغیبات حدیث میں منقول ہیں، بچوں کی تعلیم وتربیت کے بارے میں آپ ﷺ نے بڑی تاکید فرمائی ہے، آپ ﷺ نے

ارشاد فرمایا کہ اپنے بچہ کو ایک کلمۂ خیر سکھا دینا ایک صاع صدقہ کرنے سے بہتر ہے، غزوۂ بدر میں جو مشرکین قید ہو کر آئے ان کا فدیہ آپ ﷺ نے مقرر فرمایا کہ قیدیوں میں سے جس کو لکھنا پڑھنا آتا ہو وہ دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے، یہ فدیہ آپ ﷺ نے ایسے وقت میں مقرر فرمایا جب مسلمانوں کی غربت وافلاس انتہاء کو پہنچی ہوئی تھی اور فاقہ مستی اہلِ مدینہ کے گویا معمولات میں سے تھی، آپ ﷺ چاہتے تو مالی فدیہ پر اصرار کر کے بہ ظاہر اس کا کچھ مداوا کر سکتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے مسلمان بچوں کی تعلیم کو ان کی معاشی ضرورت سے زیادہ اہم سمجھا۔

آپ ﷺ نے بچوں اور بزرگوں کے بارے میں اصولی ہدایت دی ہے کہ جو چھوٹوں پر رحم اور بزرگوں کی قدر دانی نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے، **"من لم یرحم صغیرنا و لم یوقر حق کبیرنا فلیس منا"** (ابوداؤد: کتاب الادب، باب فی الرحمۃ)

"رحم" ایک جامع لفظ ہے، جو ہر طرح کے حسنِ سلوک اور ہر قسم کی بہی خواہی کو شامل ہے، جیسے کسی شخص کا خود کھانا اور بچوں کو بھوکا رکھنا بے رحمی ہے، اسی طرح بچوں کو کسب زر کا ذریعہ بنانا اور تعلیم و تربیت سے محروم رکھنا اس سے بڑے بے رحمی اور بدخواہی ہے، کیوں کہ یہ ہمیشہ کے لئے ان کو معاشی، اخلاقی اور فکری اعتبار سے پسماندہ اور محروم رکھنے کے مترادف ہے، اس پسِ منظر میں رسول اللہ ﷺ نے تلقین فرمائی کہ کم عمر بچوں کو کسب معاش کا مکلف نہ کرو، اس سے یہ ہوگا کہ کمانہ پائیں گے تو چوری کا ارتکاب کریں گے، **"لا تکلفوا الصغیر الکسب فانه اذا لم یجد سرق"** (مؤطا امام مالک: باب الامر بالرفق بالمملوک)

کم عمر بچوں کو کسب معاش پر لگا دینا کئی وجوہ سے بچوں کے لئے نقصاندہ ہے، قبل از وقت مشقت اس کی صحت اور جسمانی نشو و نما کو نقصان پہنچاتی ہے، چنانچہ بچہ مزدوروں کے سلسلہ میں ملکی اور بین الاقوامی اعداد و شمار سے اس کے متعلق نہایت ہی تشویشناک رپورٹ سامنے آرہی ہے، کیوں کہ ان بچوں کی بے شعوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی صحت کا ٹھیک طور سے خیال نہیں رکھا جاتا، ایسے کام ان سے لئے جاتے ہیں جن میں

آلودگی ان پر اثر انداز ہوتی ہے اور ان کی طاقت وقوت سے بڑھ کر کام ان سے کرایا جاتا ہے، اس سے ان کا معاشی مستقبل تاریک ہوجاتا ہے اور ان کے لئے پوری زندگی ایسی ہی معمولی مزدوری اور کم آمدنی پر انحصار کرنے کے سوا چارہ نہیں رہتا، وہ علم جیسی نعمت سے محروم رہتے ہیں اور ان کی جہالت کی وجہ سے ان کی اگلی نسلیں بھی پستی اور انحطاط کا شکار رہتی ہیں، یہ معاشی اور علمی محرومی ان میں اخلاقی گراوٹ اور تنزل بھی پیدا کرتی ہے، یہ تو ان کا اور ان کی نسلوں کا نقصان ہے۔

قوم وملک کے لئے بھی یہ بات کم نقصاندہ نہیں کہ قوم کا ایک اچھا خاصا حصہ مستقل پسماندہ رہے، وہ جسم صحت منداور طاقتور نہیں ہوسکتا جس کا کوئی ایک عضو بھی بیمار ہو، پھر ان بچوں میں نہ معلوم کیسی کیسی ذہانتیں اور صلاحیتیں چھپی ہوں، اگر وہ بہ روئے کار آتیں تو ان سے سماج کو کس قدر فائدہ پہنچ سکتا تھا! اس لئے کہ کیچڑ میں بھی پھول کھلتے ہیں اور بے قیمت سیپوں ہی کی آغوش میں موتی پرورش پاتا ہے، اگر آپ شہر میں سڑکوں کے کنارے بنے ہوئے ہوٹلوں سے گذریں اور وہاں برتن دھونے اور میزیں صاف کرنے والے ننھے منھے بچوں کی آنکھ میں جھانک کر دیکھیں اور ان سے انٹرویولیں تو آپ بہ آسانی اندازہ کرسکیں گے کہ ان میں بیشتر بچے ذہین اور فہیم ہوتے ہیں اور ان کی آنکھوں کی چمک ان کی صلاحیتوں کی چغلی کھاتی ہیں، مگر افسوس کہ ان پھولوں کے لئے ویران قبرستانوں پر چڑھنا اور مرجھا جانا ہی مقدر ہے۔

اس لئے بچوں کو قبل از وقت کسب معاش کی بھٹی میں جھونک دینا یقیناً اپنے فائدہ کے لئے ان کو ہمیشہ نقصان میں مبتلا رکھنا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اسلام میں ضرر پہنچانے کی گنجائش نہیں، نہ ابتداءً اور نہ ردِّ عمل میں **لا ضرر و لا ضرار** (موطا امام مالک، کتاب الاقضیۃ، باب القضاء فی المرفق) نیز ارشاد ہے کہ جو کسی کو ضرر پہنچائے اللہ اس کو ضرر سے دوچار کریں گے اور جو کسی کو مشقت میں ڈالے اللہ بھی اس کو مشقت میں مبتلا فرمائیں گے، **من ضار ضار الله و من شاق شاق الله عليه**۔ (ترمذی: باب ماجاء فی الخیانۃ والغش)

بچوں کے اس استحصال کو روکنے کے لئے ضروری ہے کہ قومی سطح پر لوگوں کا ذہن

بنایا جائے اور بچوں کے اولیاء کو سمجھایا جائے کہ اگر آج وہ چند روپیہ سے محرومی کو گوارا کر لیں تو کل ان کا بچہ تعلیم یافتہ، باعزت، باشعور اور خوش حال بن سکتا ہے اور ان کی تھوڑی قربانی سے اس کی آنے والی نسلیں ذرہ سے آفتاب بن سکتی ہیں۔ مسلمانوں کو اس سلسلہ میں زیادہ محنت کی ضرورت ہے، کیوں کہ جہالت کی وجہ سے مسلمان بچے اس پسماندگی کا زیادہ شکار ہیں۔

چھوٹے بچوں کو محنت مزدوری پر لگانے کے بنیادی طور پر تین اسباب ہوتے ہیں: اوّل ماں باپ کی مجبوری، دوسرے جاہل والدین اور اولیاء کی بے شعوری، تیسرے والدین کی بے جا حرص وطمع، ان میں سب سے بڑا اور اہم سبب ماں باپ کی غربت اور مجبوری ہوتی ہے، کوئی غریب شخص معذور ہو جائے یا اس کا انتقال ہو جائے اور گھر میں کوئی کمانے والا موجود نہ ہو تو دکھیاری بیوہ کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہوتا کہ اپنے کم عمر نونہالوں کو مشقت کی اس بھٹی میں ڈال کر چند پیسے حاصل کرے، اسی سے اپنا تن ڈھانکے، پیٹ بھرے، اپنی اور گھر کی عزت وآبرو کی حفاظت کرے، سماج اتنا ظالم اور خود غرض ہے کہ وہ کسی غریب کی جھونپڑی پر ترچھی نظر ڈالنے کو بھی تیار نہیں ہوتا اور مجبوری کو دیکھ کر اس کی رہی سہی پونجی بٹورنے بلکہ بعض اوقات اس کی عزت وآبرو کا بھی سودا کرنے کو کمربستہ ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسے مواقع پر ان بے کس وبے آسرا لوگوں کو بچہ مزدوری کے سلسلہ میں قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا، شریعت کا اصول یہی ہے کہ اگر دو خرابیوں میں سے ایک کے ارتکاب پر مجبور ہو جائے تو کمتر درجہ کی برائی کو اختیار کر لے: "**اذا تعارض مفسدتان روعی اعظمهما ضرراً بارتكاب اخفهما۔**"

ایسے موقعوں پر حکومت کو اس بات کی ذمہ داری قبول کرنی چاہئے کہ وہ ایسے بے سہارا گھرانوں کی اقل ترین ضروریات کو پوری کرے، تاکہ قوم کی یہ متاعِ گراں مایہ ضائع نہ ہونے پائے۔ ایسے ہی پریشان حال لوگوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جو کوئی "بوجھ" چھوڑ کر مرا ہو وہ میرے ذمہ ہے اور مال چھوڑ کر رخصت ہوا ہو تو یہ اس کے ورثہ کا حق ہے: "**من ترك كلا فالي ومن ترك مالا فلورثته**" (ابوداؤد) "بوجھ" سے مراد عورتیں، بچے اور قرضے ہیں۔ حضرت عمر ﷛ کے دور میں جب فراخی آئی

تو ولادت کے ساتھ ہی ہر بچہ کا وظیفہ سو درہم مقرر کر دیا جاتا تھا، اگر حکومت عوام کو بچہ مزدوری سے روکنے کے لئے اشتہار کے ایک سے ایک وسائل اختیار کرے اور قانون سخت سے سخت بنائے لیکن ان مسائل کو حل نہ کرے جو اصل میں بچوں کو مزدوری پر لگانے کا سبب ہیں، تو یہ بے فیض ہوگا، بلکہ یہ مفلس و نادار گھرانوں کے ساتھ ظلم کرنے کے مترادف ہوگا، اس لئے حکومت کو ایسے غریب خاندانوں کی کفالت کا مناسب نظم کرنا چاہئے اور ارباب اقتدار کی آسائش اور تفریح گاہوں اور ایوانِ اقتدار کے در و دیوار کی آرائش پر جو کثیر رقوم خرچ کی جاتی ہیں، ان کے بجائے جائز اور صحیح مصارف پر ان کو خرچ کرنا ہوگا۔

جو دکاندار اور کارخانہ داران کم عمر بچوں کی خدمت سے فائدہ اٹھاتے ہیں، ان کو بھی چاہئے کہ قوم کے ان نونہالوں کے حقوق کو محسوس کریں اوّل تو ان سے وہی کام اور اتنا ہی کام لیا جائے جو انکے لئے قابلِ برداشت ہو، آپ ﷺ نے غلاموں کے بارے میں بھی فرمایا کہ ان سے ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لیا جائے، تو ان بچوں سے طاقت سے زیادہ کام لینا کیوں کر روا ہو سکتا ہے، بچہ مزدوری کے سلسلہ میں بین الاقوامی سطح پر جو معلومات جمع کی گئی ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ بعض مالکان ان سے سولہ اور سترہ گھنٹے کام لیتے ہیں اور نہایت قلیل مزدوری ادا کرتے ہیں، جو کھلا ہوا ظلم و جور ہے، دوسرے ان سے کام لینے کے ساتھ ساتھ کچھ ان کی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کیا جائے، تا کہ ان کا مستقبل سنور سکے، چنانچہ آپ ﷺ نے غلاموں اور باندیوں کی بہتر تعلیم و تربیت کی تلقین فرمائی ہے، اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ خادموں اور خادماؤں سے جہاں کام لیا جائے وہاں ان کی تعلیم و تربیت کی بھی فکر کی جائے، تیسرے ان کو ان کی پوری مزدوری ادا کی جائے، ایسا نہ ہو کہ ان کی بے شعوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کام زیادہ لیا جائے اور پیسے کم دیئے جائیں، یہ ناانصافی اور استحصال بھی کم تولنے اور کم ناپنے میں داخل ہے۔

''بچہ'' اور کم عمر کا اطلاق کس سن و سال کے لڑکوں اور لڑکیوں پر ہوگا؟ اس سلسلہ میں جدید میڈیکل تحقیق کی روشنی میں ۱۴ ر سال کی عمر طے کی گئی ہے، حیرت انگیز طور پر بڑے چھوٹے کی تحدید کے لئے جو عمر رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمائی یہ وہی عمر ہے، حضرت

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ غزوۂ احد کے موقع سے مجھے جہاد میں شرکت کے سلسلہ میں پیش کیا گیا، تو آپ ﷺ نے مجھے شریکِ جہاد ہونے کی اجازت نہیں دی، پھر جب غزوۂ خندق میں میری پیشی ہوئی تو آپ ﷺ نے اجازت مرحمت فرمادی، جب نافع ؒ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے سامنے یہ واقعہ ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہی بڑے اور چھوٹے کے درمیان عمر کی حد ہے، چنانچہ اپنے گورنروں کو خط لکھا کہ جو لڑکے پندرہ سال کے ہو گئے ہوں ان کے لئے فوجی خدمت کا وظیفہ مقرر کردیں (بخاری: باب بلوغ الصبیان الخ) یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حکومت محنت و مزدوری کے معاملہ میں ۱۵؍ سال کے لڑکے کو بالغ تصور کرتی ہے لیکن نکاح وغیرہ میں نابالغ۔ اسلامی نقطۂ نظر سے لڑکے اور لڑکیاں اس عمر میں تمام حقوق اور ذمہ داریوں میں بالغ تصور کئے جائیں گے، کہ اس عمر میں جسمانی نشوونما اور شعور وادراک دونوں ہی جہتوں سے انسان حدِ بلوغ کو پہنچ جاتا ہے۔

(۳۰؍ مارچ ۲۰۰۱ء)

ماحولیاتی آلودگی اور اسلام

ابھی چند دنوں پہلے ''عالمی یوم تحفظ ماحولیات'' منایا گیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ماحولیات کے تحفظ کا مسئلہ اس عہد کا نہایت اہم اور گمبھیر مسئلہ بن کر اُبھرا ہے اور اس وقت تمام دنیا کو اس نے اپنی جانب متوجہ کرلیا ہے، کئی عالمی کانفرنسیں اس موضوع پر ہو چکی ہیں اور اس کے لئے ممکنہ تدابیر پر نہایت سنجیدگی اور اہتمام کے ساتھ پوری دنیا میں غور کیا جارہا ہے۔

یوں تو ماحول میں کثافت پیدا کرنے والی بہت سی چیزیں خود قدرت نے انسانی اور حیوانی جسم میں رکھی ہے، جیسے پیشاب، پائخانہ، مردار جسم سے پیدا ہونے والا تعفن وغیرہ، لیکن عصر حاضر کی صنعتی اور مشینی ترقیوں نے ماحولیاتی کثافت کے اسباب میں نمایاں اضافہ کردیا ہے۔ کارخانوں سے خارج ہونے والے فضلات، پٹرول، ڈیزل کے ایندھن، ایرکنڈیشن اور ریفریجیٹر وغیرہ سے خارج ہونے والی گیسیں، ڈیزل اور پٹرول کے ایندھن پر مبنی ٹریفک کی کثرت، یہ تمام چیزیں وہ ہیں جو انسان کو راحت و سہولت کے ساتھ ساتھ غیر معمولی اور غیر محسوس فضائی اور ماحولیاتی کثافت کا تحفہ بھی دے جاتی ہیں۔

نظام قدرت میں توازن کی ایک مثال یہ ہے کہ جہاں اس نے کثافت پیدا کرنے والے قدرتی وسائل عطا کئے ہیں، وہیں اس نے کثافت کو تحلیل کرنے اور انسانیت کو اس کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنے کی غرض سے کچھ قدرتی اور فطری ذرائع بھی پیدا کئے ہیں، جیسے سمندر، کہ اس کا کھارا پانی آلودگی کو جذب کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے، اسی طرح درخت اور جنگلات، یہ جہاں انسان کو صاف و شفاف ہوا فراہم کرتے ہیں، وہیں فضا میں پھیلی ہوئی آلودگی کو جذب کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، خود وہ مٹی جس میں ہم

رہتے بستے ہیں اور جس کی پشت پر ہزاروں سال سے کتنی ہی مخلوق شاد و آباد ہے، وہ بھی ٹھوس کثافت آمیز مادوں تک کو تحلیل کر دیتی ہے۔ جو مردے اور مردار زمین میں دفن کیے جاتے ہیں اور جو گندگیاں اور غلاظتیں زمین کی تہوں میں چھپا دی جاتی ہیں، اگر زمین اپنا سینہ کشادہ کر کے ان کو قبول نہ کرے، تو نہ جانے روئے زمین پر کتنی آلودگی پیدا ہو جائے اور انسان وحیوان کے لئے جینا دوبھر ہو جائے۔

لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ ایک طرف قدرتی وسائل کا ایسا استعمال بڑھتا جا رہا ہے، جس سے ماحولیاتی آلودگی میں اضافہ ہو اور دوسری طرف درخت اور جنگلات جو ہمارے ماحول کی حفاظت کے لئے ایک بہت بڑا قدرتی عطیہ ہیں، انسان نہایت ہی بے رحمی سے ان کو کاٹتا اور ختم کرتا جا رہا ہے، بہت سے جنگلات ہیں جو اب درختوں کے بجائے انسانوں کے جنگل بن گئے ہیں، ان جنگلات میں ایسے حیوانات بھی رہتے ہیں جو بعض کثافت پیدا کرنے والی اشیاء یا جانور کو اپنی غذا بناتے ہیں، جنگلات کا خاتمہ ان کے وجود کو بھی کم کرتا جاتا ہے۔

ان سب کے علاوہ قدرت نے فضا میں بھی ہمارے لئے ''اوزون گیس'' کی صورت میں ایک قلعہ تعمیر کر دیا ہے۔ یہ قلعہ سورج اور فضا کی طرف سے زمین تک آنے والی شعاعوں کی صفائی کا کام کرتا ہے، ان کی وجہ سے شعاعیں اس تناسب کے ساتھ زمین تک پہنچتی ہیں کہ عام حالات میں جسم انسانی کو ان سے کچھ نقصان نہیں پہنچتا، اب اوزون کی یہ قدرتی پرت زمین سے خارج ہونے والی کثیف گیسوں کی وجہ سے دقیق ہوتی اور پھٹتی جا رہی ہے اور ان کی وجہ سے مختلف امراض خصوصاً جلدی کینسر کے عام ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اصل میں تو یہ مغربی اقوام کی شامت اعمال ہے کہ انہوں نے اپنی صنعتی ترقی کے ابتدائی عہد میں اس طرف کوئی توجہ نہیں کی، لیکن اب جب مشرق کی ترقی پذیر اقوام نے انہی قدرتی وسائل کو روبہ کار لانا شروع کیا ہے، تو مغرب کو ماحولیاتی حفاظت کی بابت بڑی ''بے قراری'' سی پیدا ہو گئی ہے۔

بہر حال یہ کسی ایک قوم، ایک علاقہ اور ایک مذہب کے ماننے والوں کا مسئلہ

نہیں، بلکہ یہ عالمی اور بین قومی مسئلہ ہے۔ اسلام جو ایک عالمگیر، جغرافیائی سرحدوں سے ماوراء اور زمانہ وعہد کی قید سے آزاد مذہب ہے، ممکن نہیں کہ وہ اس اہم مسئلہ سے صرفِ نظر کرے۔ اسلام کی تعلیمات اور پیغمبر اسلام ﷺ کی ہدایات وارشادات سے اس سلسلے میں روشنی حاصل کی جاسکتی ہے۔ آپ ﷺ نے ہر ایسی بات سے منع فرمایا جو ماحول کو گندہ اور آلودہ کرتی ہے اور انسانی سماج کے لئے روحانی یا جسمانی لحاظ سے مضرت رساں ہے۔

چنانچہ حضرت معاویہ ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے تین مقامات پر قضاءِ حاجت سے منع فرمایا: ایسی جگہ پر جہاں مسافرین سرراہ پڑاؤ کرتے ہوں، راستے پر، اور درخت کے سایہ میں۔ (ابوداؤد: ۶۲:۱۴۱) اسی طرح آپ ﷺ نے اس کی بھی تلقین فرمائی کہ قضاءِ حاجت کے لئے آبادی سے دور کی جگہ کا انتخاب کیا جائے، بلکہ حضرت عبداللہ ابن عمر ؓ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ آپ ﷺ ضرورت کے لئے مکہ سے قریب دو میل کی دوری پر واقع مغمس نامی مقام پر تشریف لے جاتے تھے۔ (مجمع الزوائد: ۲۰۳/۱) آپ ﷺ نے اس بات سے بھی منع فرمایا کہ کسی برتن میں پیشاب کر کے اسے گھر میں رکھا جائے۔ (طبرانی عن عبداللہ بن یزید)

پانی کی حفاظت کی خاص طور پر آپ ﷺ نے تاکید فرمائی، اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ٹھہرے اور رُکے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کیا جائے۔ (ترمذی) اور حضرت جابر ؓ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے بہتے ہوئے پانی میں بھی پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (مجمع الزوائد: ۲۰۴/۴) اور خاص طور پر آپ ﷺ نے حمام اور غسل خانہ میں پیشاب کرنے کی ممانعت فرمائی۔ (ابوداؤد وترمذی عن عبداللہ بن مغفل)

جن چیزوں سے ماحول آلودہ ہوتا ہے، ان کو زمین میں دفن کرنے کی ہدایت دی گئی۔ اسلام میں مردوں کی تدفین کا نظم قائم کیا گیا، جو حیوانی مردہ اجسام سے پیدا ہونے والی آلودگیوں سے حفاظت کا سب سے مؤثر طریقہ ہے، اسلام نے جیسے مسلمانوں کی تدفین کا حکم دیا ہے، اسی طرح غیر مسلموں کی نعش کو بھی دفن کرنے کی ہدایت کی ہے۔ پھر

غور کیجئے کہ قرآن مجید نے ہابیل و قابیل کے واقعہ میں کوے کو زیر زمین دبانے کا ذکر کیا ہے۔ (مائدہ:۳۱) یہ گویا اس بات کا اشارہ ہے کہ مردار کو بھی یوں ہی نہ چھوڑنا چاہئے، بلکہ ان کو بھی مٹی کے نیچے دبا دینا چاہئے اور کچھ اسی پر موقوف نہیں، دوسرے اجزاءِ جسم جن سے تعفن پھیل سکتا ہو اور آلودگی پیدا ہوتی ہو، ان کو بھی دفن کر دینے کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ حضرت امّ سعد ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے خون کو دفن کرنے کا حکم فرمایا۔ (مجمع الزوائد:۵/۹۲ بحوالہ طبرانی) اسی طرح حضرت سعد بن ابی وقاص ﷺ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ناک سے نکلنے والی آلائش کو دفن کرنے کا حکم فرمایا۔ (مسند بزار، مجمع الزوائد:۸/۱۱۴) اسی لئے فقہاء نے خواتین کو ماہواری کے زمانہ کے آلودہ کپڑوں کو دفن کرنے کا حکم دیا۔

درخت کی حفاظت کی بھی آپ ﷺ نے خصوصی ہدایت دی اور شجر کاری کی ترغیب بھی دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کوئی درخت یا کھیتی لگائے اور اس میں سے انسان، درندہ، پرندہ یا چوپایہ کھائے، تو وہ اس کے لئے صدقہ ہو جاتا ہے۔

(بخاری، کتاب الحرث والمزارعۃ)

اسی لئے بعض صحابہؓ خاص اہتمام سے درخت لگایا کرتے تھے۔ امام احمدؒ نے حضرت ابو درداءؓ سے نقل کیا ہے کہ وہ خاص اسی نیت سے درخت لگایا کرتے تھے (مجمع الزوائد:۴/۶۸۔۶۷) اسی لئے اسلام میں افتادہ سرکاری اراضی کے بارے میں یہ اُصول مقرر کیا گیا کہ جو شخص بھی اس میں کاشت کرنا چاہے، حکومت کی اجازت سے کرسکتا ہے۔ (ابوداؤد) اگر کوئی شخص ایسی اراضی قبضہ میں لے کر پھر اُسے آباد کرنا چھوڑ دے، تو زمین اس سے لے کر دوسرے کو حوالہ کر دی جائے گی، تاکہ وہ اس میں کھیتی کرے۔ (خلاصۃ الفتاویٰ:۴/۳)

جہاں آپ ﷺ نے شجر کاری اور زراعت کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے، وہیں آپ ﷺ نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ درخت بے ضرورت کاٹے جائیں۔ عرب میں زیادہ تر ببول اور بیری ہی کے درخت ہوا کرتے تھے، آپ ﷺ نے بیری کے درخت کے بارے میں

فرمایا کہ اس کو کاٹنے والے اوندھے منہ جہنم میں جائیں گے۔ (مجمع الزوائد: ۱۱۵/۸) ایک ضعیف حدیث میں ایسے شخص پر لعنت بھی بھیجی گئی ہے۔ (طبرانی عن علی ؓ) یہاں تک کہ جنگ میں بھی اسلام نے کھیتیوں اور درختوں کو جلانے اور نقصان پہنچانے کو ناپسند فرمایا ہے۔ قرآن مجید نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے، جو کسی علاقے پر غلبہ پانے کے بعد وہاں کے کھیتوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں (البقرہ: ۲۰۵) ایک حدیث میں آپ ﷺ نے مجاہدین کو خاص طور پر درختوں اور کھیتوں کے برباد کرنے سے منع فرمایا۔

(ترمذی عن ابی بکر الصدیق)

یہی حال حیوانات کا ہے۔ آپ ﷺ نے بلا ضرورت، محض شوقیہ شکار کرنے اور حیوانات کے ہلاک کرنے کو ناپسند فرمایا ہے۔ آج کل جو مضرِ صحت گیسیں، مشینوں اور موٹروں سے خارج ہوتی ہیں، ظاہر ہے عہد نبوی میں یہ وسائل انسانی تصرف میں نہیں آئے تھے، لیکن اس سلسلے میں بھی احادیث میں اشارہ موجود ہے۔ خواہ مخواہ چراغ کے استعمال کو پسند نہیں فرمایا گیا۔ حضرت جابر ؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ صبح کے وقت چراغ جلانے کو ناپسند فرماتے تھے۔ (طبرانی مجمع الزوائد: ۱۱۲/۸) اسی طرح آپ ﷺ نے سوتے وقت چراغ کو گل کرنے کا حکم فرمایا۔ (مسند احمد، مجمع الزوائد: ۱۱۱/۸) ظاہر ہے کہ اس تدبیر سے تیل کا دھواں کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلام میں اشیاء کے برتنے اور استعمال کرنے کے سلسلے میں دو بنیادی اُصول بتائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی بھی شئی کا اس طرح استعمال نہ کیا جائے کہ اس سے دوسروں کو نقصان پہنچے "لاضرر ولا ضرار" دوسرے جن چیزوں کا استعمال جائز ہے اور جو وافر مقدار میں آدمی کو فراہم ہو، ان کو بھی بے محل استعمال نہ کیا جائے اور نہ ضرورت سے زیادہ استعمال کیا جائے۔ اسی کو قرآن کی زبان میں "اسراف وتبذیر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضور ﷺ نے پانی تک کو ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے سے منع فرمایا اور وضوء وغسل میں بھی محتاط طریقے پر پانی کے استعمال کا حکم فرمایا۔ جو شریعت پانی میں اسراف کو گوارا نہیں کرتی ہو، وہ پٹرول، ڈیزل، کیروسین اور المونیم گیس وغیرہ جیسے قیمتی

قدرتی وسائل کے استعمال کو کیوں کر گوارا کر سکتی ہے، جس میں وسائل کا ضیاع بھی ہے اور دوسروں کے لئے مضرت اور نقصان بھی۔ یہ بنیادی اُصول ہیں، جن سے ماحول کو آلودہ کرنے اور نقصان پہنچانے والی اشیاء کے غیر محتاط اور بے جا استعمال کا حکم جانا جا سکتا ہے۔

(۱۹ر جون ۱۹۹۸ء)

عبادت گاہوں سے صوتی آلودگی پھیلنے کا مسئلہ

۳۰؍اگست ۲۰۰۰ء کو سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ عبادت کے لئے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کے سلسلہ میں آیا ہے، اس فیصلہ میں عبادت گاہوں میں ڈھول پیٹنے اور لاؤڈ اسپیکر استعمال کرنے کی سخت مذمت کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ''کوئی بھی مذہب اس کی تلقین نہیں کرتا یا ترغیب نہیں دیتا، کیونکہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال امن وسکون میں خلل ڈالتا ہے، ضعیف ومعذور افراد، طلبہ اور شیر خوار بچوں کو بھی پُر سکون فضا میں نیند لینے کا فطری حق حاصل ہے۔ اور یہ غیر متوازن آواز صوتی آلودگی کا سبب ہے'' —— یہ فیصلہ چرچ آف گاڈ مدارس کی اپیل کے پس منظر میں سامنے آیا ہے، مدارس ہائیکورٹ نے حکومت تمل ناڈو کو ہدایت دی تھی کہ شور شرابہ پر تحدیدات سے متعلق قوانین کی پابندی کرائی جائے، اور مذکورہ چرچ کو اس بات کا پابند بنایا جائے کیوں کہ کے، کے، آر میجسٹک کالونی، ویلفر ایسوسی ایشن کی درخواست کے مطابق یہ چرچ صوتی آلودگی پیدا کر رہا تھا۔

چونکہ فیصلہ کا پورا متن اخبارات میں نہیں آیا ہے، اور تفصیلات غیر واضح ہیں، اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ عدالت نے اس بارے میں کیا تحدیدات عائد کی ہیں، کیونکہ حسب ضرورت سامعین تک آواز پہونچانے کا نظم ایک بنیادی ضرورت بھی ہے۔ اور بنیادی انسانی حق بھی، یقیناً عدالت کا مقصد ایسی جائز صورت پر امتناع عائد کرنا نہیں ہوگا۔ اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ صوتی آلودگی کا تعلق صرف مذہبی مقاصد کے لئے استعمال ہی سے نہیں ہے، بلکہ غیر مذہبی مقاصد کے لئے بھی وہ اسی قدر مضر اور تکلیف دہ ہے۔ اور شاید سیاسی جماعتیں اور تنظیمیں اس سلسلہ میں نصح وہدایت کی زیادہ مستحق ہیں، لیکن مسئلہ بہرحال اہم ہے، اور اس پر اعتدال اور عدل کے ساتھ عمل کرانے کی ضرورت ہے، عدل کا لفظ میں اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ اکثر وبیشتر اس طرح کے قوانین

اقلیتوں کے خلاف استعمال کئے جاتے ہیں، اور اکثریت کے ساتھ خون معاف ہوتے ہیں حکومت نقض امن کے نام پر پہلو تہی برتتی ہے اور عدالت بھی ان کے معاملہ میں بے بس ہوتی ہے، اس وقت حیدرآباد میں گنیش تہوار کی تیاری چل رہی ہے، اور گلی کوچوں میں کان کو بہرا کردینے والی آوازوں کا گویا ایک سیلاب سا آیا ہوا ہے جو تھامے نہیں تھمتا ہے، یہ شور اکثر اوقات بلاوقفہ چوبیس گھنٹہ جاری وساری رہتا ہے، پہلے لوگ خود گاتے اور نعرے لگاتے تھے، اس لئے قدرتی طور پر ایک حد قائم رہتی تھی، لیکن اب آدمی کی جگہ ٹیپ ریکارڈ نے لے لی ہے، اس لئے وہ بلا تعب و تھکن دن و رات نغمہ ریز رہتا ہے، اور بہت سے لوگ جو آواز کے معاملہ میں نازک مزاج واقع ہوئے ہیں، وہ کروٹ بدلتے اور نیند کو مناتے صبح کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا عدالتیں اور حکومتیں ان مواقع پر بھی اسی طرح حرکت میں آئیں گی جیسا کہ انہوں نے ایک چرچ کے بارے میں ''فرض شناسی'' کا اور بچوں اور معذوروں کے حقوق کی پاسداری کا ثبوت دیا ہے۔

جہاں تک آواز کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی بات ہے تو وہ یہی ہے کہ آواز حدِ اعتدال میں رہنی چاہئے، ضرورت سے زیادہ آواز کے بلند کرنے کو اسلام پسند نہیں کرتا، عربوں کا ایک عجیب مزاج تھا کہ وہ آواز کی بلندی کو باعث افتخار جانتے تھے، اور پست آواز کو وجہِ ذلت تصور کرتے تھے، یہاں تک کہ عرب شعراء بھی کسی انسان کے جانور کی طرح بلند آواز ہونے کو بہ طور مدح و تعریف کے ذکر کرتے تھے، (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۷۲/۱۴)

قرآن مجید نے اس غلط سوچ پر متنبہ کیا اور ارشاد فرمایا:

> ''اپنی چال میں اعتدال رکھو، اور اپنی آواز کو پست رکھو کہ سب سے بدترین آواز گدھے کی آواز ہے''۔ (لقمان: ۱۹)

گدھے کی آواز چونکہ بہت تیز اور ناہموار ہوتی ہے، اس لئے اس کو سب سے مکروہ آواز قرار دیا گیا ہے، اس سلسلہ میں مفسرین نے لکھا ہے کہ ضرورت سے زیادہ اونچی آواز میں تکلف بھی ہے، اور دوسرے کے لئے تکلیف بھی **''فان الجهر باكثر من الحجاة تكلف يؤذي''**۔ (الجامع الاحکام القرآن: ۷۱/۱۴) علامہ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ ایسی آواز کو

گدھے کی آواز سے مشابہ قرار دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر معتدل آواز ناجائز اور مذموم ہے۔ (ابن کثیر: ۳/۴۴۶)

عام حالات میں تو آواز کو معتدل رکھنے کا حکم ہے ہی، عبادات اور دینی افعال میں بھی اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، آپ ایک بار رات کے وقت باہر نکلے تو حضرت ابوبکرؓ کو دیکھا کہ مصروف نماز ہیں، اور بہت ہی دھیمی آواز میں قراءت کررہے ہیں، پھر حضرت عمرؓ کے پاس سے گذر ہوا، وہ بھی نماز پڑھ رہے تھے، اور بہت زور زور سے قرآن کی تلاوت فرمارہے تھے، جب آپ کے یہ دونوں برگزیدہ رفقاء حاضر خدمت ہوئے تو آپ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ سے آہستہ قرآن پڑھنے کی وجہ پوچھی، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ جس ذات سے میں سرگوشی کررہا تھا۔ میں نے اس کو تو سنادیا، یعنی اللہ تعالیٰ نے تو میری آواز سن لی، حضرت عمرؓ سے دریافت فرمایا کہ تم اتنی بلند آواز سے کیوں پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میں سوتے ہوؤں کو جگارہا تھا۔ اور شیطان کو بھگارہا تھا، آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو تلقین فرمائی، کہ وہ کسی قدر اپنی آواز کو بلند کریں، اور حضرت عمرؓ کو ہدایت دی کہ وہ اپنی آواز کو پست کریں (ابوداؤد: حدیث نمبر: ۱۳۲۹) معلوم ہوا کہ قرآن کی تلاوت میں بھی آواز کو معتدل ہونا چاہئے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی میں معتکف ہوئے، اور لوگوں کو زور زور سے قراءت کرتے ہوئے سنا، تو پردہ ہٹایا اور ارشاد فرمایا کہ تم سب اپنے رب سے سرگوشی کررہے ہو، تم ایک دوسرے کو تکلیف نہ دو، اور قرآن پڑھنے میں ایک دوسرے پر آواز بلند نہ کرو، (ابوداؤد: حدیث نمبر ۱۳۳۲) بلکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن مواقع پر قرآن کو زور سے پڑھنے کی خصوصی ہدایت نہیں ہے، ان مواقع پر آہستہ قرآن پڑھنا افضل ہے۔ چنانچہ حضرت عقبہ بن عامرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قرآن کو زور سے پڑھنے والا کھلے عام صدقہ کرنے والے کی طرح ہے، اور قرآن کو آہستہ پڑھنے والا چھپا کر صدقہ کرنے والے کی مانند ہے، **الجاهر بالقرآن كالجاهر بالصدقة والمسر بالقرآن كالمسر بالصدقة**

(ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۳۳۳)

فقہاء نے بھی اس پہلو کو ملحوظ رکھا ہے، چنانچہ مشہور فقیہ علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں،

" و یجهر الامام وجوبا بحسب الجماعة فان زاد علیه اساء " (الدر المختار مع الرد ۲/۲۴۹)

امام جماعت کے اعتبار سے ہی جہر کرے گا، اگر اس سے زیادہ زور سے پڑھے تو اس نے نامناسب عمل کیا۔

اور علامہ شامیؒ نے نقل کیا ہے کہ اتنی بلند آواز جو خود اس کو تھکادے، اور دوسرے کے لئے اذیت کا باعث ہو، اچھی بات نہیں، (ردالمختار: ۲/۲۴۹) ـــ اس سے معلوم ہوا کہ بعض سیدھے سادھے مسلمان بھائی جو مسجد میں نماز کے لئے بیرونی مائک کا استعمال کرتے ہیں، جس کی آواز مسجد سے باہر سڑکوں اور بازاروں میں پھیلتی ہے، یہ کوئی پسندیدہ عمل نہیں، کیونکہ جیسا کہ مذکور ہوا خود رسول اللہ ﷺ نے قراءت قرآن میں آواز کے بہت بلند کرنے کو پسند نہیں فرمایا ہے، دوسرے اس میں قرآن مجید کی اہانت کا اندیشہ بھی ہے، کیونکہ قرآن کے احترام کا تقاضا ہے کہ سننے والے پوری طرح قرآن کی طرف متوجہ اور یکسو رہیں، اور غور سے سنیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں، بات چیت کرتے رہتے ہیں، کاروبار کی طرف متوجہ رہتے ہیں، اور قرآن کے سننے کا حق ادا نہیں ہوتا، گویا ہم لوگ بالواسطہ قرآن مجید کی بے احترامی کا سبب بنتے ہیں۔

اسلام میں صرف اذان کے لئے بلند آواز کو پسند کیا گیا ہے، کیونکہ اس کا مقصد ہی اظہار و اعلان ہے، اور وہ اس کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال ؓ کو اسی لئے اس خدمت پر مامور فرمایا کہ ان کی آواز بلند تھی، (ترمذی:) لیکن اذان میں بھی ایسا ہی آواز مطلوب ہے جو اہلِ محلہ تک پہونچ جائے، سیدنا حضرت عمر ؓ کے سامنے ایک صاحب نے اذان دی، اور آواز کو بلند کرنے میں بہت تکلف سے کام لیا، تو آپ ؓ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا (تفسیر قرطبی: ۱۴/۱۷) ـــ پھر اذان ایک مختصر سا عمل ہے، جو زیادہ سے زیادہ دو تین منٹ میں مکمل ہوجاتی ہے، جو غیر مسلم بھائیوں کے لئے بھی

اذیت کا باعث نہیں ہوتی۔

رہ گیا گانا بجانا، ڈھول باجے، رقص وسرور، نعرہ بازی، بے وقت اور بے محل محلہ کا آرام غارت کردینے والی تقریریں اور شور وہنگامے، تو اسلام ان کا قائل نہیں۔ بلکہ ایسے تکلیف دہ رویہ کو ناپسند کرتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے تو بازار میں اور میدان جنگ میں بھی بے جا شور وشغب پر ناپسندیدگی ظاہر فرمائی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بازار میں شور وہنگامے کرنے والے کو ناپسند کرتے ہیں، ان اللہ یبغض ...... صخاب فی الاسواق (موارد الظمان، حدیث نمبر: ۱۹۷۵) ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سماج میں اسلامی زندگی کے صحیح خدوخال پیش کریں۔

جانور اور اسلامی تعلیمات

اسلام کا ابر رحمت صرف انسانوں پر ہی نہیں برسا، بلکہ اس نے پوری کائنات کو آبیار کیا، جہاں اس نے ناطق انسان کو اپنے کرم سے سرفراز فرمایا، وہیں بے زبان جانوروں کو بھی اپنی رحمت بے کراں سے مالا مال کیا۔ انسان جب شقاوت پر اُتر آتا ہے اور ظلم و جور اس کی طبیعت بن جاتی ہے، تو پھر اس کے ظلم و جور کی کوئی نہایت نہیں رہتی، وہ بے زبان جانوروں پر بھی مشق ستم کرنے لگتا ہے اور تہذیب و شائستگی کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔ اسلام سے پہلے عربوں کے گزر بسر کا ذریعہ یہی جانور تھے، ان کا دودھ غذا کا کام دیتا، ان کی پشت سواری اور بار برداری کا سب سے بڑا ذریعہ تھی، ان کی تجارت کا دارو مدار انہی سواریوں پر تھا، ان کے چمڑوں سے بھی مختلف کام لئے جاتے تھے، لیکن ان سب کے باوجود جانوروں کے ساتھ ان کا سلوک بے رحمانہ اور جفا کارانہ تھا۔

آپ ﷺ نے ایسے غیر انسانی سلوک کو منع فرمایا، جانور کے منہ پر مارنے کی ممانعت کی، لوگ جانوروں کو باہم لڑاتے اور اس کا تماشہ دیکھتے تھے، آپ ﷺ نے اس درندگی کو روکا، جانور کی خوراک اور ضروریات کی رعایت کرنے کا بھی حکم دیا۔ ایک اُونٹ کو دیکھا کہ اس کا پیٹ پشت سے لگا ہوا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا ان کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، اسی سلسلہ میں ایک معجزہ بھی ظاہر ہوا، ایک اُونٹ نے اپنے مالک کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے اس کے مالک کو تنبیہ فرمائی، آپ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ اگر سر سبز و شاداب موسم میں سفر کرو تو آہستہ چلاؤ اور جانور کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دو، اور قحط کا موسم ہو تو تیز تیز چلاؤ۔ آپ ﷺ نے اس بات کی بھی تلقین کی کہ جو جانور جس کام کے لئے ہے اس سے وہی کام لو، آپ ﷺ نے ''منبر'' کے طور پر جانور سے کام لینے سے منع فرمایا۔ جانور کو منبر نہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ جانور اسٹیج کے طور پر استعمال نہ کیا جائے کہ اس پر

کھڑا ہو کر یا بیٹھ کر تقریر کی جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک بیل پر ایک آدمی سواری کر رہا تھا، اللہ کی قدرتِ خاص سے بیل اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا میں اس کام کے لئے پیدا نہیں کیا گیا ہوں ـــــ ''انی لم اخلق لهذا ''۔

آپ نے فرمایا کہ آخرت کا ثواب وعذاب جانوروں کے ساتھ اچھے اور بُرے سلوک سے بھی متعلق ہے، قیامت کے دن ایک عورت محض اس لئے دوزخ میں ڈالی جائے گی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا، اسے اس کا موقع نہیں دیا گیا کہ وہ خود کھائے اور چر کر اپنی ضرورت پوری کرے اور ایک شخص اس بناء پر جنت میں داخل کیا جائے گا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کی پیاس دور کی ہوگی اور اسے پانی پلایا ہوگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کی لگائی ہوئی کھیتیوں میں سے چرند و پرند جو کھالیں اس پر بھی صدقہ کا ثواب ہے۔

اسلام نے گوشت خوری کی اجازت ضرور دی ہے، لیکن بلا وجہ جانوروں کو مارنے کے درپے ہونا درست نہیں ہے۔ کسی صاحب نے ایک گوریا پکڑ رکھا تھا اور اس کی ماں بے قرار تھی، آپ ﷺ نے اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ بلا ضرورت ایک گوریا کو ذبح کرنے پر بھی جواب دہی ہے۔ اسی لئے جو چیزیں انسانی کام نہیں آتیں، آپ ﷺ نے ان کو مارنے سے منع فرمایا، چیونٹی، شہد کی مکھی اور ہد ہد وغیرہ کے مارنے کی آپ ﷺ نے صراحتاً ممانعت فرمائی، کسی روح کے جلانے کو آپ ﷺ نے شدت سے روکا ہے۔ ایک دفعہ لوگوں نے ایسی جگہ چولہا سلگایا جہاں چیونٹی کے بل تھے، آپ ﷺ نے چولہا بجھانے کا حکم دیا۔ خود قرآن مجید میں ایک پیغمبر کا ذکر ہے۔ جن کے حکم سے چیونٹیاں جلائی گئی تھیں، اسی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر عتاب فرمایا۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اسلام نے گوشت خوری کی اجازت دے کر بے رحمی کا ثبوت دیا ہے۔ ہمارے بعض ناواقف ہندو بھائیوں کے یہاں تو اسلام نام ہی گوشت خوری کا ہے۔ اس سلسلہ میں اول تو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ہندوستانی مذاہب کے سوا دُنیا کے تمام مذاہب میں گوشت خوری کی اجازت دی گئی ہے اور گوشت کو

ایک اہم انسانی غذا تسلیم کیا گیا ہے، ہندوستانی نژاد مذاہب میں بھی سوائے ''جین مذہب'' کے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام مذاہب میں گوشت خوری کا جواز موجود ہے۔ آج کل ہندو بھائیوں کے یہاں یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ ان کے یہاں گوشت خوری سے منع کیا گیا ہے، لیکن یہ محض اپنے مذہب اور تاریخ سے ناواقفیت ہے، خود ویدوں میں جانوروں کے کھانے پکانے اور قربانی کا تذکرہ موجود ہے۔ رگ وید میں ہے:

اے اندر! تمہارے لئے پسان اور وشنو ایک سو بھینسیں پکائیں۔

(رگ وید: ٦/١١-١٧)

یجر وید میں گھوڑے، سانڈ، بیل، بانجھ گایوں اور بھینسوں کو دیوتا کی نذر کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ (یجر وید، ادھیائے: ٢٠/٧٨)

منوسمرتی میں کہا گیا ہے:

''مچھلی کے گوشت سے دو ماہ تک، ہرن کے گوشت سے تین ماہ تک، بھیڑیے کے گوشت سے چار ماہ تک اور پرند جانور کے گوشت سے پانچ مہینے تک پتر آسودہ رہتے ہیں۔ (منوسمرتی ادھیائے: ٣/٢٦٨)

خود گاندھی جی نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ایک زمانہ تک ہندو سماج میں جانوروں کی قربانی اور گوشت خوری کا عمل عام تھا اور ڈاکٹر تاراچند کے بقول ویدک قربانیوں میں جانوروں کے چڑھاوے بھی ہوا کرتے تھے۔

جو لوگ گوشت خوری کو منع کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ یہ زندہ وجود کو قتل کرنے یعنی ''جیو ہتیا'' کا باعث بنتا ہے، لیکن غور کیا جائے تو کائنات کا فطری نظام یہی ہے کہ خالق کائنات نے کم تر مخلوق کو اپنے سے اعلیٰ کے لئے غذا اور وسیلۂ حیات بنایا ہے۔ غور کریں کہ کیا اس جیو ہتیا سے بچنا ممکن بھی ہے، آپ جب پانی یا دودھ کا ایک گلاس اپنے حلق سے اُتارتے ہیں تو سینکڑوں جراثیم ہیں جن کے لئے آپ اپنی زبانِ حال سے پروانہ موت لکھتے ہیں، پھر آپ جن دواؤں کا استعمال کرتے ہیں وہ آپ کے جسم میں پہنچ کر کیا کام کرتی ہیں؟ یہی کہ جو مضر صحت جراثیم آپ کے جسم میں پیدا ہوگئے ہوں اور پنپ رہے

ہوں، ان کا خاتمہ کردیں۔ پس جیو ہتیا کے وسیع تصور کے ساتھ تو آپ پانی تک نہیں پی سکتے اور نہ دواؤں کا استعمال آپ کے لیے روا ہو سکتا ہے۔

پھر آج کی سائنس نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ جس طرح حیوانات میں زندگی اور روح موجود ہے، اسی طرح پودوں میں بھی زندگی کارفرما ہے، اور نباتات بھی احساسات رکھتے ہیں۔ خود ہندو فلسفہ میں بھی پودوں میں زندگی مانی گئی ہے، سوامی دیانند جی نے ''آواگون'' میں روح کے منتقل ہونے کے تین قالب قرار دیئے ہیں، جن میں ایک نباتات بھی ہے، یہ نباتات میں زندگی کا کھلا اقرار ہے، تو اگر جیو ہتیا سے بچنا ہو تو نباتاتی غذا سے بھی بچنا ہوگا، گویا اس کائنات میں ایسے انسانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں جو مکمل طور پر جیو ہتیا سے بچ کر جینا چاہتے ہیں۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ گاؤ کشی وغیرہ کی ممانعت کا مطالبہ ہم مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں کرتے، بلکہ یہ ایک معاشی ضرورت ہے، جانور اگر ذبح نہ کئے جائیں تو لوگوں کو دودھ اور گھی سستی قیمتوں میں فراہم ہوں گے اور عام لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچے گا، لیکن یہ محض ایک واہمہ کا درجہ رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن ملکوں میں ہندوستان سے زیادہ جانور ذبح ہوتے ہیں اور جہاں جانوروں کے ذبح پر کسی قسم کی پابندی نہیں، وہاں بہ مقابلہ ہمارے ملک کے گھی اور دودھ سستے بھی ہیں اور ان کی فراوانی بھی ہے، اس کی مثال امریکہ اور یورپ ہیں۔ ہمارے ملک میں باوجودیکہ بہت سے علاقوں میں ذبح گاؤ پر پابندی ہے اور عام جانوروں کے ذبح کرنے پر بھی خاص تحدیدات ہیں، لیکن دُنیا کی تاریخ اور خود ہمارے ملک کا موجودہ ماحول اس کی تردید کرتا ہے، آج ہندوستان میں جہاں کہیں ہندو مسلم فسادات ہوئے ہیں اور جن لوگوں نے میرٹھ اور بھاگلپور میں ظلم وستم کا ننگا ناچ کیا ہے، وہ سب کچھ ان لوگوں کے ہاتھوں ہوا ہے جو سبزی خور ہیں اور گوشت خوری کے مخالف ہیں۔ رہنمایانِ عالم میں شری گوتم بدھ اور حضرت مسیح علیہ السلام کو عدمِ تشدد اور رحم دلی کا سب سے بڑا داعی اور نقیب تصور کیا جاتا ہے، لیکن کیا یہ برگزیدہ شخصیتیں گوشت نہیں کھاتی تھیں، یہ بھی گوشت خور تھے، گوتم بدھ نہ صرف گوشت خور تھے بلکہ دم آخر میں گوشت کھا کر ہی ان

کی موت ہوئی تھی اور ہٹلر سے بڑھ کر کوئی تشدد، جور وستم اور بے رحمی کا نقیب ہوگا؟ لیکن ہٹلر گوشت خور نہیں تھا، صرف سبزی کو اپنی غذا بناتا تھا۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ ہنسا اور اہنسا کا تعلق محض غذاؤں سے ہے، بے وقوفی اور ناسمجھی ہی کہی جاسکتی ہے، جب تک دلوں کی دنیا تبدیل نہ ہو، انسان انسانیت سے محبت کرنا نہ سیکھے، خدا کا خوف نہ ہو اور آخرت میں جوابدہی کا احساس نہ ہو، محض غذائیں انسان کے مزاج و مذاق کو تبدیل نہیں کرسکتیں۔

(۱۶/اکتوبر ۱۹۹۸)

ہڑتال ــــ اسلامی نقطۂ نظر

آج کل احتجاج اور مظاہرہ کا حق جمہوریت کی پہچان اور شناخت بن گئی ہے، ترقی یافتہ ممالک میں علامتی احتجاج کیا جاتا ہے، مثلاً ایک منٹ کے لئے قلم رکھ دینا، پانچ دس منٹ کام کرنے سے باز رہنا، حکومت کو میمورنڈم پیش کرنا وغیرہ، لیکن ترقی پذیر ممالک کے لئے کوئی قاعدہ وضابطہ نہیں ہے، طویل سے طویل تر مدت کا بھی احتجاج ہوسکتا ہے، احتجاج اشتعال کی صورت بھی اختیار کرسکتا ہے، احتجاج کے نام پر پرتشدد مظاہرے کئے جاتے ہیں اور سرکاری اور عوامی املاک کی بربادی احتجاج میں کامیابی کی علامت متصور ہوتی ہے، بعض محکموں کے ملازمین مہینوں احتجاج کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں، حتی کہ لازمی اور ناگزیر خدمات کے ملازمین بھی احتجاج کرنے سے نہیں چوکتے، ہسپتال ہفتوں بند رہتے ہیں، پوسٹ آفس کا کام کاج ٹھپ پڑ جاتا ہے، ٹرینیں اور بسیں بند ہوجاتی ہیں، غرض کہ غریب اور پسماندہ ملکوں میں احتجاج عملاً ہر طرح کے قواعد وضوابط سے آزاد ہے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے ٹرک کی ہڑتال ہوئی، جو ایک قیامت سے کم نہیں تھی، ضروریات زندگی کی قیمتیں جو پہلے ہی سے بڑھی ہوئی ہیں، آسمان سے باتیں کرنے لگیں، بازار میں طلب اور رسد کا توازن بگڑ گیا، ملک کو اس سے جو شدید نقصان ہوا، وہ بہت ہی سنگین اور افسوس ناک ہے۔ اس ہڑتال سے پہلے بعض سرکاری ملازمین کی ہڑتال تھی اور اب خبر ہے کہ آٹو کی ہڑتال ہونے والی ہے۔ غرض ہڑتال ہماری روزمرہ کی زندگی کے معمولات میں سے ہے، شاید ہی کوئی دن گذرتا ہو کہ ملک کے کسی حصہ میں کوئی نہ کوئی ہڑتال نہ پائی جاتی ہو۔

ہڑتال کا اصل مقصد ظلم وناانصافی پر احتجاج کرنا ہے۔ ظلم پر احتجاج اور آئین کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس پر ناراضگی کا اظہار یقیناً انسان کے بنیادی حقوق میں سے ہے، اسلام بھی اس حق کو تسلیم کرتا ہے۔ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:

''لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ، وَكَانَ اللّٰہُ سَمِیْعًا عَلِیْمًا'' (النساء:۱۴۸)

''اللہ تعالیٰ بری بات کے زور سے کہنے کو پسند نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ کوئی مظلوم ہو، اللہ سننے والے اور جاننے والے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ظلم و ناانصافی کے خلاف مناسب طریقہ پر احتجاج و مظاہرہ کا جواز معلوم ہوتا ہے، ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے میں عدالت سے چارہ جوئی، احتجاجی جلسہ، پرامن احتجاجی ریالی تو شامل ہے ہی، آج کے ذرائع ابلاغ کے پسِ منظر میں اخبارات، ریڈیو اور دوسرے ذرائع سے اپنے موقف کی وضاحت اور حکومت کے نارواروبہ سے اختلاف کا اظہار بھی اس میں داخل ہے، اسی طرح حکومت سے نمائندگی اور دوسرے قانونی ذرائع سے اپنی خفگی اور برہمی کا اظہار بھی اس میں شامل ہے۔

احتجاج کے لئے ایسے ذرائع کا اختیار کرنا جس سے عام لوگوں کو نقصان نہ پہنچے، اس کی بھی گنجائش ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ ایک صاحب خدمتِ اقدس ﷺ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرا ایک پڑوسی ہے جو مجھے اذیت پہنچاتا رہتا ہے، آپ ﷺ نے اس سے ارشاد فرمایا کہ اپنا سامان نکال کر راستہ پر رکھ دو، اس شخص نے اپنا سامان لیا اور راستہ پر ڈال دیا، جو بھی وہاں سے گذرتا استفسار حال کرتا، وہ شخص کہتا کہ میرا پڑوسی مجھے اذیت دیتا ہے، اس لئے میں نے یہ سامان باہر نکال رکھا ہے، گذرنے والا کہتا اس پر اللہ کی لعنت ہو، اللہ اسے رسوا کرے، آخر پڑوسی آیا اور اس نے درخواست کی کہ اپنے گھر لوٹ چلو، اب میں تم کو کبھی اذیت نہیں دوں گا (تفسیر ابن کثیر:۱/۵۷۱) یہ بھی گویا احتجاج کا ایک طریقہ ہے۔ فقہاء نے بیوی کو اس بات کا اختیار دیا ہے کہ اگر مہر فوراً قابلِ ادائیگی تھا اور شوہر نے ادا نہیں کیا، تو جب تک شوہر مہر ادا نہ کردے، عورت کے لئے یہ درست ہے کہ وہ شوہر کو اپنے نفس پر قدرت نہ دے، یا شوہر کے گھر نہ جائے، اس کے باوجود اس کا حق نفقہ شوہر سے متعلق رہے گا۔ یہ بھی گویا احتجاج ہی کی ایک صورت ہے۔

آج کل احتجاج کی اکثر صورتیں ایسی ہیں جو بیک وقت کئی طبقوں کے لئے سخت

نقصان اور مضرت کا باعث ہوتی ہیں اور وہ قومی اور اجتماعی نقصان کا سبب بنتی ہیں، مثلاً یہی گاڑی کی ہڑتال ہے، یونین ہڑتال کا فیصلہ کرتی ہے، لیکن ہڑتال میں جو ڈرائیور اور متعلقین شریک ہوتے ہیں وہ عام طور پر نہایت قلیل آمدنی کے حامل ہوتے ہیں، روز کمانے اور روز کھانے کے اصول پر ان کی زندگی گذرتی ہے، خود ان کے گھروں میں فاقوں کی نوبت آجاتی ہے، لیکن اجتماعی فیصلہ کی وجہ سے وہ اس کی مخالفت نہیں کر سکتے، دوسرا نقصان کاشت کاروں اور صنعت کاروں کا ہوتا ہے، مال کی پیدائش جاری رہتی ہے اور اس کی ترسیل اور فروخت رکی رہتی ہے، بعض زراعتی اشیاء تو ایسی ہوتی ہیں کہ سڑنے لگتی ہیں اور بالکل ہی ضائع ہوکر رہ جاتی ہیں اور ان دونوں سے بڑھ کر نقصان عوام کا ہوتا ہے، چوں کہ بازار میں طلب بڑھ جاتی ہے اور سامان کی رسد کم ہو جاتی ہے، اس لئے قیمتیں غیر متوازن ہو جاتی ہیں، دس روپے کی چیز سو روپے میں فروخت ہوتی ہے اور لوگ اسے لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اسلام کے نظامِ تجارت میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ قیمتوں میں توازن کو متاثر نہ ہونے دیا جائے، اسی لئے ''احتکار'' کو منع کیا گیا۔ احتکار کے معنی ذخیرہ اندوزی کے ہیں، یعنی تاجر اشیاءِ ضروریہ کو خرید کر روک لے، بازار میں نہ لائے، تاکہ مصنوعی قلت پیدا کی جا سکے، اس طرح قیمتیں بڑھ جائیں اور دو کی چیز دس میں فروخت کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقہ کی سخت مذمت فرمائی ہے اور شدت سے منع کیا ہے۔ اسی طرح حدیثوں میں ''تلقیِ جلب'' سے منع فرمایا گیا ہے۔ ''تلقیِ جلب'' کا مطلب یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں عام طور پر ایک شہر سے دوسرے شہر تجارتی قافلے جایا کرتے تھے، یہی ایک مارکٹ سے دوسری مارکٹ میں سامان کے پہنچنے کا ذریعہ تھے، ہوتا یہ تھا کہ جب کسی شہر کو کوئی قافلہ آنے والا ہوتا تو چند سرمایہ کار شہر سے باہر نکل کر پہلے ہی سامان خرید کر لیتے اور کھلے بازار میں سامان پہنچ نہیں پاتا، اسی طرح اشیاءِ ضرورت پر چند تاجروں کی اجارہ داری قائم ہو جاتی اور گرانی میں اضافہ ہوتا۔ یہ بھی ایسی صورت ہے جو قیمتوں کے فطری توازن کو متاثر کر دیتی ہے، اس لئے آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ اسی طرح کی ایک اور صورت

بھی ہے، جس سے منع فرمایا گیا ہے اور وہ یہ کہ دیہات کے لوگ اپنی پیداوار فروخت کرنے کے لئے شہر آتے اور جلد واپس جانا چاہتے، اس لئے وہ اپنا مال نسبتاً سستا فروخت کرتے، عوام کو یہ فائدہ ہوتا کہ سامان سستا ملتا اور کاشت کاروں کو یہ فائدہ ملتا کہ درمیانی شخص اور بچولئے کے نہ رہنے کی وجہ سے ان کو پوری قیمت براہِ راست مل جاتی، شہر کے تاجروں کو یہ بات پسند نہ آتی تھی، وہ دیہات سے مال لانے والوں کو کہتے تھے کہ تو اپنا مال ہمارے حوالہ کردے، ہم کچھ دنوں ٹھہر کر اسے بہتر قیمت میں فروخت کردیں گے، مقصد یہ ہوتا تھا کہ قیمتوں کے فطری اتار کو روکا جائے، اس سے بھی آپ ﷺ نے منع فرمایا، جس کو حدیث میں ''بیع حاضر للبادی'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ان احکام سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام نے طلب و رسد میں توازن برقرار رکھنے اور قیمتوں میں غیر فطری اتار چڑھاؤ کو روکنے کی کیا کچھ تدبیریں کی ہیں، ذرائع مواصلات یا کسی خاص شعبہ کی تجارت کی ہڑتال سے سب سے بڑا نقصان یہی ہوتا ہے کہ اشیاء کی قیمتیں غیر متوازی ہوجاتی ہیں، جہاں سامان کی پیدائش ہوتی ہے وہاں کاشتکار اور صنعت کار کو اصل لاگت بھی حاصل نہیں ہوتی اور دوسرے مقام پر عوام کو وہی چیز اصل قیمت سے دوچند بلکہ کئی چند قیمتوں میں خرید کرنا پڑتا ہے۔ یہ بہت بڑا اجتماعی نقصان اور قومی خسارہ ہے۔

اس سے زیادہ نازک صورتِ حال اس وقت پیدا ہوجاتی ہے جب لازمی خدمات کے کسی شعبہ میں احتجاج ہوتا ہے، جیسے ڈاکٹروں کی ہڑتال، پوسٹ آفس کی ہڑتال وغیرہ۔ ان شعبوں سے انسان کی ناگزیر ضروریات متعلق ہیں، جن سے عوام کو محروم رکھنا نہایت ہی شقاوتِ قلبی اور ظلم کی بات ہے۔ اسلام میں انسان کی لازمی ضروریات کی بڑی اہمیت ہے، بلکہ خدا کی عبادت اور بندگی پر بھی اس کو ترجیح حاصل ہے۔ اگر کوئی شخص نماز کی حالت میں ہو اور اندیشہ ہو کہ اگر وہ نماز نہیں توڑے گا تو کوئی شخص جل یا ڈوب جائے گا یا گر جائے گا تو نماز کا توڑنا اور اس شخص کی مدد کرنا واجب ہے، کم و بیش یہی احکام مال اور عزت و آبرو کی حفاظت سے متعلق بھی ہیں، اس لئے از راہِ عام لوگوں کو لازمی خدمات سے محروم کردینا

قطعاً جائز نہیں۔

احتجاج کی جو روایت ہمارے سماج میں پڑ چکی ہے، اس میں دونوں پہلو تکلیف دہ ہیں، احتجاج کرنے والے اوّل تو ناروا مطالبات پر اصرار کرتے ہیں، دوسرے احتجاج کے لئے تکلیف دہ اور اجتماعی سطح پر مضرت رساں طریقہ کار اختیار کرتے ہیں، دوسری طرف حکومت کا رویہ بھی ناقابلِ فہم ہوتا ہے، آخر حکومت صلح کرتی ہے، ''لواور دو'' کی بنیاد پر معاملہ طے کرتی ہے، لیکن ''بعد از خرابیٔ بسیار!''۔ اس طرح خود حکومت بھی عوام کو نقصان اور تکلیف میں مبتلا رکھنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اسلام کا اصول یہ ہے کہ ضرر و نقصان بہر قیمت دفع کیا جائے: **الضرر یزال**، نیز اسلام کی نگاہ میں ایک شخص کے نقصان کے مقابلہ ایک جماعت اور ایک طبقہ کے نقصان کے مقابلہ پورے سماج کا نقصان زیادہ اہم اور زیادہ قابل لحاظ ہے۔ فقہاء لکھتے ہیں: ''**اذا تعارض مفسدتان روعی أعظمهما ضرر بارتکاب اخفهما**۔'' (الاشباہ:۴۴) احتجاج ایک جائز حق ہے، لیکن ضروری ہے کہ اس کے لئے کچھ حدود و قیود ہوں، وہ ایسا عفریت نہ بن جائے کہ غریب عوام کو نگل جائے اور قوم و ملک کو اجتماعی سطح پر ضرر پہنچنے کا باعث بن جائے۔

حفاظت خود اختیاری —— اسلامی نقطۂ نظر!

انسان کے پاس جو کچھ ہے، وہ اس کا مالک نہیں، امین ہے، جان ہو یا مال اور عزت وآبرو، یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں اور اسے ان کا نگہبان بنایا گیا ہے، اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ خدا کی ان نعمتوں کے ساتھ ہمارا کیا سلوک ہونا چاہئے؟ اس سلسلہ میں تین باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں: ایک یہ کہ ان نعمتوں کو احکام شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے حاصل کیا جائے، اور محض اپنی خواہش کو رہنما نہ بنالیا جائے، دوسرے ان نعمتوں کو ان کے صحیح مصرف میں خرچ کیا جائے، ایسی چیزوں میں خرچ کرنے سے بچا جائے جن کو شریعت نے ناپسند کیا ہے، تیسرے اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق ان کی حفاظت اور نگہداشت کی جائے۔

اسی لئے شریعت نے خودکشی کو بھی حرام قرار دیا، کیوں کہ انسان اپنی زندگی کا امین اور محافظ ہے، اس کا کام زندگی کی حفاظت ہے نہ کہ ہلاکت، رسول اللہ ﷺ نے اپنی ناراضگی کے اظہار کے لئے خودکشی کرنے والے شخص پر نماز جنازہ تک نہیں پڑھی، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ کی نگاہ میں یہ کس قدر مذموم اور ناپسندیدہ حرکت ہے، مالی نعمتوں کے بارے میں بھی اسی احتیاط اور قدر دانی کی تعلیم دی گئی، اگر کوئی شخص نہر کے کنارے بیٹھا ہو، تب بھی آپ نے وضو میں اسراف اور فضول خرچی کو منع فرمایا، کیوں کہ یہ تقاضۂ امانت کے خلاف ہے، اسلام امن وآشتی اور صلح وسلامتی کا نقیب ہے، لیکن اس امن کا جو سماج کے تمام افراد واشخاص اور طبقات کو عافیت فراہم کرتا ہو نہ یہ کہ ایک طبقہ کی بالادستی اور دوسرے کی مجبوری ولاچاری پر قائم ہو، اسی لئے اگر ایک شخص دوسرے شخص پر اور سماج کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ پر زیادتی کرے، تو اسے اپنی مدافعت کا پورا پورا حق حاصل ہے، کیوں کہ یہی عدل کا تقاضا ہے، اور حقیقی امن وہی ہے جس کی عمارت عدل و

انصاف کی مضبوط بنیادوں پر اٹھائی گئی ہو، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی تعلیمات بالکل واضح اور بے غبار ہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ تم سے بلاوجہ آمادۂ پیکار ہوں، تم بھی ان سے اسی طرح مقابلہ کرو، ہاں البتہ ایسے جذباتی مواقع پر بھی انتقام کی رو میں بہہ کر ظلم وزیادتی کا راستہ اختیار نہ کرو، کہ اللہ تعالیٰ بہر حال زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے، ''وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَایُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ''۔(البقرۃ:۱۹۰)

اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا کہ جو تم پر زیادتی کرے، تم بھی اسی کے بقدر اس کا جواب دو، فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ (البقرۃ:۱۹۴) یہ مدافعت، مقابلہ اور ظالم کے پنجۂ ظلم تھامنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ اسی میں امن کا بقاء اور انسانیت کا تحفظ ہے، قرآن مجید نے قتل کے معاملہ میں قصاص یعنی برابر کے بدلہ کا قانون مقرر کیا ہے (البقرۃ: ۱۷۸) اور اس کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ قاتل کو قتل کرنے میں ایک کے بعد دوسری جان کا ضیاع ہے، لیکن درحقیقت اس میں انسانی جانوں کی حفاظت اور قتل کے واقعات کا سدباب ہے۔''وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰاُولِی الْاَلْبَابِ'' (البقرۃ:۱۷۹)

اگر کسی سماج میں ظلم کے لئے آگے بڑھنے والے ہاتھ ہوں، لیکن ان کو قلم کر دینے والی تلواریں نہ ہوں، لباس حیاء کو تار تار کر دینے والی آنکھیں ہوں، لیکن انہیں پھوڑنے والی انگلیاں نہ ہوں، بربریت کا راستہ اختیار کرنے والے قدم ہوں، اور ان کے بڑھتے ہوئے قدم کو قید میں لانے والی زنجیریں نہ ہوں، تو وہ سماج ظلم و بربریت کی آماجگاہ بن جائے گا، اور عدل وانصاف کو وہاں سے ہمیشہ کے لئے رختِ سفر باندھنا ہوگا، اس لئے یہ بات ضروری ہے کہ سماج کے اچھے لوگ ایسے انسانیت دشمن عناصر کی سرکوبی کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، اور جو لوگ مشقِ ستم بنائے جاتے ہوں، وہ طاقت بھر اپنی مدافعت کے لئے تیار رہیں، کہ اس سے صرف ان کی شخصی حفاظت ہی متعلق نہیں، بلکہ انسانیت اور انصاف کا تحفظ متعلق ہے، اور اسلامی نقطۂ نظر سے یہ کوئی اختیاری عمل نہیں بلکہ ایسا کرنا اس پر شرعاً

واجب ہے،

اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے جان و مال، مذہب، اہل وعیال اور عزت و آبرو کی حفاظت میں مارے جانے والوں کو شہید قرار دیا، حضرت سعید بن زید سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

"من قتل دون ماله فهو شهيد ومن قتل دون دمه فهو شهيد، ومن قتل دون دينه فهو شهيد ومن قتل دون اهله فهو شهيد" (ترمذی ۱/۲۶۱، باب ماجاء من قتل دون ماله فهو شهيد)

جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو اپنی جان کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو اپنے دین کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، اور جو اپنے اہل وعیال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔

ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کا مال ناحق لینے کی کوشش کی جائے اور وہ اس کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے وہ بھی شہید ہے: **"من ارید ماله بغير حق فقاتل فقتل فهو شهيد"**

(ابوداؤد ۲/۶۵۸، ترمذی: ۱/۲۶۱)

جان کی حفاظت تو ظاہر ہے، مال کی حفاظت میں یقیناً دوکان، کاروبار، سواریوں، وغیرہ کی حفاظت شامل ہے، دین کی حفاظت میں مساجد و مدارس، خانقاہیں، مسلمانوں کے مقابر اور مسلمانوں کے مذہبی پیشوا سب شامل ہیں، کیوں کہ یہ سب شعائر دین کا درجہ رکھتے ہیں، اس لئے ان سب کی حفاظت مسلمانوں کا فریضہ ہے، اور اگر ان کی حفاظت و صیانت میں کسی مسلمان کی جان جاتی ہے تو یقیناً وہ شہید ہے، اہل وعیال کی حفاظت میں ان کے جان و مال کے ساتھ ساتھ ان کی عزت وآبرو کی حفاظت بھی شامل ہے، کیوں کہ عزت و آبرو کی اہمیت انسان کے حق میں اس کی جان اور زندگی سے کم نہیں، بلکہ ایک غیرت مند انسان کے لئے بعض اوقات جان کا دیدینا، عزت وآبرو کی پامالی کو قبول کرنے

سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔

تحمل و بردباری الگ چیز ہے، بزدلی اور خود سپردگی الگ چیز، کسی بھی قوم میں بزدلی کا پیدا ہو جانا، ایک ایسا مرض ہے جو اس کو میدان عمل میں تگ و دو سے روک دیتا ہے، شجاعت و بہادری، بلند حوصلگی، قوت ارادی کسی بھی زندہ قوم کے لئے ضروری وصف ہے، مسلمان مختلف آزمائشوں سے گزرتے ہیں، لیکن مؤرخین نے سب سے زیادہ ماتم تاتاری فتنہ کا کیا ہے، تاتاریوں کے حملہ نے مسلمانوں کو صرف پسپا ہی نہیں کیا، بلکہ ان کو کم ہمت اور پست حوصلہ کر کے بھی رکھ دیا تھا، اور نوبت یہ تھی کہ ایک ایک تاتاری عورت بیسیوں مسلمان مردوں کو کھڑا کر دیتی اور اپنے گھر سے ہتھیار لے کر آتی، پھر باری باری انہیں تہہ تیغ کرتی، اور یہ مسلمان نہایت بزدلی اور دون ہمتی کے ساتھ قتل ہوتے رہتے اور مدافعت کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔

اسی حق مدافعت کا نام '' حفاظت خود اختیاری '' ہے، جسے دنیا کے تمام مذہب اور جدید و قدیم نظامہائے قانون میں تسلیم کیا گیا ہے، جس کا مقصد ظلم کو روکنا اور امن کو پائیدار بنانا ہے، نہ کہ امن کو پارہ پارہ کرنا اور دوسروں پر ظلم و جور کو روا رکھنا، حفاظت خود اختیاری کا مطلب یہ نہیں کہ اگر کسی قوم کے کچھ لوگوں نے ہمارے ساتھ زیادتی کی ہو تو ہم قصوروار و بے قصور اور مجرم و بے گناہ میں فرق کئے بغیر اس قوم کے لوگوں پر ہلہ بول دیں، اور قتل و غارت گری مچائیں، اسلام اس کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ اگر کچھ لوگوں نے اپنی خباثت کا مظاہرہ کرتے ہوئے عورتوں کو بے آبرو کیا ہو تو مسلمان بھی ایسے ہی ناشائستہ اور غیر شریفانہ حرکت پر اتر آئیں، یہ وہی '' اعتداء '' یعنی حد سے گزر جانا ہے، جس کو قرآن مجید نے منع کیا ہے، لیکن جو لوگ واقعی مجرم اور قصوروار ہوں، ان سے اپنی حفاظت اور ان کے خلاف مناسب ردعمل ایک مذہبی اور انسانی فریضہ ہے، جس سے پہلوتہی کسی طور مناسب نہیں۔

حفاظت خود اختیاری کے مختلف ذرائع ہیں، اول خود اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کرنا کہ ناگہانی حملوں کا مقابلہ کر سکیں، اور قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی حفاظت کے

اسباب مہیا رکھنا ، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ایسے کھیلوں کی حوصلہ افزائی فرمائی جن سے جسم میں توانائی پیدا ہو، چنانچہ آپ نے کشتی ، دوڑ، گھوڑ سواری وغیرہ کو پسند کیا اور اس کی حوصلہ افزائی فرمائی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ طاقتور مؤمن کمزور مومن سے بہتر ہے، المومن القوی خیر من المومن الضعیف ۔ رسول اللہ ﷺ اسباب حفاظت کا اس قدر اہتمام فرماتے تھے کہ استنجاء کے لئے تشریف لے جاتے تب بھی نیزہ ساتھ ہوتا، تاکہ کیڑے ، مکوڑوں سے حفاظت ہو سکے، یہ رجحان کہ گھر میں سانپ مارنے اور کتوں کو بھگانے کے لئے لاٹھی تک میسر نہ ہو نہایت ہی غیر دانشمندانہ بات ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ جو کچھ ہو قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہو۔

حفاظت خود اختیاری میں یہ بات بھی داخل ہے کہ مسلمان اپنے محلّہ میں اجتماعی مدافعت اور حفاظت کا ماحول بنائیں ، یعنی اگر ایک بے قصور شخص پر حملہ ہو ، یا محلّہ کے کسی مکان پر یلغار ہو جائے تو تمام لوگ جان پر کھیل کر اس کی حفاظت کریں ، ہر شخص اس کو اپنے آپ پر حملہ تصور کرے اور مقابلہ کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہو، یہ بات کہ ہر آدمی اپنی باری کا انتظار کرے اور یکے بعد دیگرے خود سپردگی اختیار کرتا جائے ، غیر دانشمندانہ، خود غرضی اور ہلاکت خیز بزدلی بلکہ خودکشی ہے، اجتماعی قوت مؤثر بھی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد بھی شریک حال رہتی ہے، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جماعت کے ساتھ اللہ کی مدد ہے، ید اللہ علی الجماعة، البتہ یہ ضروری ہے کہ ایسی اجتماعیت کی قیادت صالح ، سنجیدہ اور دور اندیش لوگوں کے ہاتھوں ہو، نہ کہ شرپسند، بدمعاش اور مشتعل مزاج لوگوں کے ہاتھ میں، کہ ایسی صورت میں فائدہ سے زیادہ نقصان کا اندیشہ ہے۔

حفاظت کا تعلق آبادیوں کی ہیئت سے بھی ہے، جہاں فرقہ وارانہ تناؤ کا ماحول ہو، اور مفسد مزاج لوگ امن کو درہم برہم کرنے کے در پے رہتے ہوں، وہاں خاص کر مسلمانوں کو اپنے ہم مذہب لوگوں کے درمیان آباد ہونا اور مسلم آبادی کے جزیرے بنانا ضروری ہے، اس سے وہ اپنی جان و مال، کاروبار اور عزت و آبرو ہی کی حفاظت نہیں بلکہ اپنے عقیدہ و ایمان اور تہذیب و ثقافت کی بھی حفاظت کر سکیں گے، اسی لئے حضرات

انبیاء کو ایسے شہروں سے ہجرت کرنے کا حکم دیا جاتا تھا، جہاں دین حق سے عداوت وعناد رکھنے، والوں کا غلبہ ہو اور اہل ایمان کو اپنی بستی بسانے کی تلقین کی جاتی تھی، رسول اللہ ﷺ نے متعدد مواقع پر اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ جو مشرکین کے ساتھ اپنا رہن سہن رکھے میں اس سے بری ہوں۔

حفاظت کا تعلق قانون و آئین سے بھی ہے، یہ بدقسمتی ہے کہ قانونی پیشہ اختیار کرنے کا رجحان مسلمانوں میں کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے اندر قانون ملکی کا شعور پیدا کریں، کون سے جرم پر کون سی دفعہ عائد ہوتی ہے؟ کس دفعہ کے تحت اپنا مقدمہ درج کرایا جائے؟ پولیس میں فرقہ پرست عناصر دھوکہ دینے اور مقدمہ کو کمزور کرنے کے لئے کیا انداز اختیار کرتے ہیں، اور شہادتوں کو کس طرح کمزور کرتے ہیں؟ مسلمانوں کو اس سے آگاہ ہونا چاہئے، یہ ناآگہی مجرموں کی جرأت بڑھاتی، اور مظلوموں کی بیکسی میں اضافہ کرتی ہے۔

حفاظت کا تعلق قیادت سے بھی ہے، اس بدبختی پر جس قدر رویا جائے کم ہے کہ مسلمان نہایت تکلیف دہ حالات سے گزرنے کے باوجود اپنے مشترک مسائل کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا نہیں جانتے، اشتراک اور اجتماعیت سے قیادتیں بنتی اور ابھرتی ہیں، اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قیادت سے اجتماعیت پیدا ہوتی ہے اور اطاعت وفرمانبرداری سے قیادت طاقتور ہوتی ہے: ''لا جماعة الا بامارة و لا امارة الا بطاعة'' جب آپ کا ایک یا ایک سے زیادہ لیڈر ہو، یا کوئی مشترکہ پلیٹ فارم ہو اور اس کے ساتھ پوری قوم کا اعتماد اور تائید وتقویت ہو تو اس سے اس قیادت کا وزن حکومت میں اور دوسری قوموں میں بھی محسوس کیا جاتا ہے، اس کی بات سنی جاتی ہے، اس کی رائے کو وزن دیا جاتا ہے، اور اس کی آواز کی قوت محسوس کی جاتی ہے، گجرات کے فساد نے خاص طور پر اس حقیقت کو واضح کیا کہ وہاں مسلمان قیادت کے فقدان کی وجہ سے فرقہ پرست حکومت اور پولیس نے اپنے آپ کو پوری طرح آزاد سمجھا اور اس نے جوابدہی کے تصور سے خالی اور بے پردہ ہو کر مظالم ڈھائے، اگر ذرائع ابلاغ نے ان کے ان مظالم کو آشکارانہ کیا ہوتا تو

پتہ نہیں اور کیا حال ہوتا۔

حفاظت خود اختیاری میں یہ ساری باتیں شامل ہیں، جسمانی طور پر بھی حفاظت، قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی حفاظت و بچاؤ کے اسباب کا مہیا رکھنا، مسلمانوں کا اپنی آبادیاں اور بستیاں بسانا، کسی حادثہ کے موقع پر اجتماعی طور پر حفاظت کے لئے ذہن کو تیار رکھنا، مسلمانوں میں جرم و سزا کے قانون کا شعور پیدا کرنا اور ایک مؤثر اور اجتماعی قیادت کو کم سے کم مقامی سطح پر وجود میں لانا اور اسے تقویت پہونچانا۔ یہ سب دین و ایمان، جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے ضروری تدابیر ہیں اور امکان بھر حفاظت کی تدابیر اختیار کرنا اور اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق مدافعت، دشمن کا مقابلہ اور ظلم سے پنجہ آزمائی صرف مصلحت کا تقاضا نہیں بلکہ ایک مذہبی اور انسانی فریضہ ہے۔

(۲۴ر مئی ۲۰۰۲ء)

مرض اور مریض ـــــ اسلامی تصوّر

ابھی گذشتہ ہفتہ ہم نے عالمی یومِ صحت منایا ہے، بے شک صحت سے بڑھ کر اللہ کی کوئی نعمت نہیں اور بیماری سے بڑھ کر شاید کوئی آزمائش نہیں، آخرت کی جوابدہی کے احساس اور انسانی محبت کے سوا کوئی چیز نہیں جو ایک مشغول آدمی کو مایوس، زود رنج اور ناہموار مزاج مریض کی عیادت و تیمارداری پر آمادہ کر سکے۔ اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں۔ ان میں آپ ﷺ نے مریض کی عیادت کا بھی ذکر فرمایا۔ ارشاد فرمایا کہ جب تک انسان کسی مریض کی عیادت میں مصروف رہتا ہے، گویا وہ جنت کے باغیچوں میں رہتا ہے۔ ایک موقع پر فرمایا کہ اللہ قیامت کے دن انسان سے دریافت فرمائیں گے کہ اے فرزندِ آدم! میں بیمار تھا اور تم نے میری عیادت نہیں کی۔ انسان کہے گا کہ باری تعالیٰ! کیا آپ بھی بیمار اور عیادت کے محتاج ہوتے ہیں؟ ارشادِ ربانی ہوگا کہ اگر تم فلاں مریض کے پاس پہونچتے اور اس کی عیادت کرتے تو مجھے وہاں موجود پاتے۔

آپ ﷺ نے عیادت کو ایک انسانی فریضہ قرار دیا ہے، اس لئے اس میں مسلمان اور غیر مسلم، بڑے چھوٹے، مال دار اور غریب کا کوئی فرق نہیں، آپ ﷺ نے یہودی کی بھی عیادت کی ہے اور مشرک کی بھی عیادت فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ اگر کسی علاقہ میں وبائی مرض پھوٹ پڑے تو وہاں سے لوگ بھاگ کھڑے ہوں۔ کہ ایک تو بھاگنے والوں کے ذریعہ مرض کے جراثیم دوسرے علاقوں تک بھی پھیل جائیں گے۔ دوسرے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ جو لوگ مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں ان کے لئے تیماردار اور دیکھ ریکھ کرنے والے نہیں رہیں گے۔ قرآن مجید نے بیماروں کے لئے خصوصی مراعات دی ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے "ولا علی المریض حرج" (النور) ایک موقع پر قرآن

نے خاص طور پر ''نابینا'' اور ''لنگڑے'' کا ذکر کیا کہ ان پر کوئی حرج نہیں۔ **لیس علی الاعمی حرج ولا علی الاعرج حرج** (الفتح: ۱۷)۔

بعض مذاہب میں بیماری کو پاپ کا لازمی نتیجہ سمجھا جاتا تھا۔ ہندو بھائیوں کے یہاں آواگون کا نظریہ ہے، اس نظریہ کے تحت انسان اس جنم میں جو کچھ تکلیف اٹھاتا ہے وہ پچھلے جنم کے گناہوں کا اثر ہے، اس سے مریض کے تئیں ہمدردی، محبت و خیر خواہی اور رحم دلی کے بجائے نفرت کا جذبہ ابھرتا ہے، اسلام نے بتایا کہ بیماری اللہ کی طرف سے آزمائش اور امتحان ہے، ضروری نہیں کہ گنہگار ہی بیمار پڑے، اللہ کے نیک بندے بھی بیمار ہوتے ہیں، یہاں تک کہ بیماری سے انبیاء و رُسل بھی دوچار ہوتے ہیں، بلکہ بعض دفعہ صالحین اور اللہ کے نیک بندوں کی آزمائش زیادہ ہوتی ہے۔

آپ ﷺ نے انسانی زندگی کے امانت خداوندی ہونے کا تصور پیش کیا۔ اسی لئے آپ ﷺ نے خودکشی کو حرام اور سخت گناہ قرار دیا۔ آج تو عدالتیں بھی خودکشی کی اجازت دینے کو آمادہ ہیں، لیکن اسلامی ہی نہیں، اخلاقی اور انسانی نقطۂ نظر سے بھی یہ ایک سانحہ کا درجہ رکھتا ہے۔ اسلام نے اس وقت سے انسان کا تحفظ کیا ہے جب کہ وہ ابھی عالم رنگ و بو میں آیا بھی نہ ہو۔ اسی لئے اس نے معاشی مقصد کے تحت اسقاطِ حمل کو منع کیا۔ آپ ﷺ نے انسانی آبادی کی افزائش کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ معاشی اندیشوں کے تحت آبادی کی روک تھام کا تصور کچھ نیا نہیں ہے۔ اسلام سے پہلے بھی عربوں کے یہاں ایسا تصور موجود تھا، قرآن مجید نے اس کی مذمت کی اور فرمایا گیا کہ بھوک اور فاقہ کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، **لَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ** (بنی اسرائیل: ۳۱) فیملی پلاننگ کے پیچھے جو بنیادی نظریہ کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ غذائی وسائل محدود ہیں، اگر انسانی آبادی غیر محدود طور پر بڑھتی چلی جائے تو انسان کے لئے بنیادی ضروریات کی فراہمی بھی ممکن نہیں رہے گی، لیکن یہ محض اندیشہ ہائے دور دراز کا درجہ رکھتا ہے اور حالات نے اس کی غلطی کو اظہر من الشمس کر دیا ہے، فیملی پلاننگ کے نظریہ کے بانی مالتھوس کی پیشین گوئی کے مطابق آج لوگوں کو بھوکوں مرنا چاہئے تھا، لیکن ہر شخص سر کی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ کھانے،

پینے ،لباس و پوشاک ،سفر کے وسائل اور رہن سہن کے اعتبار سے معیار زندگی میں ایسا اضافہ ہوا کہ آج سے ۲۵ رسال پہلے اس کا تصور بھی دشوار تھا ،حقیقت یہ ہے کہ جوں جوں آبادی بڑھتی جاتی ہے،اسی نسبت سے وسائلِ معاش میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہےاور زمین ایسے ایسے وسائل ثروت کواگل رہی ہے کہ نصف صدی پہلے کسی نے اس بارے میں سوچا بھی نہ ہوگا۔

آج قتل انسانی کے لئے بھی لوگوں نے نئے نئے عنوان تلاش کئے ہیں اور خوبصورت ناموں کے ذریعہ ان کو جائز کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔۔اس قسم کی ایک نا روا صورت وہ ہے جس کو ''قتل بہ جذبۂ رحم'' کا عنوان دیا گیا ہے۔یعنی جو شخص طویل عرصہ سے بیمار ہو یا تکلیف دہ مرض میں مبتلا ہو، اس کو ادویہ کے ذریعہ موت کی نیند سلا دیا جائے ، اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔کوئی مرض نہیں کہ خدا نے اسکے علاج کی تدبیریں پیدا نہ کی ہوں، معالج کا کام ان تدبیروں کو تلاش کرنا ہے نہ کہ مریض کی زندگی کو بچانے کے بجائے اسکے لئے سامان ہلاکت کا فراہم کرنا،آپ ﷺ نے خودکشی کو بہر حال حرام قرار دیا۔ ان تعلیمات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں انسانی زندگی کی کیا حرمت اور اہمیت ہے؟۔

انسانی صحت وحیات کی حفاظت کے نقطۂ نظر سے آپ ﷺ نے اطباء اور معالجین کے لئے بھی ضابطے مقرر فرمائے۔ جو لوگ فنِ طب سے کما حقہ واقف نہ ہوں، علاج ومعالجہ کی مہارت نہ رکھتے ہوں اور کسی مریض کا علاج کرنے میں ان کو نقصان پہنچا دیں تو آپ ﷺ نے ان کو اس نقصان کا ذمہ دار اور ضامن قرار دیا ہے۔'' **من تطبب و لم يعلم منه طب فهو ضامن** ''۔

علاج اور صحت انسانی کے مسئلہ کو آپ ﷺ نے ایسی اہمیت دی کہ از راہِ علاج ان چیزوں کے استعمال کی بھی اجازت دی جو عام حالات میں جائز نہیں ہیں،لیکن یہ اجازت اس وقت ہے کہ حلال چیز کی صورت میں اس کا کوئی متبادل نہ مل سکے۔

مریض کے لئے ایک اہم مسئلہ راز کی حفاظت کا ہے بعض دفعہ انسان ایسے مرض

میں مبتلا ہوتا ہے کہ وہ اس کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا ، آپ ﷺ نے غیبت کے سلسلہ میں جو اصول بتائے ہیں وہ اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں ۔ غیبت انسان کے جسمانی ، فکری یا اخلاقی و عملی عیب کو دوسروں پر ظاہر کرنے کا نام ہے ، یہ حرام و گناہ ہے ، آپ ﷺ نے اس سے شدت کے ساتھ منع فرمایا ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ معالجین کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے مریضوں کے ساتھ ایسے امراض کے معاملہ میں امانت کا ثبوت دیں اور پردہ پوشی سے کام لیں ۔ جس کو وہ ظاہر کرنا نہ چاہتا ہو ۔ البتہ اگر کسی شخص کو نقصان اور دھوکہ سے بچانا اس کے بغیر ممکن نہ ہو تو اس شخص کی حد تک مرض کا افشاء جائز ہے ، خود آپ ﷺ سے ایسے شخص کے سامنے عیب کا اظہار ثابت ہے جو اس سے رشتہ کرنا چاہتا ہو ۔ یہی اسلام کا توازن واعتدال اور اس کا اصل امتیاز ہے ۔

(۱۶/اپریل ۱۹۹۹ء)

ایڈز —— حقیقی حل کیا ہے؟

کل ۲ر دسمبر کی تاریخ تھی، اس تاریخ کو بین الاقوامی سطح پر ایڈز کے دن کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، ایڈز ایک ایسی بیماری کی حیثیت سے ہمارے سماج میں معروف ہے کہ جس سے لوگ شاید درندہ جانور سے بھی زیادہ خوف کھاتے ہوں، کہا جاتا ہے کہ اس کے جراثیم کا ادراک پہلی بار ۱۹۸۳ء میں فرانس میں ہوا، ابتداءً یہ مرض ان لوگوں میں پایا گیا جو ہم جنسی جیسی بدترین برائی میں مبتلا تھے، اس مرض کی شناخت میں کچھ وقت لگتا ہے، اس لئے مرض کی دریافت کا مسئلہ بھی بہت اہم ہوتا ہے، ہندوستان میں پہلی دفعہ اس کا مریض ۱۹۸۶ء مدراس میں دریافت ہوا، یہ مرض ایک ہولناک سیلاب کی طرح بڑھتا جارہا ہے، دسمبر ۱۹۸۲ء میں عالمی تنظیم صحت کا اندازہ تھا کہ ایک کروڑ تیس لاکھ افراد اور دس لاکھ بچے ایڈز کے جراثیم کے حامل ہیں، روزانہ پانچ ہزار نئے انفیکشن زدہ افراد وجود میں آتے ہیں اور ہر اٹھارہ سکنڈ میں ایک نیا فرد انفیکشن سے متاثر ہوتا ہے۔

۱۹۹۲ء کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں سرکاری حاصل شدہ رپورٹ میں گیارہ ہزار افراد اس مرض سے متاثر تھے، لیکن غیر سرکاری اطلاعات کے بموجب غیر دریافت شدہ افراد کو لے کر ان کی تعداد گیارہ لاکھ سے کم نہ تھی، ہندوستان میں مہاراشٹر، دہلی اور تمل ناڈ میں متاثرین کا اوسط سب سے زیادہ ہے، سروے اور اعداد و شمار کے ذریعہ یہ بھی متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طبقہ میں اسکا کیا اثر ہے؟ چنانچہ اس مرض کے جراثیم ۱۵ر فیصد طوائف میں، ۵ تا ۷ فیصد ان سے اختلاط رکھنے والوں میں، ۲۰ر فیصد ہم جنسی سے ملوث مردوں میں اور ۵۰ر فیصد ڈرگ استعمال کرنے والے مردوں میں، اور دوسرے طبقوں میں اس سے کم پائے گئے ہیں، بنیادی طور پر ۴۱ر فیصد سے زیادہ غیر قانونی

اور غیر فطری جنسی تعلقات اس کا سبب بنا ہے۔اور ۱۵ ؍فیصد سے زیادہ خون کی منتقلی نے اس مرض کو جنم دیا ہے، یہ بھی گویا بالواسطہ اصل مریضوں ہی سے متعدی ہو کر مرض پھیلنے کی صورت ہے، یہ ایک ایسی خطرناک صورت حال ہے جو یقیناً کسی سمندری طوفان سے کم گھبرا دینے والا نہیں، ہر چند کہ ابتداء اس مرض کا غلبہ مغربی ممالک میں تھا، لیکن اب مشرقی ممالک میں بھی اس عفریت نے اپنی جگہ بنالی ہے، بالخصوص مہاراشٹر اور تمل ناڈو میں جسم فروشی اور منی پور، میزورم اور ناگالینڈ میں انٹروینس ڈرگ کی وجہ سے یہ بیماری نہایت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

مشکل یہ ہے کہ اس مرض کی پیدائش تو غیر اخلاقی رویہ کی وجہ سے ہوتی ہے، لیکن آگے یہ مرض مختلف اسباب کے تحت متعدی اور منتقل ہوتا رہتا ہے، خون کی منتقلی سے، اعضاء کی پیوند کاری سے، اس مریض کے جسم میں لگائی گئی سوئی کے استعمال سے، بعض اوقات استرے اور بلیڈ سے، مادہ منویہ کی مصنوعی تخم کاری سے، شوہر و بیوی کو ایک دوسرے سے، مریضۂ ایڈز کے بچہ میں موروثی طور پر، یہاں تک کہ اگر موت کے بعد لاش کو مردہ خانہ میں رکھا جائے تو لاش میں بھی ایک ہفتہ تک یہ جراثیم موجود ہوتے ہیں، اسی لئے ایڈز سے مرنے والوں کو پلوتھنگ کی دو چادروں کے درمیان اس طرح لپیٹنے کی ہدایت دی جاتی ہے کہ دونوں کے درمیان کورائیڈ اور چونے کا پاوڈر رہو۔

ایڈز نے اسلامی نقطۂ نظر سے بہت سے فقہی سوالات کو بھی ابھارا ہے، مثلاً یہ کہ جو شخص ایڈز کا مریض ہو، اس کا طرز عمل کیا ہونا چاہئے؟ وہ اپنے متعلقین کو اس سے مطلع کر دے اور انتقال مرض کے اسباب سے بچے اور بچائے، یا عام آدمی کی طرح زندگی بسر کرے؟ ایڈز کے مریض کے بارے میں معالج کا فریضہ کیا ہے؟ مریض کے راز کی حفاظت معالج کا فریضۂ منصبی ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اس مریض کے راز کو چھپائے رکھے، دوسری طرف اگر اس میں پردہ داری کی جائے تو بہت سے لوگوں کو اور سماج کو اس سے نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے اور اجتماعی نقصان انفرادی نقصان سے بہر حال اہم ہے، پھر ایسے مریضوں کے بارے میں خود سماج کی کیا ذمہ داری ہے؟ تیمارداری، دیکھ

رکھے، مذہبی اور عوامی تقریبات میں ایسے مریضوں کی شرکت کا کیا حکم ہوگا؟ کیا یہ بات مناسب نہیں ہوگی کہ ایسے لوگوں کے لئے مخصوص ہاسٹل بنا دیئے جائیں، جیسا کہ بعض فقہاء نے کوڑھ کے مریضوں کے لئے ہاسٹل کا مشورہ دیا ہے (فتح الباری: ۱۰/۱۴۳) اگر ایڈز کا مریض قصداً کسی اور کو بیماری منتقل کرے تو کیا اس پر تاوان واجب ہوگا؟ شوہر کو ایڈز ہو تو کیا بیوی فسخ نکاح کا مطالبہ کر سکتی ہے؟ ایڈز زدہ عورت کا حمل ساقط کرانا درست ہے یا نہیں؟ جو بچے اس مرض میں مبتلا ہوں، ان کی تعلیم وتربیت کیوں کر انجام پائے اور کیا ایڈز کے احکام وہی ہیں جو مرض وفات کے ہیں؟ یہ نہایت اہم فقہی سوالات ہیں جو اسلامی نقطۂ نظر سے قابل توجہ ہیں، راقم الحروف نے اپنی کتاب ''اسلام اور جدید میڈیکل مسائل'' (مطبوعہ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند) میں ان سوالات پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

لیکن یہ سوالات ان لوگوں سے متعلق ہیں جو خدانخواستہ اس مرض میں مبتلا ہو چکے ہوں، جو لوگ محفوظ ہوں، ان کے لئے ایک ہی حکم ہے اور وہ ہے احتیاطی تدابیر کا اختیار کرنا، کیوں کہ جسم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، اور اس کے امانت ہونے کا تقاضا ہے کہ ایسے اسباب وعوامل سے بچا جائے جو جسم کو نقصان پہونچائیں یا اس کی ہلاکت و بربادی کا باعث بنیں، سب سے پہلی احتیاط تو ظاہر ہے کہ بے حیائی سے باز رہنا ہے، اسلام میں جس قدر سخت سزا ''زنا'' کی رکھی گئی ہے، ارتداد کی بھی نہیں رکھی گئی، یعنی شادی شدہ زانی کی سزا یہ ہے کہ اسے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے۔ اور غیر شادی شدہ کو سو کوڑے لگائے جائیں، دوسری سزا کا ذکر قرآن میں ہے (النور: ۲) اور پہلی سزا بکثرت احادیث میں مذکور ہیں، اور خلافتِ راشدہ سے آخری اسلامی عہد حکومت تک اس کا تعامل رہا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زنا سے بچو کہ اس سے چار باتیں ہوتی ہیں، چہرے سے رونق کا ختم ہو جانا، رزق کی تنگی، اللہ کی ناراضگی اور جہنم کی ہیشگی۔ (مجمع الزوائد عن ابن عباس: ۶/ ۲۵۵) یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ بشمول ایڈز کے زنا کی وجہ سے جو امراض پیدا ہوتے ہیں، وہ چہرہ اور جسم کو بدہیئت بنا دیتے ہیں، جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

حدیثوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض گناہ ایسے ہیں جو دنیا میں بھی

عذاب خداوندی کا باعث بنتے ہیں، ان میں ایک زنا بھی ہے، بعض روایتوں میں یہ بات آئی ہے کہ جب زنا کی کثرت ہوگی، تو ایسی بیماریاں پیدا ہوں گی کہ جن کے بارے انسان نے کبھی سنا بھی نہ تھا، یقیناً آتشک، سوزاک، ایڈز وغیرہ اس کی کھلی ہوئی مثال ہے، اور حضور ﷺ نے اس کو بھی علامات قیامت میں سے شمار فرمایا ہے کہ سود، زنا اور شراب نوشی کی کثرت ہو جائے (طبرانی عن ابن مسعود) اسی طرح فعل خلاف فطرت جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور قانونِ فطرت سے بغاوت ہے وہیں صحت انسانی کے لئے بھی مہلک و جان لیوا ہے، اور اطباء اس بات پر متفق ہیں، خدا کی نگاہ میں یہ فعل کتنا شنیع اور یہ برائی کتنی سنگین اور بدترین ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر خاص اسی کی وجہ سے عذاب خداوندی نازل ہوا، اور پوری قوم کی بساط لپیٹ کر رکھ دی گئی۔

قانون قدرت اور قانون شریعت کی مطابقت پر بھی غور کیجئے کہ شریعت نے زنا کی ایسی سزا رکھی ہے جس کی اذیت پورے جسم سے متعلق ہے، چاہے کوڑے مارنے کی سزا ہو یا سنگسار کرنے کی، اور زنا کی وجہ سے جو بیماریاں پیدا ہوتی ہیں وہ بھی انسان کے پورے وجود پر اثر انداز ہوتی ہیں، ایڈز اس کی کھلی ہوئی مثال ہے، جو پورے جسم کی قوت مدافعت کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ اور چہرے کی بے رونقی سے لے کر جسم کا ایک ایک انگ اس سے متاثر ہوتا ہے، یہ گویا قدرت کی طرف سے بدکاروں کی سرزنش کا ایک الٰہی نظام ہے۔ انسان اللہ کی مقرر کی ہوئی سزاؤں کو نافذ کرنا جب چھوڑ دیتا ہے تو قدرت سرزنش کے نظام کو خود اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔

اس مرض کے منتقل ہونے کے جو دوسرے اسباب ہیں یعنی خون کی منتقلی وغیرہ شرعاً اس سے بھی احتیاط واجب ہے، کیوں کہ یہ بے احتیاطی انسان کی ہلاکت کا موجب ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ انسان اپنے آپ کو ہلاک کر لے، ارشاد ربانی ہے: **لا تقتلوا انفسکم۔** (النساء:۲۹)

حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ جہاں طبی تدابیر اختیار کرے، وہیں اس راستہ کو بند کرنے کی کوشش کرے جہاں سے بیماری در آ رہی ہے، وہ اس اخلاقی بحران پر قابو پائے

جس کی سوغات مغرب نے ہمیں دی ہے، یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف ہمارے ملک میں (اور کم و بیش یہی حال پوری دنیا میں ہے) ایڈز کو روکنے کی مہم چلائی جارہی ہے، لیکن دوسری طرف ایڈز کے محرکات اور اصل اسباب کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں ہے، زنا کے لائسنس جاری کئے جاتے ہیں، بدکاری کو ''محبت'' کا نام دیا جاتا ہے، اختلاط کی ممانعت کو دقیانوسیت کہا جاتا ہے، بعض ملکوں میں ہم جنسی بلکہ ہم جنس شادی کو قانونی جواز عطا کر دیا گیا ہے، اخبارات میں اشتہار اس بات کے نہیں آتے کہ لوگ غیر قانونی جنسی اتصال سے بچیں، بلکہ ترغیب دی جاتی ہے کہ محفوظ طریقے اختیار کئے جائیں، منشیات کا بازار گرم ہے، اس پر نہ کوئی رکاوٹ ہے اور نہ اس کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے ___ یہ نہایت ہی شرمناک صورت حال ہے، اور بے حسی کی آخری حد ہے کہ خدا کا خوف تو گناہوں سے باز رکھنے میں مؤثر تھا ہی نہیں لیکن اب خدا کی کھلی ہوئی تنبیہ اور آنکھوں دیکھی مضرت و ہلاکت بھی آنکھیں کھولنے سے قاصر رہ جائے، اور اب بھی انسان گناہ کے دلدل سے باہر نہ آئے بلکہ گناہ سے بچنے کے بجائے گناہ کے محفوظ طریقے تلاش کرے۔

(۳ر دسمبر ۱۹۹۹ء)

حق آزادی اور اس کی حدیں

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں تین طرح کی مخلوقات پیدا کی ہیں، جمادات، نباتات اور حیوانات، جمادات سے مراد ایسی چیزیں ہیں جن میں نمو اور حرکت کی صلاحیت نہیں ہوتی جیسے پتھر، زمین، لوہا، نباتات سے مراد پودے ہیں جن میں بڑھوتری اور افزائش تو ہوتی ہے، لیکن وہ نقل وحرکت کی صلاحیت سے محروم اور بظاہر احساس وشعور سے عاری ہیں، حیوانات سے مراد جاندار مخلوق ہیں جن میں شعور واحساس ہے، کسی میں کم اور کسی میں زیادہ ادراک کی صلاحیت اور نقل وحرکت کی قوت ہے، — جمادات اور نباتات دراصل اسی تیسری مخلوق کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، پتھر جہاں نصب کردئے جائیں، نصب رہتے ہیں، لوہے کو آپ جس سانچے میں چاہیں ڈھال لیں، لکڑی کو آپ جس مقصد کے لئے چاہیں استعمال کریں، درخت آپ جہاں چاہیں لگادیں، انہیں کوئی انکار نہیں، اور نہ ان کی طرف سے کوئی احتجاج سامنے آئے گا، گویا یہ جاندار مخلوقات کے لئے قدرت ہی کی طرف سے خادم اور اپنی اعلیٰ تر مخلوق کے غلام ہیں، اس غلامی پر انہیں کوئی اعتراض نہیں۔

لیکن جو جاندار مخلوقات ہیں، ان کا معاملہ ان سے مختلف ہے، شیر اور ہاتھی سے لے کر چیونٹی اور مکھی تک اگر آپ کسی کو بھی اپنی قید میں لانا چاہیں تو وہ ضرور احتجاج کریں گے، انکار کا رویہ اختیار کریں گے، اپنی طاقت وصلاحیت کے مطابق وار کرنے یا راہِ فرار اختیار کرنے سے نہیں چوکیں گے، اور کسی طور آپ کی گرفت میں آنا پسند نہیں کریں گے، گویا فطری طور پر ان کو غلامی سے انکار ہے، اور یہ آزادی کے طلبگار ہیں، جاندار مخلوقات میں سب سے عظیم ترین مخلوق انسان ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ نے عقل وشعور اور فہم وادراک کی ایسی صلاحیت ودیعت کی ہے کہ کسی اور جاندار مخلوق کو شاید اس کا سوواں حصہ بھی حاصل نہ ہو،

اس لئے انسان میں آزاد رہنے کا جذبہ زیادہ ہے، اور اس کی فطرت غلامی سے اباء کرتی ہے، انسان کے نومولود شیر خوار بچہ کو بھی اس کے مزاج اور طبیعت کے خلاف کوئی بات پیش آجائے، تو اس کی طرف سے ضرور ہی احتجاج اور ردعمل کا اظہار ہوتا ہے، وہ روتا ہے، اور بے تحاشہ آنسو بہا کر اپنی ناگواری کا اظہار کرتا ہے، یہ اسی صدائے آزادی کی بازگشت ہے، جو انسانی فطرت میں رکھی گئی ہے، جس کی وجہ سے انسان پتھر اور لکڑی کی طرح ہر عمل پر خاموش اور ردعمل سے عاری نہیں رہ سکتا، اور مزاج و مذاق کے خلاف پیش آنے والی بات پر ناگواری کے اظہار کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے، اور یہ اس کے بے چین دل کے لئے کسی قدر سکون وطمانیت کا باعث بنتا ہے۔

اسلام دینِ فطرت ہے، اور وہ سلیم فطرت کے تقاضوں کو پورا کرنے آیا ہے، نہ کہ اس کو دبانے اور اس کا گلا گھونٹنے، اسلام کا پورا نظامِ حیات اسی بنیادی تصور پر مبنی ہے، اس میں کہیں قانونِ فطرت سے تصادم اور ٹکراؤ نہیں، اس نے انسان کے آزاد رہنے کے اس فطری حق کو تسلیم کیا ہے، اس کی بہترین ترجمانی ان کلمات سے ہوتی ہے جو عالم اسلام کے سفیر صحابیِ رسول ﷺ نے رستمِ ایران کے دربار میں کہے تھے اور ان پر اپنا مقصد ومنشاء واضح کیا تھا کہ ہم اس لئے آئے ہیں کہ اللہ کے بندوں کو انسان کی بندگی اور غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کریں، **اللہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة العباد الی عبادة اللہ**۔ (البدایہ والنہایہ: ۷/۳۹)

انسان کے اسی فطری حق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک گورنر کو فرمایا کہ ان کو ان کی ماؤں نے تو آزاد جنا تھا، تم نے ان کو کب سے غلام بنالیا ہے، یہ آزادی کے اسی فطری حق کا اعلان واظہار ہے جو اسلام کی بنیادی تعلیمات کا ایک حصہ ہے، اس لئے آزادی ایک انسانی اور اسلامی حق ہے۔

آزادی کے تصور کو طاقت پہونچانے کی غرض سے اسلام نے سب سے پہلے انسانی مساوات کا تصور دیا، کہ تمام انسان ایک ہی آدم کی اولاد ہیں، محض رنگ ونسل، خاندان ونسب اور علاقہ ووطن کی بنیاد پر ان میں ایک دوسرے سے بڑا نہیں، بہتری اور

کہتری انسان کے عمل اور کردار سے متعلق ہے، ان اکرمکم عند اللہ اتقکم (الحجرات:۱۳)— یہ وہ بنیادی تصور ہے جس کے بعد ایک انسان کا پیدائشی طور پر حکمراں اور دوسروں کا محکوم ہونا غلط قرار پاتا ہے، اسلام سے پہلے قریب قریب پوری دنیا میں بادشاہتیں قائم تھیں، روم، ایران، حبش، یمن، ہندوستان، غرض اس وقت کی معلوم دنیا میں ہر جگہ شاہانہ طرزِ حکومت مروج تھا اور مخصوص خاندانوں کو حکومت کا اہل سمجھا جاتا تھا، اس کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ اس آمرانہ طرزِ حکومت کو مذہبی رنگ دیدیا گیا تھا، ایران میں لوگ شاہی خاندان کو خدا کا کنبہ تصور کرتے تھے، مغرب میں رفتہ رفتہ کلیسا نے انسان کو اپنا مکمل غلام بنالیا تھا، وہ نہ صرف اپنے آپ کو لوگوں کی آخرت کا ٹھیکیدار تصور کرتے تھے، بلکہ دنیا میں بھی اپنے فیصلہ کو خدائی فیصلہ باور کرتے تھے، اور یہی عقیدہ لوگوں کے ذہن میں راسخ کردیا گیا تھا، ایک طرف وہ مغفرت نامے تقسیم کرتے اور لوگوں کے لئے جنت کی رجسٹری کرتے اور دوسری طرف مملکت کے نظام کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھ کر نہایت جابرانہ طرزِ عمل اختیار کرتے، اور جو ان کی رائے سے سرمو انحراف کرتا ان کو لرزا دینے والے عقوبت خانوں میں تختۂ مشق بنایا جاتا، اور زندہ جلا دینے کی سزا دی جاتی بالآخر ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس پر یہ ظالمانہ کلیسائی نظام یورپ سے ختم ہوا، گویا ایک آمریت تھی جو مذہب اور خدا کے نام پر روا رکھی گئی تھی، اس لئے یورپ میں جو انقلابی تحریکیں اٹھیں ان کا خمیر مذہب کی مخالفت اور عناد سے تیار ہوا۔

اسلام نے اس طرح کی خاندانی بادشاہت کو سند جواز عطا نہیں کیا، اور ایک ایسے آزاد طرزِ حکومت کا تصور پیش کیا، جس میں رنگ ونسل کے بجائے صلاحیت اور کردار کی بنیاد پر فرمانرواں کا انتخاب عمل میں آئے، اور پھر یہ بھی بتادیا کہ حکمراں کوئی مافوق العادت حیثیت کا حامل نہیں ہوتا، بلکہ وہ بھی عام لوگوں ہی میں کا ایک شخص ہوتا ہے، اس کے فیصلے غلط بھی ہوسکتے ہیں، اس کی ذات تنقید سے بالاتر نہیں ہوتی، اور عوام کو ان کے احتساب کا پورا حق حاصل ہوتا ہے، یہ بات کہ حق حکمرانی ''اتفاق'' سے متعلق نہیں کہ کوئی شخص کسی خاندان میں پیدا ہوجائے تو وہ حکمرانی کا حقدار ہے، بلکہ یہ حق انسان کے کردار اور اکتساب

سے متعلق ہے، یہ ایک انقلابی فکر ہے جس سے آزادی کا تصور ابھرتا ہے، اور غلامی کی نفی ہوتی ہے۔

پھر اسلام نے تفصیل کے ساتھ مختلف شعبہائے زندگی سے متعلق انسان کے بنیادی حقوق کو متعین کیا، قرآن نے کہا: کہ ہر شخص کو جینے کا حق ہے، اور کسی بھی نفس انسانی کو زندہ قتل کر دیا جائے تو اس کے وارث کو قاتل سے بدلہ لینے کا پورا پورا حق حاصل ہے (الاسراء: ۳۳) گویا انسان اپنی زندگی کے لئے کسی کے رحم و کرم کا محتاج نہیں، ہر شخص کو اپنے مال پر ملکیت کا حق ہے، دوسروں کو حق نہیں کہ وہ ناروا طریقہ پر اس کی رضامندی کے بغیر اس کے مال پر قابض ہو جائے، (نساء: ۲۹) —— پھر کسب معاش کے لئے ہر شخص آزاد ہے، کہ وہ جس پیشہ کو چاہے اختیار کرے، اس کو اس بات پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ اگر اس کے خاندان میں پہلے سے کوئی ایسا پیشہ آرہا ہو جسے لوگ کمتر سمجھتے ہوں، تو وہ وہی پیشہ اختیار کرے۔ ہاں، اگر کوئی شخص کسی کام کا اہل نہیں، جیسے اس نے میڈیکل تعلیم حاصل نہ کی ہو اور لوگوں کا علاج کرنے لگے تو عام لوگوں کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے اس سے روکا جا سکتا ہے، خود حدیث نبوی میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

عزت و آبرو کا تحفظ ایک بنیادی حق ہے، اور کسی قوم کے لئے گنجائش نہیں کہ وہ دوسری قوم کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کرے، **لا یسخر قوم من قوم** (الحجرات: ۱۱)۔ عدل و انصاف ہر شخص کا حق ہے، اسلام نے اس کا شفاف اور مساوات پر مبنی نظام دیا ہے، اور انصاف کے معیارات بھی یکساں رکھے ہیں، اس میں حکمران و محکوم اور سماج کے باوجاہت اور معمولی لوگوں کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا، یہاں تک کہ اگر مسلمانوں کی کسی قوم سے عداوت ہو تب بھی حکم دیا گیا کہ پیمانۂ انصاف میں کوئی فرق نہ ہونے پائے، **ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لا تعدلوا** (مائدہ: ۸) ہر شخص کو رائے اور ضمیر کی آزادی عطاء کی گئی، اور وہ جس چیز کو غلط سمجھے اس کے اظہار کی اجازت دی گئی، جسے قرآن کی زبان میں نہی عن المنکر کہا جاتا ہے (آل عمران: ۱۰)۔ ملک کے ہر شہری کو احتجاج اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق دیا گیا ہے، **لا یحب اللہ الجھر**

بالسوء من القول الا من ظلم (نساء:۱۴۸)

اسلام ملک کے تمام شہریوں کو مذہبی آزادی عطا کرتا ہے، کہ وہ اپنے ضمیر و اعتقاد کے مطابق خود زندگی گذارے: لا اکراہ فی الدین قدتبین الرشد من الغی (البقرۃ: ۲۵۶) سزاء کے نظام میں بھی مساوات و برابری اور ہر بالغ و مکلف کے لئے یکساں سزا رکھی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے قریش کی ایک معزز خاتون کا ہاتھ چوری کے جرم میں کٹوایا، اور اس سلسلہ میں اپنے قریب ترین لوگوں کی سفارش کو رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: کہ اگر فاطمہ بنت محمد بھی اس کی مرتکب ہوتی تو اسے بھی یہی سزا دی گئی ہوتی۔ اسلام نے ایک ایسے نظامِ مملکت کا تصور دیا جو شورائیت پر مبنی ہو، وأمرهم شوری بینهم (الشوری: ۳۸)

غرض اسلام ایک ایسے سیاسی نظام کا نقیب و ترجمان ہے جو غلامی کے بجائے آزادی پر مبنی ہو، جو انسانی تفریق کے بجائے مساوات پر قائم ہو، جس میں رنگ و نسل کے بجائے اخلاق و کردار کو تولا جاتا ہو، جس میں انصاف کا ایک ہی پیمانہ ہو، جس میں اصحاب اقتدار کے احتساب کی اسی قدر گنجائش ہو، جتنی ایک ادنیٰ رعایا کی، اور جو انسان کرامت و شرافت کے بنیادی تصور پر استوار ہو۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ آزادی کے لئے بھی کچھ حدود و قیود ضروری ہیں، سڑک پر ہر شخص کو چلنے کا حق ہے لیکن اگر لوگ یہ سمجھیں کہ یہ آزادی ان کو ٹریفک کے قواعد سے بھی آزاد کرتی ہے تو یقیناً یہ آزادی پروانۂ ہلاکت بن جائے گی، اس لئے آزادی کے بھی دائرے ہیں، اور یہ دائرہ اخلاقی اقدار کا ہے، آزادی ایسی نہ ہو کہ جس سے اخلاق کے بندھن ٹوٹ جائیں، جو شرم و حیاء کے الفاظ کو انسانی ڈکشنری سے مٹا کر رکھ دے، جو انسان کو ظلم و استبداد کے لئے آزاد کر دے، جو فطرتِ انسانی کی تسلیم شدہ حقیقتوں پر بھی خط نسخ پھیر دے، یہ آزادی رحمت نہیں بلکہ زحمت ہے۔ اور سامان عافیت نہیں بلکہ ابتلاء و مصیبت ہے، افسوس کہ مغرب میں کلیسائی نظام کے خلاف جو بغاوت ہوئی، اس نے مذہب بے زاری کی ایسی برقی رو دوڑا دی کہ جس نے فکر و نظر کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے اور لوگوں نے سمجھا کہ آزادی یہ ہے کہ انسان مادر و پدر سے آزاد ہو جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمہ

اخلاقی قدروں کو بھی غلامی کی علامت سمجھ لیا گیا، مخرب اخلاق اسباب کو بھی آزادی کا پروانہ دیدیا گیا، اور انسان کے لئے یہ بات مشکل ہوگئی کہ وہ اپنے پیکر آزادی پر اخلاق و شرافت کی قیدو بند کا کوئی تارِ لباس باقی رہنے دے۔

اسلام ایسی بے قید آزادی کا قائل نہیں، اسی لئے اس نے انتظام و تدبیر انسان کے ہاتھ میں رکھا اور قانون کی لگام خدا کے ہاتھ میں دی، اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہ (یوسف۔۴۰) کیونکہ انسان کے خالق سے بڑھ کر انسان کی آزادی کے حدود اور اس کی بھلائی کے لئے مطلوب پابندیوں اور قیود کو کوئی اور ذات نہیں سمجھ سکتی، یہ آزادی کا ایک متوازن، معتدل تصور ہے، جس میں نہ صرف آخرت کی فلاح ہے، بلکہ دنیا کی بھی بھلائی ہے، کہ خدا کی غلامی ہی اصل میں انسان کی آزادی ہے، جو شخص خدا کا غلام بننے کو تیار نہ ہو تو اسے ضرور مخلوق کا غلام بننا پڑے گا، اگر وہ دوسروں کا غلام نہ بنے، تو کم سے کم خود اپنے نفس کی غلامی اسے قبول کرنی ہوگی، اسی کو مردِ حق آگاہ شاعر اسلام علامہ اقبالؔ نے کہا ہے کہ :

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(۱۰/اگست ۲۰۰۱ء)

آزادیٔ تحریر یا آوارہ خیالی؟

خشونت سنگھ ہمارے ملک کے معروف اور کہنہ مشق صحافیوں میں ہیں، چبھتا ہوا طنز اور مخالف کو مشتعل کر دینے والی تعریض اگر فن کا کمال ہو تو اس کمال میں کم اہلِ قلم ہیں جو ان کی ہمسری کر سکیں، لیکن آزاد خیالی بلکہ آوارہ خیالی کی وجہ سے ان کی تحریریں اکثر نزاع کا باعث بنتی رہتی ہیں، انسان کی عملی اور فکری وابستگی کے جتنے مرکز ہیں ان میں سب سے زیادہ مقدس مذہبی وابستگی ہے۔ ہر شخص اپنے دین ودھرم کے مقابلہ میں بہت جذباتی اور حساس ہوتا ہے۔ اس لئے ہر سلیم الفکر معاشرہ ایک دوسرے کے مذہبی احساسات کے احترام اور رعایت پر مبنی ہے۔ خشونت سنگھ چوں کہ دہریہ ہیں، اور فکری اعتبار سے مادر پدر آزاد ہیں، اس لئے شرافت اور انسانیت کے اس عمومی احساس سے بھی محروم ہیں، اس لئے اپنے قلم ناز سے بہتوں کو گھائل کرتے رہتے ہیں، کبھی ہندو ان کا نشانہ بنتے ہیں، کبھی سکھ اور کبھی مسلمان، کبھی کسی اور مذہب کے ماننے والوں کو ہدف بناتے ہیں یہ بہت ہی تکلیف دہ صورت حال ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر شخص کو اظہار خیال کی آزادی ہے، لیکن آزادی اسی حد تک ہے کہ دوسرے کے جذبات اس سے مجروح نہ ہوں۔ آپ فضاء میں لاٹھی گھما سکتے ہیں، لیکن یہ احتیاط ضروری ہے کہ آپ کی لاٹھی کسی اور کے سر سے نہ ٹکرائے، کسی شخص کے لئے بہر حال اس کی گنجائش نہیں، کہ وہ شخص آزادی کے نام پر دوسروں کا سر پھوڑیں اور راہ چلتے لوگوں کو زخمی کر دے، اس کا نام آزادی نہیں بلکہ بے راہ روی اور آوارگی ہے، افسوس کہ خشونت سنگھ جس آزادیٔ صحافت کے علمبردار اور حریت فکر کے دعویدار ہیں، وہ کسی قسم کی اصول وقواعد اور شرافت وسنجیدگی سے آزاد صحافت ہے۔

ابھی حال ہی ان کا ایک ناول THe Company of Woman یعنی عورتوں کی صحبت، کے نام سے لکھی ہے۔ظاہر ہے کہ اس نام سے ہی بے حیائی اور بے شرمی جھلکتی ہے، قارئین اور تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ یہ نہایت ہی بے ہودہ قسم کا ناول ہے۔اس میں مرد و عورت کے شہوانی جذبات، شہوانی افعال یہاں تک کہ جسم کے حساس اعضاء کی بھی بہت بے حجابانہ تصویر کشی کی گئی ہے، ہمارے ملک میں ایشین ایج اس قسم کی تحریروں کی تشہیر و اشاعت کے لئے معروف ہے، اسی نے اس ناول کا خلاصہ ۱۹ر ستمبر ۱۹۹۹ء کو شائع کیا ہے۔ اس فرضی کہانی میں پاکستان کی ایک مسلم خاتون اور ہندوستان کے ایک غیر مسلم نوجوان کا بنیادی کردار ہے۔اس میں اس عورت کی زبان سے ہندو مذہب کے کمزور اخلاقی پہلوؤں کو سوالات کے ذریعہ ابھارا گیا ہے، جو یقیناً ہندو بھائیوں کے لئے ایک تکلیف دہ بات ہے، پھر اسلام پر کچھ سوالات اٹھائے گئے ہیں، حجر اسود کے بوسہ لینے کو بت پرستی کے مماثل قرار دیا گیا ہے جس کا غلط ہونا ظاہر ہے۔ پھر یہ فحش منظر بھی پیش کیا گیا ہے کہ کہانی کے یہ دونوں کردار ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے ہیں اور بدکرداری کرتے ہیں، اور اس برائی کے درمیان وہ عورت اپنے گلے میں آیات قرآنی کا نکلس لٹکائے رہتی ہے، اور یہ عورت کہتی ہے کہ وہ عمرہ کر کے اس گناہ کا کفارہ ادا کر دے گی، یہ بات بھی ظاہر کی جاتی ہے کہ وہ پابند نماز عورت ہے۔

ان مضامین کی بے ہودگی اور ناشائستگی ظاہر ہے کہ اس میں ہندو مذہب کا بھی مذاق اڑایا گیا ہے، اور مسلمانوں کے جذبات کو تو بہت ہی ٹھیس پہونچائی گئی ہے۔عمرہ جیسی عبادت کا تمسخر اور ایک پابند نماز خاتون کی بے عزتیکی گئی ہے۔ایک کہنہ مشق، جہاں دیدہ اور معروف صحافی سے ایسی اوچھی حرکت کا صدور اور ایسی ناپاک تحریروں کی تخلیق نہ صرف خشونت سنگھ کے لئے شرمناک ہے بلکہ اس سے تمام ہندوستانیوں کا سر شرم سے جھک جانا چاہئے کہ ہندوستان کی شرم وحیاء اور عفت وعصمت ضرب المثل رہی ہے۔ جو ملک سیتا کی عفت و پاک دامنی کا امین ہو وہاں علانیہ شہوت انگیز فرضی کہانیاں اور مخرب اخلاق ناول لکھے جائیں تو اس سے زیادہ قابلِ افسوس بات اور کیا ہو سکتی ہے؟

اسلامی نقطۂ نظر ان امور کے بارے میں بالکل واضح اور بے غبار ہے، قرآن اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ دوسرے مذہبی پیشواؤں کے بارے میں ایسی بات کہی جائے جو ان کے ماننے والوں کے لئے اشتعال اور دلآزاری کا باعث ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ** (الانعام: ۱۰۸) یعنی مشرکین جن چیزوں کی پرستش کرتے ہیں، تم ان کو برا بھلا نہ کہو، وجہ اس کی ظاہر ہے، کہ معاشرہ کو اشتعال اور نقض امن سے بچایا جائے، اور کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو سماج کے کسی طبقہ کے لئے اذیت اور تکلیف کا باعث ہو۔

شریعت اسلامی کا مزاج یہ ہے کہ اگر کوئی برائی وقوع پذیر بھی ہوئی ہو، تو اس کا چرچا کرنے سے بچا جائے، کیوں کہ برائی کے ذکر سے بھی برائی پھیلتی ہے۔ اسی لئے اگر کوئی شخص زنا کا مرتکب ہو تو کوڑوں کی سزا کے علاوہ آپ نے اسے ایک سال کے لئے شہر بدر کر دینے کا بھی حکم فرمایا۔ مقصد یہ ہے کہ اگر وہ اپنے ماحول میں چلتا پھرتا رہے تو موضوع گفتگو بنا رہے گا۔ اور لوگ اس کی برائیوں کا بھی ذکر کرتے رہیں گے۔

اس طرح برائی کا چرچا عام ہوگا، اور معاشرہ میں برائی پھیلے گی، اسی طرح اگر کوئی بد بخت جانور کے ساتھ بدفعلی کرے تو آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اس جانور کو ذبح کر کے جلا دو۔ ظاہر ہے کہ اس میں جانور کا کوئی قصور نہیں، لیکن مقصد یہ ہے کہ اگر وہ اسی ماحول میں چلتا پھرتا رہے تو لوگ انگشت نمائی کریں گے۔ اس طرح ایک برائی کا ذکر عام ہوگا اور جب کسی برائی کا چرچا بکثرت ہونے لگتا ہے تو مریضانہ ذہنیت رکھنے والے لوگ خود اس برائی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اس لئے اس کے سد باب کے طور پر آپ نے جانور ذبح کرنے کا حکم فرمایا۔

یہ تو ان برائیوں کا ذکر ہے جو واقعی پیش آئی ہو، فرضی کہانیوں کے ذریعہ کسی برائی کو پھیلانا اور اس کے چرچا کو عام کرنا تو ظاہر ہے کہ بہت شدید درجہ کا گناہ ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص کوئی خلاف واقعہ بات کہے، مقصد بدنیتی نہ ہو بلکہ لوگوں کو ہنسانا ہو، تو یہ بھی اس کے لئے رحمتِ خداوندی سے محرومی کا باعث ہوگا۔ (دیکھئے: مجمع الزوائد:

۸۹/۸، باب ماجاء فی المزاح) اس سے ظاہر ہے کہ تفریحی مقاصد کے لئے بھی خلاف واقعہ بات کہنا اور فرضی واقعہ نقل کرنا درست نہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو، وہ یا تو بھلی بات کہے، یا خاموش رہے، کہ اللہ تعالیٰ دنیا سے بے نیازی برتنے والے بردبار اور زبان کی حفاظت کرنے والے شخص کو پسند فرماتے ہیں اور بدزبان فاجر، الحاح کے ساتھ مانگنے والے کو ناپسند فرماتے ہیں۔ (مجمع الزوائد: ۶/۸ ۷) ... گوئی سے بہتر زبان وقلم کو خاموش رکھنا ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے خاموشی اختیار کی اس نے نجات پائی، **من صمت نجا** (ترمذی) ایک او. روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: خاموشی میں کئی حکمتیں ہیں، لیکن کم لوگ ہیں جو اسے اختیار کریں: **الصمت حکم وقلیل فاعله**، (احیاء العلوم ۱۰۸/۳) ایک روایت میں ہے کہ جب تم کسی مومن کو دیکھو کہ وہ خاموش اور باوقار ہے تو اس سے قربت اختیار کرو، کیوں کہ وہ حکمت کی باتیں بتائے گا: **اذا رئیتم المومن صموتا وقورا فادن منه، فانه یلقن الحکمة** . (ابن ماجہ)

بدزبانی اور بدگوئی اسلام کی نظر میں انتہائی ناپسندیدہ بات ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس سے بہت شدت سے منع فرمایا ہے۔ اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اسے پسند نہیں کرتے۔ **ایاکم والفحش، فان الله تعالیٰ لا یحب الفحش ولا التفحش**، یہاں تک کہ بدر میں جو مشرکین قتل کئے گئے رسول اللہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو بھی برا بھلا کہنے سے منع فرمایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کو تو تمہاری بات نہیں پہونچے گی۔ لیکن ان کے جو پسماندگان زندہ ہیں، ان کے لئے یہ بات اذیت کا باعث ہوگی، پس بدگوئی قابل ملامت ہے۔ (احیاء العلوم: ۱۲۱/۳)

اس لئے گو کسی شخص کا عمل خراب ہو، لیکن ناحق اس کے تذکرہ کو اسلام پسند نہیں کرتا ہے، بالخصوص ان حالات میں کہ اس کی بدکلامی لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہونچاتی ہو، اسلام کے جو اصول ابھی پیش کئے گئے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ہر مذہب، ہر مہذب قانون

اور ہر شریف معاشرہ اس سے متفق ہوگا، کیوں کہ اس کے بغیر سماج کے امن وامان کی برقراری ممکن نہیں، اس طرح کی تحریریں لکھنا قلم کی آزادی نہیں، بلکہ قلم کی آوارگی کے دائرہ میں آتی ہے، اور ضروری ہے کہ ایسی چیزوں پر قانونی اعتبار سے بھی روک لگے اور صحافتی برادری بھی ایسے اہل قلم کا نوٹس لے، اور صحافت جیسے پاکیزہ پیشہ کی عزت وآبرو کی حفاظت کرے۔

(۲۱ر جنوری ۲۰۰۱ء)

ووٹ ـــــ اسلامی نقطۂ نظر

ملک میں الیکشن کا عمل شروع ہو چکا ہے، کچھ علاقوں میں لوگ اپنا حق رائے دہی استعمال کر چکے ہیں، اور ہمارے شہر میں کل لوگ اپنے اس حق کا استعمال کریں گے، مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم انتخاب اور رائے دہی کے اس عمل کے بارے میں اسلامی اور شرعی نقطۂ نظر جاننے کی کوشش کریں، کیوں کہ اسلام ایک ہمہ گیر مذہب، اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کی بابت رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔

ووٹ کے بارے میں بھی اسلام کے اصولی احکام سے ہمیں روشنی ملتی ہے، جب کوئی شخص انتخاب میں امیدوار بنتا ہے تو وہ بنیادی طور پر دو باتوں کا مدعی ہے، اول اپنی امانت و دیانت کا، دوسرے اپنی اہلیت اور صلاحیت کا، حضرت یوسف علیہ السلام نے جب حکومتِ مصر کے سامنے بارِ قیادت اٹھانے کی پیشکش کی تھی تو فرمایا تھا: **اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ، اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ** (یوسف:۵۵) یعنی خزانہ کے انتظام اور انصرام پر مجھے مامور کیجئے، کہ میں نگہبان اور آگاہ ہوں، حفاظت و نگہبانی اسی شخص سے ممکن ہے جو دیانت دار اور امین بھی ہو، جو شخص خود ہی خیانت اور بد دیانتی کا مرتکب ہو، وہ کیا حفاظت اور نگرانی کا فرض انجام دے سکتا ہے؟ اور علم سے اشارہ صلاحیت اور اہلیت کی طرف ہے، جب تک کسی معاملہ سے متعلق علم و آگہی نہ ہو، انسان اس کے انتظام و انصرام اور اس سلسلہ میں مشورہ دینے کا اہل نہیں ہوسکتا، پس، امیدوار کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرنا اپنے تئیں امانت دار اور باصلاحیت ہونے کا دعویٰ ہے۔

ووٹ رائے دہندوں کی طرف سے اس کے اس دعویٰ کی تصدیق اور اس کے راست گو ہونے کی گواہی ہے، گویا آپ جس امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں، اس کے حق میں

گواہی دیتے ہیں کہ جتنے امیدوار اس حلقہ سے کھڑے ہیں ان میں یہ سب سے زیادہ دیانت دار اور باصلاحیت ہے، اور معلوم ہے کہ جہاں سچی گواہی انسان کے لئے اجر و ثواب کا موجب ہے، جھوٹی گواہی اسی قدر عذاب وعقاب کا سبب ہے، رسول اللہ ﷺ نے جھوٹ اور جھوٹی گواہی کی سخت مذمت فرمائی ہے۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے نمازِ فجر کے بعد تین بار ارشاد فرمایا کہ جھوٹی گواہی کو شرک کے ہم درجہ قرار دیا گیا ہے: "عدلت شهادة الزور بالاشراك بالله" پھر قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی: **فاجتنبوا الرجس من الاوثان، واجتنبوا قول الزور (؟)** یعنی بت پرستی کی نجاست اور جھوٹی بات کہنے سے بچو (ابوداؤد، حدیث نمبر :۳۵۹۹، ابن ماجہ، حدیث نمبر:۲۳۹۴) اللہ تعالیٰ نے مومن کے خاص اوصاف میں سے اس بات کو بھی قرار دیا ہے کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتا (الفرقان:۷۲) لہٰذا کسی امیدوار کو نامناسب جانتے ہوئے پھر بھی اس کے حق میں ووٹ دینا گویا جھوٹی گواہی دینا اور ناحق اپنے آپ کو ایک بڑے گناہ سے دوچار کرنا ہے۔

جہاں جھوٹی گواہی دینا گناہ ہے وہیں ضرورت کے باوجود گواہی نہ دینا "کتمان شہادت" ہے اور یہ بھی سخت گناہ ہے، قرآن مجید نے گواہی کے چھپانے کی سخت مذمت کی ہے، ارشاد ہے: لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ (البقرة:۲۸۳) کہ گواہی کو چھپایا نہ کرو، جو گواہی کو چھپائے گا، اس کا دل گنہ گار ہوگا، اس لئے ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسلمانوں پر ووٹ دینا شرعاً واجب ہے، اور کسی شدید ضرورت کے پیش آنے یا ضرر شدید کے اندیشہ کے بغیر ووٹ دینے سے پہلوتہی کرنا گناہ کا باعث ہوسکتا ہے، اور عنداللہ اس پر سخت مواخذہ کا اندیشہ ہے۔

بعض حضرات پیسے لے کر کسی امیدوار کے حق میں اپنا ووٹ استعمال کرتے ہیں، یہ بھی گناہ اور حرام ہے، کیوں کہ یہ پیسہ لے کر کسی شخص کے حق میں جھوٹی گواہی دینا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ رشوت ہے، اور رشوت کتنا سخت گناہ ہے اور کیسی شدید معصیت ہے؟ یہ کسی مسلمان کے لئے محتاج اظہار نہیں، رسول اللہ ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر لعنت بھیجی ہے، ایک حدیث شریف میں ہے کہ رشوت دینے والے اور

رشوت لینے والے دونوں دوزخی ہیں، چند پیسوں کے لئے اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کی لعنت کا مستحق بنالینا اور دوزخ خرید کرنا کسی عقلمند کا کام نہیں ہوسکتا۔'' ہمارے ملک کے قانون کے تحت عورتوں کو بھی ووٹ دینے کا حق حاصل ہے، مسلمان خواتین کو بھی چاہئے کہ وہ اپنے اس جمہوری حق سے فائدہ اٹھائیں، اسلامی نقطۂ نظر سے عورت الیکشن میں امیدوار نہیں ہوسکتی، البتہ اگر ہندوستان میں خواتین کے لئے سیٹیں مخصوص کر دی جائیں تو یہاں کے خصوصی حالات میں اس کے سوا چارہ نہ ہوگا کہ اگر مسلمان اس قانون کے روکنے پر قادر نہ ہوں تو کمتر درجہ کی برائی سمجھتے ہوئے خواتین کو بھی انتخابی امیدوار بنائیں، تاہم عورت کے ووٹ دینے میں کچھ حرج نہیں، فقہاء کے یہاں ایک مسئلہ گواہوں کے تزکیہ کا آتا ہے، یعنی جو گواہان عدالت میں پیش ہوئے ہوں ان کے بارے میں معتبر اور نامعتبر ہونے کی گواہی، اور اس سلسلہ میں عورتوں کی گواہی کو معتبر مانا گیا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: **و یقبل تعدیل المرأۃ لزوجھا و غیرہ اذا کانت امرأۃ برزۃ تخالط الناس و تعاملھم** (ہندیہ: ۳/ ۵۲۸) ووٹ بھی اسی قبیل سے ہے۔

ووٹ میں شفاعت و سفارش کا پہلو بھی پایا جاتا ہے، جب آپ کسی کو ووٹ دیتے ہیں تو گویا اس کے حق میں سفارش کرتے ہیں کہ اسے قوم و ملک کے انتظامی امور میں نمائندہ بنایا جائے، اور شفاعت و سفارش اگر درست ہو تو باعثِ اجر و ثواب ہے، اور غلط سفارش کی جائے تو سفارش کنندہ بھی گناہ میں حصہ دار ہوگا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو بہتر سفارش کرے گا، اس کے لئے اس میں سے حصہ ہوگا اور جو نادرست سفارش کرے گا اس کے لئے اس میں سے حصہ ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں (النساء: ۸۵) غلط سفارش کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے چوری کے ایک مقدمہ میں مجرم کے لئے سفارش کی، تو آپ ﷺ اتنے برہم ہوئے کہ کھڑے ہوکر اس پر مستقل خطبہ ارشاد فرمایا: کہ تم سے پہلے کے لوگ اسی لئے ہلاک ہوگئے کہ جب کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے، اور کوئی معمولی شخص چوری کرتا تو اس پر سزا جاری کرتے (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۳۷۳)۔ اس لئے غلط سفارش بھی نہایت ہی مذموم عمل ہے، اور چوں کہ ووٹ کے

ذریعہ منتخب ہونے والے نمائندہ کے عمل سے اجتماعی نفع ونقصان متعلق ہے، اس لئے یہاں غلط سفارش کا گناہ بھی نسبتاً زیادہ شدید ہوگا۔

ووٹ میں ایک پہلو وکالت کا بھی ہے، ووٹ کے ذریعہ آپ جو نمائندہ منتخب کرتے ہیں وہی سربراہِ حکومت یعنی وزیر اعظم ووزیر اعلیٰ اور صدرِ مملکت یعنی صدرِ جمہوریہ کا انتخاب کرتے ہیں، پھر وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ ہی کے واسطہ سے ملک کی پوری انتظامیہ تشکیل پاتی ہے، اور عدلیہ اور انتظام کے کچھ صیغے صدر کے واسطہ سے وجود میں آتے ہیں، اس طرح ملک کا نظم ونسق اور نظامِ عدلیہ کا بالواسطہ آپ کے ووٹوں سے منتخب ہونے والے ارکان مقننہ ہی پر انحصار ہے، پس گویا ملک کے نظم واقتدار کے لئے ذمہ داروں کے انتخاب کے باب میں یہی ارکان آپ کے نمائندہ اور وکیل ہیں اور قاعدہ یہ ہے کہ شرعاً وکیل کے ذریعہ انجام پانے والے افعال اس شخص کی طرف بھی منسوب ہوتے ہیں جس نے اس کو وکیل بنایا ہو، اس لحاظ سے غور کیجئے تو کسی امیدوار کو ووٹ دینا نہایت ہی اہم مسئلہ ہے، اور یہ اس کے اچھے اور بُرے افعال میں شریک وسہیم ہونے کے مترادف ہے۔

لہٰذا ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ووٹ دیتے ہوئے اس بات کو ملحوظ رکھے کہ وہ ووٹ کے ذریعہ سچی یا جھوٹی گواہی دے رہا ہے، اچھی یا بُری سفارش کررہا ہے، مناسب یا غیر مناسب شخص کو اپنا وکیل اور نمائندہ بنارہا ہے، ووٹ دینے پر پیسے لے کر وہ صریحاً رشوت خوری کا مرتکب ہوتا ہے، اور بلا عذر ووٹ نہ دے کر گواہی کو چھپانے کا گناہ مول لیتا ہے، اور اس کی یہ گواہی سفارش اور وکالت ایک ایسا عمل ہے جس کا اثر صرف اس کی ذات یا اس جیسے چند اشخاص تک محدود نہیں، بلکہ اس کی منفعت اور مضرت اجتماعی ہوگی، اور پوری قوم اس سے متاثر ہوگی، اور کسی شخص کو انفرادی نقصان پہونچانا کمتر درجہ کا گناہ ہے، اور اجتماعی سطح پر ضرر پہونچانا یا اس میں شریک ہونا بہت بڑا گناہ۔ اس لئے ہر مسلمان کا شرعی اور اسلامی فریضہ ہے کہ وہ ان پہلوؤں کو سامنے رکھ کر نسبتاً بہتر، دیانت دار، قوم و ملک کے حق میں مفید اور خیر خواہ امیدوار کے حق میں اپنے ووٹ کو استعمال کریں، اور ذاتی تعلقات اور شخصی مفاد کے مقابلہ قومی مفادات کو ترجیح دیں!۔ (۱۰ر ستمبر ۱۹۹۹ء)

ووٹ ـــــ ایک امانت

انسان آزاد پیدا ہوا ہے، اس لئے آزادی اس کی فطرت میں ہے۔ غلامی اس کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے، خواہ اس غلامی کے ساتھ اس کی جسمانی راحت کا کتنا بھی سروسامان کیا جائے۔ ٹھیک ایسے ہی جیسے کسی پرندہ کو سونے کے قفص میں بند کر دیا جائے۔ اس آزادی کے لئے ہمارے بزرگوں نے جہاد کیا اور انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا، آج ہمارا ملک آزاد ہے، ہم خود اس کے دروبست کے مالک ہیں اور اس کی تقدیر کے فیصلہ میں شریک ہیں۔ یہ آزادی اللہ کی بڑی نعمت ہے، ہم آزادانہ اپنے افکار وخیالات کا اظہار کر سکتے ہیں، ہم جس بات کو غلط سمجھیں اسے برملا غلط کہہ سکتے ہیں، ہم ان لوگوں کا احتساب کر سکتے ہیں جو اقتدار کے ایوانوں میں متمکن ہیں۔ ہم اپنے مذہب کی تبلیغ کر سکتے ہیں اور محرومانِ ہدایت کو سچائی کا راستہ دکھا سکتے ہیں۔

اس جمہوریت کا ایک حصہ ''الیکشن'' ہے؛ جس میں ملک کے عوام اپنے لئے اپنی پسند کے نمائندے منتخب کرتے ہیں، جو ایوانِ اقتدار میں ان کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتے ہیں اور ملک کے سیاہ وسپید کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر تو اسلام ''الیکشن'' میں اُمیدواری ہی کا قائل نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا ''جو شخص کسی عہدہ اور ذمہ داری کا طلب گار ہوگا میں اسے وہ ذمہ داری حوالہ نہیں کروں گا''۔ اس لئے لوگوں سے ووٹ کی بھیک مانگنا اور خواہش کرنا کہ ہمیں اس ذمہ داری کے لئے منتخب کرو، بجائے خود ایک غیر اسلامی بلکہ غیر اخلاقی اور غیر شریفانہ طریقہ ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ خود لوگ اس سے خواستگار ہوں کہ وہ اس ذمہ داری کو قبول کرے، لیکن مشکل یہ ہے کہ مغربی جمہوریت میں ہر چیز کی گنجائش ہے سوائے اخلاق کے، اس لئے خود امیدوار بننے کے سوا چارہ نہیں، ورنہ

سارے ہی خراب لوگ سیاست کی اس ریل میں سوار ہو جائیں گے۔

جمہوریت میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں، وہیں بعض خامیاں بھی ہیں۔ اسلام ان خامیوں کی اصلاح کے ساتھ ان کو قبول کرتا ہے، سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ہمارے ملک میں انتخاب میں حصہ لینے اور عوامی نمائندہ منتخب ہونے کے لئے نہ علم ودانش کی شرط ہے، نہ اخلاق و دیانت کی ضرورت ہے۔ پہلے لوگ اس کا رونا روتے تھے، کہ جاہل اور کم تعلیم یافتہ افراد منتخب ہو جاتے ہیں اور ملک کے حساس مسائل کا فیصلہ ایسے کندہ ناتراش افراد کے حوالے ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں بعض ایسے ارکان مقننہ بھی تھے اور ہیں جو دستخط کی صلاحیت سے بھی بے نیاز ہیں، اور نشان ابہام ہی سے کام چلاتے ہیں، اب بات اس سے بھی آگے جا چکی ہے اور بڑی تعداد میں ایسے عناصر مجالس قانون ساز میں پہنچ رہے ہیں جو نامزد اور نامور مجرم ہیں، ان پر قتل، زنا، غصب اور رہزنی کے علانیہ جرائم ہیں۔ پہلے پولیس گرفتار کرنے کے لے ان کا پیچھا کرتی تھی، اب ان کی حفاظت وسلامتی کے لئے ان کے پیچھے پیچھے رہتی ہے، کرپشن اور سیاست کا اب چولی دامن کا رشتہ ہے اور اب کسی بھی لیڈر کے بارے میں اسکام کی خبریں سن کر عام شہری کو کوئی حیرت نہیں ہوتی، کیوں کہ یہ اب ایک معمول کی بات ہے۔

جو لوگ الیکشن میں کھڑے ہوتے ہیں، ان میں شاید ایک فیصد بھی ایسے نہیں جو حقیقت میں ایماندار کہلانے کے لائق ہوں، جن کی زندگی پاک وصاف ہو اور عوام کی املاک میں خرد برد کرنے کا عزم لے کر اس میدان میں نہ اُترے ہوں، ڈاکٹر راجندر پرشاد بارہ سال ہندوستان کے صدر رہے اور جب سبکدوش ہو کر اپنے وطن پٹنہ گئے تو ان کو رہنے کے لئے کوئی مکان بھی میسر نہیں تھا، جواہر لال نہرو دارالمصنفین اعظم گڑھ کے رکن تھے، اس وقت فیس رکنیت پانچ سو روپے تھی، جب مولانا مسعود علی ندوی نہرو جی سے ممبری فیس لینے گئے، تو ان کے پاس پانچ سو روپے بھی مکمل نہ ہو سکے اور دو قسطوں میں فیس ادا کی اور اپنی پاس بک دکھائی جس میں دوڈھائی سو روپے سے زیادہ نہ تھے، لیکن آج معمولی عوامی نمائندوں کے محلات پر قصر شاہی اور گھر کی زیبائش وآرائش پر ''جنتِ شداد'' ہونے کا گمان

ہوتا ہے اور پولیس چھاپہ مارتی ہے تو منوں سونے کے زیورات ان کے مکان سے برآمد ہوتے ہیں۔

ان حالات میں ووٹ دینا اور اپنے حق رائے دہی سے استفادہ کرنا جہاں قومی فریضہ ہے، وہیں مسلمانوں کے لئے مذہبی فریضہ بھی ہے، تاکہ ایسے نمائندوں کا انتخاب ہو سکے جو نسبتاً صالح کردار اور اخلاقی اقدار کے حامل ہوں، جو مجرمانہ سیاست پر یقین نہ رکھتے ہوں اور ملک کے سیکولر کردار کی بابت مخلص ہوں، وہ چڑھتے سورج کے پرستار نہ ہوں، بلکہ حق اور سچائی کے طرف دار ہوں۔ موجودہ حالات میں مکمل ایمان دار اور پاک وصاف کردار کے حامل سیاسی لیڈر کی تلاش جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ شریعت کا اُصول ہے کہ جہاں ''بہتر'' میسر نہ ہو، وہاں نسبتاً ''کم خراب'' کو اختیار کیا جائے۔ اس لئے موجودہ حالات میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ایسے اُمیدوار کو ووٹ دیا جائے، جو ملک کی مختلف اکائیوں کو ایک نظر سے دیکھتا ہو، فرقہ پرست نہ ہو اور نسبتاً صالح کردار کا حامل ہو، وہ کم از کم دو شر میں سے کمتر درجہ کا شر ہو۔

ووٹ کی حیثیت دراصل شہادت اور گواہی کی ہے، آپ جب کسی اُمیدوار کے حق ووٹ دیتے ہیں تو گویا آپ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تمام اُمیدواروں میں یہی شخص آپ کے نزدیک اپنی دیانت، جذبۂ خدمت اور نمائندگی کی صلاحیت میں نسبۃً بہتر اور قوم وملک کے لئے مفید ہے۔ کسی شخص کی دیانت وامانت کے بارے میں آپ کو اطمینان نہ ہو، آپ کے علم میں ہو کہ یہ کرپٹ اور راشی ہے اور قوم کی خدمت کے بجائے اپنے اور اپنے خاندان کی خدمت ہی اس کا مقصود ہے، اس کے باوجود آپ اسے ووٹ دیں، یا لوگوں کو اس کی ترغیب دیں، تو اللہ کے یہاں آپ اس بارے میں جوابدہ ہوں گے، اس میں جھوٹی گواہی دینے کا گناہ ہوگا۔ یوں تو ہر جھوٹ برائی ہے، لیکن جھوٹی گواہی کا گناہ، گناہ کی تمام صورتوں سے بڑھ کر ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسے بہت بڑے گناہوں میں ایک شمار فرمایا ہے۔

ووٹ میں اُمیدوار کی صلاحیت اور کردار کے بجائے محض اس بات کو معیار بنانا کہ یہ ہمارے محلہ کا ہے، ہمارے اس شخص سے تعلقات ہیں، اس نے ہمارا فلاں ذاتی کام کر

دیا تھا، یہ ووٹ دینے کے لئے ہمیں پیسے دے رہا ہے، درست نہیں ہے۔ یہ خیانت اور جھوٹی گواہی ہے اور یہ پیسے رشوت ہیں، ہر شخص اس کے بارے میں اللہ کے یہاں جوابدہ ہے، ایسا شخص ایک دو نہیں بلکہ پوری قوم کے ساتھ بدخواہی کا مرتکب ہے، اس لئے ووٹ کے بارے میں خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہئے، تمام اُمیدواروں پر غور کرنا چاہئے، اس کی گزشتہ زندگی اور عام لوگوں کے ساتھ اس کے سلوک اور رویہ کا بھی جائزہ لینا چاہئے، اور پھر جس اُمیدوار کو بہتر اور مفید تصور کرتا ہے اس کے حق میں ''ووٹ'' دینا چاہئے۔ ووٹر کے لئے یہی اصل کامیابی ہے جس کے حق میں اس نے ووٹ کا استعمال کیا ہے، اگر وہ ہار گیا، تب بھی ''ووٹ'' دینے والا اپنے مذہبی فریضہ اور قومی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہے، وہ اللہ کے یہاں خیانت کا مرتکب تصور نہ کیا جائے گا اور اگر ایسے امیدوار کو ووٹ دیا جائے جو قوم کے لئے مفید نہیں، مضر ہے، تو گو اُمیدوار جیت جائے پھر بھی ایک مسلمان ووٹر کے لئے یہ ہار ہی ہے، کیوں کہ وہ اپنے اس غلط عمل کی بابت عنداللہ جوابدہ ہے اور خدا کے ترازو میں اس کا یہ عمل قابل مواخذہ ہے!

(۱۳ر فروری ۱۹۹۸ء)

انتخابی امیدوار — اسلامی معیار

الیکشن کا بگل بج چکا ہے، جلسے جلوس، اشتہارات، وعدے اور وعیدیں ایک دوسرے کی کردار کشی، بلند بانگ دعووں کا ایک سیلاب ہے، جو ملک کے گوشہ گوشہ میں رواں دواں ہے، کیا شہر اور کیا دیہات؟ گھر گھر اور قریہ قریہ، آنے والے الیکشن کی گونج ہے، جیوتشیوں کی بھی بن آئی ہے، اندازے اور پیشین گوئیاں بھی طرح طرح کی کی جارہی ہیں، دعائیں اور آشیرواد بھی لئے جارہے ہیں، جن گندی بستیوں، تنگ اور تیرہ و تاریک گلیوں کی طرف قائدین کبھی پھٹک کر بھی نہیں دیکھتے تھے، اب قائدین کا ایک ہجوم ہے، جو بن بلائے مہمانوں کی طرح صبح و شام ان مقامات کا چکر لگا رہا ہے، جن غریبوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا، ووٹ کی کشکول تھامے بڑے بڑے موٹر نشیں اور برا نہ مانئے تو کہا جائے: ''فراعنۂ وقت'' ان کی خوشامدیں کر رہے ہیں، ایسے ایسے وعدے کئے جارہے ہیں کہ گویا ہر گھر میں دودھ کی نہر بہادیں گے اور شہد کے چشمے پھوٹ پڑیں گے، امیدواروں کا تعلیمی اور اخلاقی معیار بھی سننے سے تعلق رکھتا ہے، بعض حضرات اپنے دستخط بھی ''بہ تکلف'' کرتے ہیں، کیوں کہ انہوں نے ہمیشہ انگوٹھے کے نشان سے کام چلایا ہے، بعض حضرات کی تعلیمی سطح پرائمری اور مڈل اسکول تک ہے۔ اخلاقی اقدار کا حال اس سے بھی بُرا ہے، کسی پر راہزنی کا مقدمہ ہے، کسی پر قتل کا تو کسی پر آبرو ریزی کا، رہ گئی رشوت اور مالی خرد برد، تو یہ تو اس طبقہ کے لئے ایک ''معمولی'' سی بات ہے!

ان حالات میں ووٹ کے لئے امیدواروں کے انتخاب میں مسلمانوں کی کیا ذمہ داری ہے؟ کیا ان کی سوچ وہی ہو جو عام لوگوں کی ہے، زمانہ جس رُخ پر چل رہا ہو، اسی رخ پر چل پڑنا، جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کہنا تعلقات اور شخصی مفادات کی بناء پر امیدوار کا انتخاب کرنا، ان کو ووٹ دینا اور ووٹ دلانا، ان کی تشہیر کرنا، ان کی

پروپیگنڈہ مشنری میں شریک ہونا، کیا مسلمانوں کے لئے بھی درست ہوسکتا ہے؟ یا بہتر امیدوار کا انتخاب مسلمانوں کا شرعی فریضہ ہے؟ ایک ایسا سوال ہے جس پر غور کرنا اور جس کو ملحوظ رکھنا بحیثیت مسلمان ہمارے لئے ضروری ہے، یہ بات ظاہر ہے کہ اچھے امیدوار کا انتخاب اور اس کی تائید، اور نامناسب اور نااہل امیدوار کو رد کردینا اور اس کے ساتھ عدمِ تعاون ایک دینی اور شرعی فریضہ ہے، کیوں کہ قرآن نے ایک اصولی بات کہدی ہے کہ اچھی بات اور اچھے کام میں تعاون بھی ضروری ہے اور خراب کام میں عدمِ تعاون بھی واجب ہے. تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. (المائدۃ:۲)

سوال ہے کہ اچھے امیدوار کا معیار کیا ہے؟ — اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ اسلام امیدواری ہی کا قائل نہیں، اس سے زیادہ قبیح اور شنیع بات نہیں ہوسکتی کہ انسان خود عہدہ کا طلب گار ہو، اور لوگوں سے خواہش کرے کہ وہ اسے منتخب کریں، یہ تو درحقیقت بے شرمی کی بات ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسے سخت ناپسند فرمایا ہے، حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ ؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے عبدالرحمٰن! امارت کے طلب گار نہ ہو، اس لئے کہ اگر تم مانگ کر عہدہ حاصل کروگے، تو تم اسی کے حوالہ کردیئے جاؤ گے، یعنی اللہ کی مدد شریک حال نہ رہے گی، اور اگر بغیر مانگے ذمہ داری سپرد کی جائے تو من جانب اللہ تمہاری مدد ہوگی، (مسلم، باب النہی عن طلب الامارۃ الخ) حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ سے روایت ہے کہ میں اور میرے دو چچا زاد بھائی خدمت نبوی میں حاضر ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو ذمہ داریاں عطا فرمائی ہیں، ان میں سے بعض پر ہمیں مامور فرمادیجئے دوسرے نے بھی یہی بات کہی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''خدا کی قسم! میں ذمہ داری کسی ایسے شخص کے حوالہ نہیں کرسکتا، جو اس کا طلب گار یا اس کا حریص ہو،'' چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ کو اپنے رفقاء کے اس مطالبہ پر خفت ہوئی، اور انہوں نے آپ ﷺ سے معذرت کی، کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ اس طرح کا مطالبہ کرنے آئے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ان دونوں کو تو یہ عہدہ نہیں دے سکتا،

البتہ تم کو ایک ذمہ داری پر متعین کرتا ہوں، پھر ان کو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے ساتھ یمن بھیجا (حوالۂ سابق)

اسی طرح کی بات عہدۂ قضاء کے بارے میں بھی منقول ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جو عہدۂ قضا کا طلب گار ہو وہ اپنے نفس کے داؤ میں آجائے گا۔ اور جو اس عہدہ کے لینے پر مجبور کیا جائے گا، اس کے لئے ایک فرشتہ نازل ہوگا جو اس کو راہِ راست پر قائم رکھے گا، **من سئل القضاء وکل الی نفسه، ومن جبر عليه ينزل عليه ملك يسدده** (ترمذی)

—— معلوم ہوا کہ خود کسی عہدہ کا طلب گار ہونا نہایت ہی قبیح بات ہے، اس سے انسان اللہ کی مدد سے محروم ہو جاتا ہے اور جب مطالبہ کے بغیر لوگوں کے اصرار اور خواہش پر انسان کسی عہدہ کو قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شریکِ حال رہتی ہے، اس لئے اولاً تو کم سے کم مسلمان امیدواروں کا یہ مزاج نہیں ہونا چاہئے کہ عہدہ کی حرص وہوس میں ان کے درمیان اور غیر مسلم لیڈروں کے درمیان کوئی فرق ہی باقی نہ رہے، موجودہ جمہوری نظام کے مفاسد میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں انسان کو خود عہدۂ ومنصب کا طلب گار بننا پڑتا ہے۔ اور چونکہ ہمارا قومی نظام بھی اسی اصول پر مبنی ہے، اس لئے نہ صرف سیاسی انتخابات بلکہ مذہبی جماعتوں اور ملّی تنظیموں میں بھی عہدۂ ومنصب کی طلب کا یہی رویہ عام ہو گیا ہے۔ جو نہایت ہی بدبختانہ بات ہے، تاہم موجودہ سیاسی نظام میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ امیدوار خود الیکشن میں کھڑے ہوں، ان حالات میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ کم سے کم ایسا ہو کہ جب تک عام لوگ الیکشن میں امیدوار بننے کے لئے اصرار نہ کریں اور ان کی طرف سے مطالبہ نہ ہو، امیدوار بننے سے گریز کیا جائے۔

کسی شخص کو ووٹ دینا اس کو اپنا نمائندہ نامزد کرنا ہے، کیسے شخص کو اپنا نمائندہ بنایا جائے اور کس شخص کو کس عہدہ پر مامور کیا جائے؟ اس کے لئے قرآن نے ایک بنیادی بات بتائی ہے کہ جس کو ذمہ داری سپرد کی جائے اس میں دو باتیں ضروری پائی جانی چاہئیں، ایک تو صلاحیت واہلیت دوسرے امانت ودیانت، **انّ خير من استأجرت القوی**

الامین (القصص:۲۶)

صلاحیت سے مراد یہ ہے کہ مجالس قانون ساز میں پہنچنے کے بعد وہ شخص صحیح موقف کی رہنمائی کر سکے، صحیح موقف سے مراد یہ ہے کہ اس کی رائے قرآن وحدیث اور شریعت اسلامی کے مخالف نہ ہو، دوسرے اس میں مسلمانوں کے ملی مفادات کی رعایت ہو، تیسرے اس کی رائے ملک اور ملک کے تمام شہریوں کے لئے خیر خواہی پر مبنی ہو، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس میں شعور و آگہی ہو وہ ضروری حد تک شریعت کے احکام سے واقف ہو، زمانہ شناس اور عصری تقاضوں سے آگاہ ہو، دوسرے اپنی بات کو مؤثر انداز میں اور قانون و منطق کی زبان میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، جرأتِ اظہار ہو، کیوں کہ دلیل کی زبان میں جو بات کہی جاتی ہے وہ بعض اوقات اتنی مؤثر ہوتی ہے کہ ایک شخص کی رائے ایک جماعت کی رائے پر حاوی ہو جاتی ہے۔ یہ سنت نبوی بھی ہے کہ کسی بات کے کہنے کے لئے مناسب شخص کا انتخاب کیا جائے، افسوس ناک بات یہ ہے کہ اکثر اوقات ایسے مسلمان منتخب ہو کر مجالس قانون ساز میں پہونچتے ہیں، کہ خود ان کے شعور آگہی کی سطح بہت پست ہوتی ہے، ان میں مدلل طریقہ پر سوال اٹھانے اور مخالف سوال کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، ظاہر ہے کہ عوام میں جذباتی تقریر کرنا آسان ہے، لیکن دلیل کی زبان میں اپنی بات کو ثابت کرنا اسی قدر دشوار۔

دوسرا ضروری وصف ''امانت و دیانت'' کا ہے، امانت ایک جامع لفظ ہے، یہ صرف مال ہی سے متعلق نہیں ہے، بلکہ انسان کا ہر قول و فعل اس کی وسعتوں میں داخل ہے، فکر و سوچ میں بھی امانت مطلوب ہے، فکر کی امانت یہ ہے کہ انسان قومی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ذاتی مفاد کے بجائے قومی اور ملی مفاد کے پس منظر میں سوچے، امانت زبان سے بھی متعلق ہے، زبان کی امانت یہ ہے کہ سچی اور درست بات کہی جائے، جھوٹ، بہتان تراشی اور اپنی پارٹی اور حکومت کی خوشامد و چاپلوسی سے بچا جائے، قول و عمل میں تضاد نہ ہو، زبان اور دل ایک دوسرے کے رفیق ہوں، اور یقیناً امانت و دیانت کا تعلق مال و متاع سے بھی ہے، ایک زمانہ میں چھوٹے درجہ کے ملازمین کو کرپٹ

اور رشوت خور سمجھا جاتا تھا، لیکن آج لوگوں کو یقین ہے کہ سیاسی قائدین اس میدان میں سب پر سبقت لے گئے ہیں، اگر اسکینڈل اور رشوت خوری بھی فن کہلانے کا مستحق ہے تو ہمارے ملک کے بعض وزراء'' بلکہ وزیر اعظم تک ایسے گذرے ہیں، کہ یقیناً وہ اس بات میں انعام کے مستحق ہیں! جواہر لال نہرو مدتوں وزیر اعظم رہے، لیکن دلّی میں اپنا مکان نہیں بنا سکے، اور چند ہزار روپے بھی ان کے بینک کے کھاتے میں نہیں رہتے تھے، ڈاکٹر راجندر پرشاد دو میقات صدر جمہوریہ رہے لیکن جب پٹنہ واپس ہوئے تو رہنے کو مکان بھی نہیں تھا، اور ''صداقت آشرم'' میں مقیم ہوئے، یہ کوئی قدیم عہد کی نظیریں نہیں، بلکہ ماضی قریب کی مثالیں ہیں، لیکن آج معمولی، ایم، پی، ایم، ایل اے، یہاں تک کہ بلدیہ کا چیرمین اور کاؤنسلر بھی ایسی دادِ عیش دیتا ہے کہ ان کے پرکھوں نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا، یہ محض کرپشن اور رشوت ستانی کی دین ہے، اور سیاسی قائدین کا اس جرم میں ملوث ہونا ایک ''کھلا راز'' ہے۔

رسول اللہ ﷺ جب نبی بنائے گئے تو آپ ﷺ نے لوگوں کے سامنے دین کو پیش کرنے سے پہلے اپنی ذات کو پیش فرمایا اور دریافت فرمایا کہ میں چالیس سال تمہارے درمیان رہا، تم نے مجھے سچا پایا یا جھوٹا، اور امانت دار پایا یا خیانت کرنے والا؟ لوگوں کی زبان پر ایک ہی کلمہ تھا کہ ہم نے آپ ﷺ کو سچا اور امانت دار پایا ہے۔ دراصل ہر اُمیدوار کو اس معیار کا ہونا چاہئے کہ وہ اپنے حلقہ میں لوگوں سے دریافت کر سکے کہ تم نے مجھے کیسا پایا ہے؟ اور اپنی ذات کو ان پر پیش کر سکے، وعدے کرنا، مینوفیسٹو جاری کرنا، اور بلند بانگ دعوے کرنا اور اس بات کی ہمت نہ پانا کہ اپنے آپ کو پیش کر سکیں اور اپنے عمل کی میزان لوگوں کے ہاتھ میں دے سکیں، دل کے چور اور کرداری کی خامیوں اور کوتاہیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

اس دور میں تو یہ شاید ممکن نہ ہو کہ اس معیار پر صد فیصد اترنے والے رہنما مل جائیں، لیکن کم سے کم یہ تو ہو کہ وہ نسبتاً اس معیار سے قریب ہوں، اندھوں کے گاؤں میں کوئی ''کانا'' بھی ہاتھ آجائے، تو شکر ادا کرنا چاہئے۔ اس لئے آج کے بازارِ'' سیاست

میں اگر نسبتاً ''بہتر لوگ میسر آجائیں تو وہی موجودہ اخلاقی گراوٹوں کے پس منظر میں بہتر امیدوار سمجھے جاسکتے ہیں — یقیناً موجودہ حالات میں اس طرح کی باتیں ایک خواب محسوس ہوتی ہیں، اور اجنبی سی لگتی ہیں، مگر مسلمانوں کا کام یہ نہیں کہ وہ چڑھتے ہوئے سورج کے پرستار بن جائیں، اور حق و صداقت کے داعی بننے کے بجائے اس بھیڑ کے ساتھ ہو جائیں جو باطل اور جھوٹ کا علم اٹھائے ہوئے ہو!

(۴ر ستمبر ر ۱۹۹۹ء)

الیکشن میں امیدوار ہونے کے لئے قلیل العیال ہونے کی شرط

اس وقت ریاست آندھرا پردیش میں پنچایت الیکشن کی آمد آمد ہے، حکومت نے اس بار الیکشن کے لئے ایک نیا قانون متعارف کرایا ہے، کہ الیکشن میں وہی لوگ حصہ لے سکیں گے جن کے دو سے زیادہ بچے نہ ہوں، گویا الیکشن کو فیملی پلاننگ کے لئے ایک ذریعہ اور وسیلہ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ نہایت ہی نا منصفانہ اور نا معقول اصول ہے، اور کسی طرح اس کا جواز نہیں، اولاً تو یہ بات دیکھنے کی ہے کہ کیا الیکشن کے سلسلہ میں یہ اصول ملک کے دستور اور عقلِ عام کے تقاضے کے مطابق ہے؟ دوسرے کیا الیکشن میں اس طرح کی قیود و حدود واقعی فیملی پلاننگ کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مؤثر اور مفید ہے؟ تیسرے خود فیملی پلاننگ کا نظریہ کس حد تک عقل اور قانونِ فطرت کے مطابق ہے؟

جہاں تک اس قانون کی معقولیت کی بات ہے تو الیکشن میں کھڑے ہونے کا مقصد قوم کی اجتماعی خدمت کا فریضہ انجام دینا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ انسان کے اندر انتظامی صلاحیت اور دیانت ہو، انتظامی صلاحیت کا تعلق انسان کے فہم، سمجھ بوجھ، دماغی صلاحیت اور قوت فکر سے ہے، اور دیانت کا تعلق انسان کے قلب و ضمیر، جذبۂ خدمت اور خلوص سے ہے، اسی لئے قرآن مجید نے بہترین ورکر اس شخص کو قرار دیا ہے جو قوی اور امین ہے، ''ان خیر من استاجرت القوی الامین'' (القصص:۲۶) ''قوی'' سے مراد باصلاحیت اور مفوضہ کام کی اہلیت کے مطابق ہونا ہے۔ اور ''امین'' سے اشارہ امانت و دیانت کی طرف ہے، حقیقت یہ ہے کہ قیادت کے لئے اس سے بہتر کوئی معیار نہیں ہوسکتا

، بلکہ اس کے سوا کوئی معیار ہی نہیں ہو سکتا، اس لئے اگر انتخابی قوانین میں تعلیم کے ایک خاص معیار کی شرط ہوتی یا کردار کی پاکیزگی ملحوظ ہوتی، مجرمانہ ریکارڈ رکھنے والوں کو اور جاہل اور کندۂ ناتراش قسم کے نیتاؤں کو روکنے کی سعی کی جاتی تو یہ یقیناً ایک معقول اور مناسب بات ہوتی، لیکن اس کو بچوں کی تعداد سے متعلق کر دینا ایک ایسا معیار ہے جو عقل اور فطرت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا، کیا دو اور اس سے کم اولاد والے زیادہ سمجھ دار، دیانت دار، معاملہ فہم اور جذبۂ خدمت کے حامل ہوتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔

پھر غور کیجئے کہ دستور وآئین اور جمہوری روایات سے اس کا کیا تعلق ہے؟ دستور تمام بالغ مردوں اور عورتوں کو الیکشن میں امیدوار بننے کا یکساں حق عطا کرتا ہے، اس جمہوری تقاضا کو اتنی وسعت دی گئی ہے کہ جو لوگ کھلے ہوئے مجرمانہ ریکارڈ رکھتے ہیں، پولیس کے نامزد مجرم ہیں، اور جنہوں نے رشوت ستانی کی ایک تاریخ بنائی ہے، انہیں بھی الیکشن میں امیدوار بننے سے روکا نہیں جا سکتا، تو آخر یہ کیسا انصاف ہوگا کہ ایک شخص کو محض اس لئے الیکشن میں امیدوار بننے سے روکا جائے کہ اس کے بچے زیادہ ہیں، اور اتفاق سے اولاد کے بارے میں قدرت اس پر زیادہ مہربان ہے؟ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ملک کا دستور وآئین بھی ایسے قوانین کے حق میں نہیں ہیں۔

الیکشن میں امیدوار بننے والوں کا تناسب بہت ہی معمولی ہوتا ہے، ان کی تعداد عام لوگوں کے مقابلہ ایک فی لاکھ سے زیادہ نہ ہوگی، اگر آبادی میں ایسے چند افراد چند بچوں پر قناعت کر لیں، تو اس سے اس مقصد کے حاصل کرنے میں کوئی خاص مدد نہیں ملے گی، اس کے برعکس اندیشہ یہ ہے کہ اس سے بہت سے مفاسد جنم لیں گے، ممکن ہے لوگ اپنی اولاد کے سلسلہ میں غلط حلف نامے داخل کریں، اور اس کو بنیاد بنا کر آئندہ مقدمہ بازیاں ہوں، بھائی بھائی کے رشتہ کا انکار کرے، جائز اولاد ناجائز قرار دی جائے، مال وزر کی حرص وطمع میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ اپنے ہی بھائی کے نسب کا انکار کر دیا جاتا ہے، اس لئے حکومت جو کچھ چاہتی ہے اس مقصد کے لئے بھی یہ کوئی مفید اقدام نہیں، مزید اندیشہ یہ ہے کہ حکومت اپنی اس پالیسی کو وسعت دیتے ہوئے دوسرے شعبوں میں

بھی اسی طرح کے قوانین نافذ کرے، تو اگر ملازمتوں اور حکومت کے وسائل سے استفادہ کی صورتوں میں بھی یہ پالیسی اختیار کی گئی، تو یہ نہایت ہی نقصان دہ بات ہوگی، اس سے حق داروں کی حق تلفی ہوگی، اور ملک کی لگام نااہل لوگوں کے ہاتھ میں چلی جائے گی، اور کسی بھی ملک اور قوم کے لئے اس سے زیادہ مضرت رساں بات اور کیا ہوسکتی ہے؟

خود فیملی پلاننگ ایک ایسا نظریہ ہے جس کو تجربات اور واقعات نے رد کر دیا ہے، جو لوگ اس نظریے کے بانی اور مؤسس تھے، ان کے قیاس کی رو سے اس وقت دنیا کو دانہ دانہ کا محتاج ہونا چاہئے تھا، اور انسانیت کے بہت بڑے حصہ کو فاقوں پر گذر کرنی چاہئے تھی، لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا، بلکہ پوری دنیا میں فی کس آمدنی میں اضافہ ہو رہا ہے، پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک میں بھی معیارِ زندگی بلند ہوا ہے، کھانے پینے، لباس و پوشاک، سواری اور زندگی کے ہر شعبہ میں زیادہ راحت بخش وسائل کا استعمال بڑھا ہے، زمینوں کی پیداوار میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے، اور اگر مغربی ممالک اپنی زراعتی ٹکنالوجی ترقی پذیر ممالک کو فراہم کریں تو زرعی وسائل میں ناقابلِ تصور اضافہ ہوسکتا ہے، جو انسان کی سب سے زیادہ بنیادی ضرورت ہے۔ اور ایسا سبز انقلاب رونما ہوسکتا ہے جو کسی شخص کو بھوکے پیٹ نہ سلائے۔ گذشتہ سوڈیڑھ سو سال میں بعض ایسے قدرتی وسائل بھی انسانوں کی گرفت میں آئے ہیں، جنھوں نے صحراؤں اور ریگستانوں کو باعث رشک کر دیا ہے، کیا قدرت کی اس فیاضی کے باوجود فیملی پلاننگ کا نظریہ کوئی معنویت رکھتا ہے؟ اور اس کو قانونِ فطرت سے ہم آہنگ قرار دیا جاسکتا ہے؟۔

ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ آج دنیا میں ہمارے ملک کو جو اہمیت حاصل ہے، یا حاصل ہوتی جارہی ہے، اس کی بنیاد کیا ہے؟ یہ بات کیوں کہی جاتی ہے کہ ہم دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہیں؟ ترقی یافتہ ممالک اپنی سرمایہ کاری کے لئے ہماری طرف کیوں متوجہ ہیں؟ اور ملٹی نیشنل کمپنیاں کیوں ہماری دلداری کرتی ہیں؟ اسی لئے کہ یہ آبادی کے اعتبار سے بہت بڑا ملک ہے، یہ اشیاء کی کھپت کے لحاظ سے بہت بڑی مارکیٹ ہے، یہ افرادی وسائل کے اعتبار سے بہت خوش قسمت خطہ ہے، پوری دنیا کو یہاں سے ماہرین

ملتے ہیں، اور ہر جگہ یہاں کے محنتی اور ذہین مزدور، ورکرس اپنے وجود کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں، اگر شرح پیدائش پر بہت زیادہ کنٹرول ہوجائے اور افرادی وسائل ہمارے پاس کم ہوجائیں تو ہم کس طرح اس اہمیت کو برقرار رکھ سکیں گے؟۔

اسلامی نقطۂ نظر اس سلسلہ میں دو اور دو چار کی طرح واضح ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا صرف خالق ہی نہیں بلکہ وہ اس کا رب اور پالنہار بھی ہے، کائنات کے ایک ایک ذرہ پر اس کی نظر ہے، وہ ایک منصوبہ کے ساتھ آبادی کو بڑھاتا اور گھٹاتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ رزق کے خزانے ہمارے پاس ہیں، اور ہم اس کو ایک متعین مقدار میں عطا کرتے ہیں: ''وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ'' (الحجر:۲۱) یعنی اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی ضرورت کے لحاظ سے غذائی وسائل فراہم کرتے رہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ دنیا میں کتنے ہی جانور ایسے ہیں، کہ بہ ظاہر ان کی روٹی روزی کا کوئی سامان نہیں، لیکن یہ اللہ کی رزق رسانی کا کرشمہ ہے، کہ وہ تم جیسے قوتِ عمل اور فہم وشعور کی حامل مخلوق کو بھی رزق دیتا ہے اور ان کو بھی: ''اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ'' (العنکبوت:۶۰) قرآن نے ایک موقع پر یہ بات بڑی وضاحت سے کہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی چاہت کے مطابق رزق کا سروسامان فراہم فرماتے ہیں، کیوں کہ وہ اپنے بندوں سے ہر آن باخبر ہیں، اور انہیں دیکھ رہے ہیں، ''وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌ بَصِيْرٌ'' (الشوریٰ:۲۷)

جب انسان اپنی کوتاہ عملی اور اپنی فکر ونظر کی محدودیت کے باوجود ایک نظام کے ساتھ ہر کام انجام دیتا ہے، اور دنیا کی حکومتیں اپنی رعایا کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بجٹ بناتی ہیں تو کیا خدائے علیم وبصیر اور رزاق وقدیر کو اپنے بندوں کی ضرورت اور کائنات میں اس کے پیدا کئے ہوئے وسائل کا کچھ اندازہ نہ ہوگا؟۔

(۹ رستمبر ۲۰۰۰ء)

خواتین کے لئے تحفظات ـــــ اسلامی نقطۂ نظر

اس وقت ہمارے ملک میں مجالس قانون ساز میں خواتین کے لئے تحفظات کا مسئلہ پورے ملک میں موضوعِ بحث بنا ہوا ہے۔ ذرائع ابلاغ کچھ ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ گویا اس مسئلہ کے حل ہوتے ہی قوم کی تقدیر بدل جائے گی، اور ملک کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے، جو سیاسی قائدین اس تجویز کو مناسب نہیں سمجھتے، خواہ یہ مناسب نہ سمجھنا ملک کے فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے ہو یا رائے عامہ کے دباؤ سے، وہ بھی کھلے عام اس تجویز کی مخالفت سے ڈر رہے ہیں اور دبے لفظوں میں شکوک و شبہات کا اظہار کر رہے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اگر یہ تجویز قانون بن جاتی ہے تو مستقبل کی سیاست پر اس کے دور رس اثرات مرتب ہوں گے، پسماندہ اقوام اور اقلیتوں کے لئے یہ ضرب کاری کا درجہ رکھتی ہے، ان طبقات میں خواتین کا تعلیمی تناسب اتنا معمولی ہے کہ بظاہر مناسب خاتون اُمیدواروں کا ملنا دشوار ہے، پھر جو خواتین منتخب ہوں گی، وہ پالیمنٹ میں کما حقہ ان کمزور طبقات کی ترجمان کر سکیں، یہ اس سے زیادہ دشوار ہے۔ یہ بات بھی بعید نہیں کہ سیاست میں حصہ لینے والی خواتین کے خلاف جرائم کا رجحان بڑھ جائے، جیسا کہ پچھلے دنوں مغربی بنگال میں ہوا ہے، کیوں کہ آج کل سیاست میں پڑھے لکھے اور باکردار افراد کی بجائے شر پسند عناصر اور کندۂ ناتراش قسم کے لوگوں کا غلبہ ہے، بڑا لیڈر بننے کے لئے اسی درجہ کا غنڈہ اور مکر و فریب کا ماہر ہونا بھی ضروری ہے، ایسے لوگ احساسِ محرومی کا شکار ہو کر ان خواتین کو اپنا نشانہ بنائیں جو سیاست میں ان کی رقیب بنتی ہوں، تو کچھ عجیب نہیں۔

اگر واقعی سیاست داں عورتوں کے مسائل کو حل کرنے اور ان کی مسیحائی کرنے میں سنجیدہ ہیں، تو اس کا صحیح طریقہ الیکشن میں تحفظات نہیں، بلکہ ان کی حقیقی مشکلات کو دور کرنا ہے، اگر ملک بھر سے سوڈیڑھ سو خواتین پالیمنٹ میں پہنچ جائیں، تو یقیناً ان میں نوے فیصد

وہ خواتین ہوں گی جو متمول اور صاحب ثروت خاندانوں سے تعلق رکھتی ہوں۔ وہ نہ غریب ومفلس عورتوں کے دُکھ درد سے واقف ہیں اور نہ ان کی سماجی مشکلات سے آگاہ، اس لئے کہ عام طور پر ظلم و جور کا شکار وہ خواتین ہوتی ہیں، جو خط غربت سے نیچے ہیں یا زیادہ سے زیادہ متوسط الحال ہیں، نہ ان کے پاس دولت ہے، نہ تعلیم اور نہ خاندانی پس منظر۔

خواتین کی حالات کو بہتر بنانے کے لئے صحیح راستہ یہ ہے کہ ان کے لئے زیادہ سے زیادہ تعلیمی وسائل فراہم کئے جائیں۔ یتیم لڑکیوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کا مفت انتظام کیا جائے، ایسی بچیوں کے لئے ہوسٹل قائم کئے جائیں، بیوہ اور مطلقہ عورتوں کے لئے خصوصی وظائف جاری کئے جائیں، تاکہ وہ عزت کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکیں، مخلوط تعلیم کے بجائے جداگانہ نظامِ تعلیم کی حوصلہ افزائی کی جائے، تاکہ لڑکیاں اپنے آپ کو جس نفسانی دباؤ کا شکار پاتی ہیں، وہ اس سے آزاد رہ سکیں۔ عورتوں کے لئے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ شادی میں گھوڑے جوڑے کی رسم ہے، اس کو روکنے کی مؤثر کوشش کی جائے۔ فسادات اور دنگوں میں اکثر عورتوں کی جان جاتی ہے، ایسے واقعات پر خصوصی ایکشن لیا جائے۔ لڑکیوں کی شرح پیدائش کم کرنے کے لئے قبل از وقت اسقاطِ حمل کی تدابیر میں بھی اضافہ ہو رہا ہے، اس کو روکا جائے۔ بہت سے لوگ بہنوں اور بیٹیوں کو میراث سے محروم کر دیتے ہیں، اس کا سدِ باب کیا جائے۔ یہ اور اس طرح کے سماجی مسائل ہیں جو خواتین کی حقیقی مشکلات ہیں، ان کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔ ان مشکلات کو حل کرنا خواتین کی ایک بڑی تعداد کے مسائل کو حل کرنے کی سنجیدہ کوشش ہوگی، ورنہ پالیمنٹ میں خواتین کی نمائندگی کا بڑھ جانا چند عورتوں کے مسائل کا حل تو ہو سکتا ہے، لیکن یہ عمومی طور پر نہ خواتین کے لئے مفید ہے اور نہ ہمارے سماج کے لئے۔

جہاں تک مجالس قانون ساز میں تحفظات کی بابت اسلامی نقطۂ نظر کی بات ہے، تو عہدوں اور ذمہ داریوں کے بارے میں اسلام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ اہلیت اور صلاحیت کو دیکھا جائے اور اسی کو بنیاد بنا کر ذمہ داریاں سپرد کی جائیں۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کی علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ امانتیں ضائع کی جانے لگیں۔

حضرات صحابہؓ نے عرض کیا کہ امانتوں کے ضائع کرنے سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو جس کام کا اہل نہ ہو اس کو وہ کام سپرد کیا جائے ـــ ''اذا وسد الامر الی غیر اھلہ''۔ (بخاری: ۱/۱۴)

یہ نہایت بنیادی اور اہم بات ہے۔ کوئی بھی شعبہ ہو، اس کے کام اور انتظام میں اصل بگاڑ اسی سے پیدا ہوتا ہے کہ ذمہ داریوں کی تقسیم میں صلاحیت اور اہلیت کے بجائے رشتہ داریاں، قرابت مندیاں، حیثیت عرفی، شخصی و سیاسی مفاد کی توقع، کوئی عہدہ نہ دینے کی صورت میں اس سے نقصان اور مضرت کا اندیشہ، ذات برادری، علاقۂ وطن وغیرہ کو معیار بنایا جائے۔ مثلاً ہمارے ملک میں اعلیٰ تعلیم کے بعض شعبوں میں ذات پات کی بناء پر ریزرویشن ہے، اس ریزرویشن کے نتیجہ میں بعض حضرات ستر اور اسی فیصد نمبر لا کر بھی داخلہ سے محروم رہتے ہیں اور جن لوگوں کو تحفظات حاصل ہیں، اگر ان میں امیدوار کم ہیں تو پچیس فیصد نمبر لانے کے باوجود داخلہ کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ جب ایسے لوگ ڈاکٹر اور انجینئر بنیں گے اور قوم کو تختۂ مشق بنائیں گے، تو یہ ملک و قوم کے مفاد میں ہوگا یا ان کی تباہی و بربادی کا باعث بنے گا؟ یہ محتاجِ اظہار نہیں۔

ہندوستان کی خواتین میں تعلیمی تناسب بہت کم ہے اور جو کچھ ہے وہ شہروں میں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ سوسائٹی سے زیادہ میل جول نہیں رکھ سکتیں، اس لئے فطری بات ہے کہ سماج کے حالات سے وہ نسبتاً کم واقف ہوتی ہیں، پھر مشترکہ مجمع میں خواتین کے لئے اپنے مافی الضمیر کا اظہار دشوار ہوتا ہے، ان حالات میں خواتین کو نمائندہ بنانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سماجی مشکلات اور بالخصوص دیہات و قریہ جات کے مسائل کی صحیح طور پر ترجمانی نہیں ہو سکے گی، نیز مخلوط ماحول میں ان کے لئے کام کرنا اخلاقی نقطۂ نظر سے خود ان کے لئے دشواری کا باعث ہوتا ہے، جیسا کہ آفسوں اور دفتروں میں تجربہ ہے۔ اس لئے درحقیقت بنیادی طور پر تحفظات کا تصور ہی غلط تصور ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ عہدہ داروں کے انتخاب میں تعصب کے رویہ کو ختم کیا جائے، تمام قوموں کو مساوی طور پر ترقی کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں، نہ یہ کہ کوئی شخص کسی ذمہ داری کا اہل ہو یا نہ ہو،

اس کو وہ ذمہ داری سونپ دی جائے۔ کسی طبقہ کا کمزور ہونا یا اس کے ساتھ ظلم وزیادتی کے واقعات کا نسبتاً زیادہ پیش آنا، اس بات کا جواز پیدا نہیں کرتا کہ ملک وقوم کی باگ ڈوران کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ اگر ذمہ داریاں سپرد کرنے کے لئے ایسی باتوں کو معیار بنایا جائے، تو پھر بتدریج معذوروں اور اپاہجوں کے لئے بھی کچھ تحفظات دینے ہوں گے اور سن رسیدہ اور معمرلوگوں کا بھی ایک کوٹہ رکھنا ہوگا۔

اس لئے اسلام بنیادی طور پر تحفظات کے فلسفہ ہی کا قائل نہیں ہے۔ جہاں تک خواتین کی بات ہے، تو اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ سماج میں مردوں اور خواتین کا دائرہ کار الگ الگ ہے۔ گھر سے باہر کی سرگرمیاں مردوں کے ذمہ ہے اور عورتوں کا منصب یہ ہے کہ وہ اپنے گھر ہی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں۔ (الاحزاب: ۳۳) اس لئے نفقہ وکفالت اور کسب معاش کی ذمہ داری مردوں کے سر رکھی گئی اور بال بچوں کی پرورش و پرداخت کا حق دار عورتوں کو قرار دیا گیا۔ مردوں کو جہاد کا حکم دیا گیا اور بہترین عورت اس بیوی کو قرار دیا گیا جو شوہر کی عدم موجودگی میں اس کے مال اور اپنی عصمت کی حفاظت کرے۔ مردوں کے لئے جماعت سے نماز واجب قرار دی گئی اور عورتوں کے لئے گھر کی نماز کو ترجیح دی گئی۔ اس لئے اُصولی طور پر اسلام بیرونی زندگی میں عورتوں کے لانے کو صحیح نہیں سمجھتا، بلکہ اس کو عورتوں کے لئے ظلم اور اس کی صحیح حیثیت اور پوزیشن پر زیادتی تصور کرتا ہے۔

بعض حلقوں سے یہ بات اٹھائی جاتی ہے کہ خواتین کو اس طرح کے سیاسی اور سماجی کاموں سے روکنا ''عدل'' کے خلاف ہے، بعض حضرات خیال کرتے ہیں کہ اسلام نے مردوں اور عورتوں کو ''برابر'' کا درجہ دیا ہے، یہ محض مولویوں کا ڈھکوسلا ہے کہ وہ خواتین کو آگے بڑھنے دینا نہیں چاہتے، لیکن یہ محض غلط فہمی کی باتیں ہیں۔ اسلام مردوں اور عورتوں میں مساوات کا نہیں ''عدل'' کا قائل ہے، عدل کے معنی برابری کے برتاؤ کے نہیں ہیں، بلکہ عدل سے یہ مراد ہے کہ جو جس صلاحیت کا حامل ہو اسی کے مطابق اس کی ذمہ داری بھی مقرر کی جائے، جیسے مریض مرغن غذاؤں کا متحمل نہیں ہوسکتا اور صحت منداسے ہضم کرسکتا ہے، مریض کو سادہ غذا دینا مساوات تو نہیں کہلا سکتا، لیکن عدل یہی ہے، کیوں کہ ہر شخص کے لئے

وہی غذا بہتر ہوسکتی ہے جو صحت کے اعتبار سے اس کے لئے موزوں اور قابل برداشت ہو۔ کسی کلینک میں ایک ڈگری یافتہ ڈاکٹر اور ایک ناخواندہ مزدور پہنچیں تو ڈاکٹر کا تقرر بحیثیت طبیب ہوگا اور مزدور کا بحیثیت جاروب کش۔ ظاہر ہے یہ مساوات نہیں ہے، لیکن یہی تقاضۂ عدل ہے اور اسی میں سماج کا مفاد ہے۔

اسلام میں مردوں اور عورتوں کے درمیان عدل کا قائل ہے نہ کہ مساوات کا، یعنی مردوں اور عورتوں کے درمیان فطری طور پر صلاحیتوں کا فرق پایا جاتا ہے، بعض صلاحیتیں مردوں میں زیادہ ہیں، جیسے جسمانی مشقت، دوڑ دھوپ، شجاعت و بہادری، جرأت و بے باکی، قوتِ فیصلہ، اقدامی صلاحیت اور مدافعت کی طاقت۔ عورتیں جسمانی اعتبار سے کمزور ہوتی ہیں، قوتِ فیصلہ بھی ان میں کم ہوسکتی ہے، اسی لئے طبی اعتبار سے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ عورتوں کے دماغ کا حجم مردوں سے کم ہوتا ہے، مردوں کا مغزِ دماغ عورتوں کی بہ نسبت سوگرام زیادہ ہوتا ہے، مردوں کے دماغی حجم کا تناسب اس کے جسم سے ایک اور چالیس کا، عورتوں کا ایک اور چوالیس کا ہوتا ہے۔ قلب جو زندگی کا مرکز ہے، عورتوں کا مرد کے مقابلہ ساٹھ گرام چھوٹا ہے، بعض طبی ماہرین کا خیال ہے کہ مردوں اور عورتوں کے جسمانی قویٰ میں کم سے کم ایک تہائی کا فرق ہوتا ہے۔

جہاں بعض اوصاف اور صلاحیتوں میں مردوں کو تفوق حاصل ہے، وہیں بعض پہلوؤں سے عورتوں کو مرد پر فوقیت حاصل ہے۔ عورتوں میں حیاء کا غلبہ ہوتا ہے، محبت کا عنصر زیادہ ہوتا ہے، وہ زیادہ حساس ہوتی ہیں، لطافت و نزاکت سے بھی قدرت نے عورتوں کو زیادہ حصہ دیا ہے، عورتوں میں جذب و کشش زیادہ ہے اور اسی باعث دہ مردوں کے قلب و ذہن پر بھی چھا جانے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتی ہیں۔ صلاحیتوں کے اسی فرق کی وجہ سے اسلام نے اندرونِ خانہ کی ذمہ داریاں عورتوں کو سپرد کی، کہ وہ اپنی اولاد کو، اپنے شوہر کو، بھائی بہنوں اور اہلِ خاندان کو جو تحفۂ محبت دے سکتی ہیں اور گھر میں محبت وسکون کی فضاء کو قائم رکھ سکتی ہیں، وہ مرد نہیں کرسکتا اور بیرونِ خانہ کی جد و جہد اور جانفشانیوں کو جس طرح مرد انجام دے سکتا ہے، عورتیں انجام نہیں دے سکتیں۔

یہ ایک فطری تقسیم ہے اور اس میں خاندانی نظام کا بقا ہے۔ مغربی معاشرہ میں خاندانی نظام کا کوئی وجود باقی نہیں رہا۔ اس بکھراؤ نے ان کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ مرد ہو یا عورت، نہ ان کو گھر کے اندر سکون نصیب ہے اور نہ گھر سے باہر، اسی لئے مغربی سماج میں منشیات عام ہے، جرائم کا رجحان روز افزوں ہے اور لوگ امن وسکون کی دولت کے لئے اسی طرح بے چین ہیں جیسے سخت دھوپ میں خوب پیاسا آدمی ٹھنڈے پانی کے لئے۔

پس، کیا ہم مغرب سے ان کی بے سکونی اور اضطراب و بے چینی کو خرید کرنا چاہتے ہیں؟۔

(۱۷؍جولائی ۱۹۹۸ء)

مردم شماری میں حصہ لینا — ایک اہم دینی فریضہ!

سیرت نبوی ﷺ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر عہد میں اسلام کی تائید و تقویت اور مسلمانوں کے ملی وجود کی حفاظت کے لئے تمام اسباب اختیار کرنے چاہئیں، جو اس زمانہ میں مروج ہوں، اور ان میں شریعت کے خلاف کوئی بات نہ ہو، رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں بہ کثرت اس کی مثالیں موجود ہیں، آپ ﷺ نے دعوتِ توحید کے لئے پہلی دفعہ صفا کی پہاڑی کا انتخاب کیا، اور وہاں جا کر اہلِ مکہ کو اکٹھا کر کے اپنی بات کہی، یہ کوئی اتفاقی انتخاب نہ تھا، بلکہ پہلے سے اہلِ مکہ کا طریقہ چلا آرہا تھا، کہ کسی اہم بات کی اطلاع دینے کے لئے اسی مقام پر کھڑے ہو کر لوگوں کو بلاتے تھے، گویا یہ اس زمانے کا ذریعۂ ابلاغ تھا، اور مکہ شہر کی حد تک اس سے زیادہ وسیع الاثر کوئی اور ذریعۂ ابلاغ موجود نہیں تھا، عرب میں دو ایسے اجتماعات ہوتے تھے، جن میں پورا جزیرۃ العرب امڈ آتا تھا، ایک حج اور دوسرے عکاظ کا تجارتی میلہ۔ ان دونوں اجتماعات میں بہت سی منکرات اور فواحش کا ارتکاب کیا جاتا تھا، حج میں تو بہر حال ایک پہلو عبادت کا بھی تھا، گو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصل اسوہ میں بہت کچھ آمیزشیں کر دی گئی تھیں، لیکن عکاظ کے میلے کی نوعیت مذہبی نہیں تھی، اس کے باوجود آپ ﷺ ''کل عرب سطح'' کے ان دونوں اجتماعات میں جاتے، اور لوگوں پر دعوت اسلام پیش فرماتے، کیونکہ اس وقت اس سے زیادہ موثر، زود رفتار اور وسیع الاثر کوئی اور میڈیا نہیں تھا۔

عربوں کا ایک قدیم قبائلی نظام تھا، جس کے مطابق قبیلہ کے ایک شخص کو پورے قبیلہ کی پناہ حاصل ہوتی تھی، اور اگر قبیلہ کے ایک شخص کے خلاف بھی کوئی زیادتی کی جاتی تو پورا قبیلہ اسے اپنے آپ پر حملہ تصور کرتا تھا، آپ ﷺ بنو ہاشم میں تھے، اور اس وقت اس قبیلے کی قیادت ابو طالب کے ہاتھ میں تھی، جو آپ کے چچا تھے، لیکن اولاد سے بڑھ کر آپ

سے محبت رکھتے تھے، اس لیے باوجودیکہ بنو ہاشم کی اکثریت ابھی مسلمان نہیں ہوئی تھی اور ابولہب جیسا بدترین دشمنِ اسلام اسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، لیکن اس کے باوجود ابوطالب کی وجہ سے آپ کو اس خاندان کی ایسی حمایت وحفاظت حاصل رہی کہ شعب ابی طالب جیسے دل گداز اور صبر آزما واقعہ میں بھی بنو ہاشم نے آپ ﷺ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اور عرب کے اس قبائلی پناہ دہی اور پناہ گیری کے نظام سے آپ نے بھرپور فائدہ اٹھایا، اسی طرح آپ کے سب سے جاں نثار رفیق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ابن الدغنہ کی پناہ حاصل کرنے میں کوئی تکلف نہیں برتا۔

مدینہ جانے کے بعد آپ ﷺ نے مسلمانوں، یہودیوں اور مشرکین کے درمیان بقاء باہم اور مدینہ کے مشترکہ دفاع کا ایسا معاہدہ کرایا جو اسلام کے سیاسی تصورات کے لئے نشانِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ اس معاہدہ کے مطابق مدینہ کے غیر مسلم قبائل کو عقیدہ و مذہب کی آزادی دی گئی، ایک دوسرے کی جان و مال کے احترام کا سبق دیا گیا، اور بہ وقت ضرورت غیر مسلموں کے ساتھ مل کر کسی علاقہ کی حفاظت اور دفاع کو قبول کیا گیا، اسی طرح فتح مکہ سے پہلے متعدد ایسے مشرک قبائل جو اس وقت تک اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے، سے آپ ﷺ نے ناجنگ معاہدہ کیا، بلکہ مشکل وقتوں میں بہ حیثیت حلیف ایک دوسرے کی مدد کرنے کے معاہدے بھی کئے۔ بہ ظاہر اسلام میں ''موالات'' وغیرہ کے سلسلہ میں جو احکام ہوسکتا ہے کہ بادیٔ النظر میں یہ معاہدات اس کے خلاف محسوس ہوں، لیکن دراصل ان سب میں ایک ہی روح کارفرما ہے، کہ ہر عہد کی ضرورت، تقاضہ اور رسم و رواج کے مطابق اسلام کو سربلند کرنے اور امتِ مسلمہ کو تقویت پہونچانے کی کوشش کی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے کہا کہ اعداءِ اسلام کے مقابلہ میں قوت بھر تیاری کرو، ''**اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ**'' (الانفال: ۶۰) کیا اس کا مطلب صرف اسلحہ اور جنگی طاقت کا فراہم کرنا ہے؟ غالباً ایسا نہیں ہے، بلکہ ہر طرح کی طاقت اس میں داخل ہے، کبھی علم کی طاقت ہتھیار کی طاقت پر فائق ہوتی ہے، جس کی مثال آج جاپان ہے۔ کبھی سیاسی طاقت

کے ذریعہ قوموں کی تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں، ہندوستان میں برہمن ازم اسی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ کبھی معاشی طاقت کی بنیاد پر انگلیوں پر گنی جانے والی قوم پوری دنیا کو اپنے چشم و ابرو کا قبع بنا کر رکھتی ہے، جیسا کہ اس وقت صیہونی طاقت کا حال ہے۔ غرض کہ ہر عہد میں اس عہد کی ضرورت کے مطابق اپنی طاقت کو بڑھانا اس طاقت کو مذہب وملت کی سربلندی کے لئے استعمال کرنا اور ظالموں کے تسلط سے بچنے کے لئے اس کو ڈھال اور نیام بنانا امت کا فریضہ اور رسول اللہ ﷺ کا اسوہ ہے۔

آج کی دنیا میں معیار کے ساتھ ساتھ تعداد ومقدار کی بھی بڑی اہمیت ہے، اس سے کسی قوم کا سیاسی مقام متعین ہوتا ہے، نظام مملکت کے نقشہ میں اس کی اہمیت محسوس کی جاتی ہے، جو زبان کسی علاقہ میں بولی جاتی ہو، اس زبان کی قدر و قیمت بھی بولنے والوں کی تعداد پر منحصر ہے' اسی پس منظر میں تمام ہی ممالک میں اور خاص کر جمہوری ملکوں میں مردم شماری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستان میں اس وقت ۹ رفروری سے چھٹی مردم شماری کا آغاز ہو چکا ہے۔ جو ۲۸ رفروری تک جاری رہے گی، اور یکم مارچ نظر ثانی اور تبدیلی کی مہلت ہوگی۔ اس مردم شماری پر ایک ہزار کروڑ روپے خرچ ہوں گے، اس بار مردم شماری نسبتاً زیادہ تفصیل سے عمل میں آرہی ہے۔ جس میں مذہب، زبان اور معاشی حالات کے علاوہ معذورین اور ان کے حالات بھی مرکز توجہ ہوں گے، اور ان ہی اعداد و شمار کی روشنی میں ملک میں آئندہ سیاسی، تعلیمی اور معاشی منصوبہ بندی ہو سکے گی۔

اردو ہماری مادری زبان ہے، اور عربی زبان کے بعد کوئی زبان نہیں، جس میں علوم اسلامی کا اتنا بڑا سرمایہ موجود ہو، بلکہ بعض موضوعات پر اردو میں ایسی کتابیں بھی آچکی ہیں، کہ شاید عربی میں بھی اس جیسی کتاب نہ ہو، فارسی حالانکہ صدیوں سے مسلمانوں کی زبان ہے، اور ایک بہت بڑا ذخیرہ فارسی زبان میں ہے، لیکن اردو نے صرف ڈیڑھ دو سو سال میں نہ صرف فارسی کی برابری حاصل کرلی، بلکہ اسلامی فکر وعقیدہ، علم وعمل اور تہذیب وثقافت کی نمائندگی میں غالباً فارسی سے بہت آگے جا چکی ہے، بدقسمتی سے آزادی کے بعد سے مسلسل اردو لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے، اور اس لئے حکومت کو بھی اردو

کی طرف سے دانستہ تغافل کا بہانہ ہاتھ آ رہا ہے، مردم شماری میں اگر ہم اہتمام کے ساتھ مادری زبان کی حیثیت سے اردو کا نام لکھائیں اور اعداد و شمار اسباب کو واضح کر دے کہ اردو بولنے، سمجھنے، لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے، تو اس سے ہمیں اپنی زبان کی حفاظت میں سہولت بہم پہونچے گی، اور ہماری اگلی نسلوں کو اپنے سلف کے اتنے عظیم الشان علمی اور دینی سرمایہ سے محروم نہیں کیا جا سکے گا۔

اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ حالات میں مردم شماری میں حصہ لینا مسلمانوں کا ایک اہم ترین فریضہ ہے، اور یہ اپنے حقوق کی حفاظت اور حق تلفی کی مدافعت کی بے جا کوششوں کی ایک آئینی تدبیر ہے، اگر ہم نے اس موقع پر غفلت کی اور کوتاہی سے کام لیا، تو خاص کر موجودہ حالات میں یہ بہت ہی خسران کی بات ہوگی، اور اپنی طاقت کے ضائع کرنے اور اپنی قیمت آپ گرانے کے مترادف ہوگا۔

یوں مردم شماری کا تصور بہت قدیم ہے، چونکہ اس سے عوام کے مسائل کو سمجھنے اور خاص کر عوام کے مسائل کا جائزہ لینے میں مدد ملتی ہے، بائبل میں ہے کہ " پہلی اسم نویسی سوریا کے حاکم رکوِ رینیس کے عہد میں ہوئی، اور سب لوگ نام لکھوانے کے لئے اپنے اپنے شہر کو گئے" (توما:۲،۲/۳) یہ واقعہ حضرت مسیح کی ولادت سے پہلے کا ہے۔ لیکن غالباً اس کا تعلق سلطنت روما یا یہودا کی آبادی سے ہے، مردم شماری تو اس سے پہلے بھی ہوئی ہوگی، کیوں کہ بائبل کے عہد عتیق میں بھی مختلف موقعوں پر مختلف قوموں کے اعداد و شمار مذکور ہیں، رسول اللہ ﷺ نے بھی مدینہ میں مردم شماری کرائی تھی، اور اس کا ذمہ دار حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو بنایا تھا، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ہی راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرے لئے ان تمام لوگوں کے نام لکھو، جنہوں نے اسلام کا اقرار کیا ہے، **اکتبوا لی من تلفظ بالاسلام من الناس** حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے شمار کیا تو اس وقت یہ تعداد پندرہ سو نکلی۔ (بخاری، حدیث نمبر:۳۰۶۰) بظاہر یہ تعداد صلح حدیبیہ کے کچھ آگے یا پیچھے کی ہوگی، صحابہؓ نے فتح مکہ کے مجاہدین کی تعداد بھی بیان فرمائی ہے، اور بعض روایتوں میں حجۃ الوداع کے موقع سے شرکاء کی تعداد جو ایک لاکھ سے کچھ اوپر تھی، مذکور ہوئی ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا

ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اعداد وشمار کے اکٹھا کرنے پر نظر رکھی جاتی تھی، خلافت راشدہ میں خاص کر حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی مختلف شہروں کے اعداد وشمار ملتے ہیں، مدینہ میں آباد لوگوں کے لئے تو آپ نے مستقل رجسٹر ہی مرتب کرار کھا تھا۔ اور اسی رجسٹر کے مطابق حسبِ مراتب اور حسبِ خدمت مال غنیمت اور باہر سے آنے والی اعانتیں تقسیم کی جاتی تھیں، بعد کو بھی مسلمانوں کے دور میں مردم شماری کا سلسلہ رہا ہے، اسی لئے تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی کے پس منظر میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس وقت اس بہار آفریں شہر کی آبادی ایک لاکھ سے کچھ اوپر تھی۔

اپنی قوت کا اظہار اسلام کی نگاہ میں کوئی اچھی بات نہیں ہے، کہ اس سے کبر کی بو آتی ہے۔ لیکن بعض دفعہ قومی اور ملی مصالح کے تقاضہ کے تحت یہی ناپسندیدہ بات پسندیدہ اور ناروا بات روا قرار پاتی ہے۔ غور کیجئے کہ جب رسول اللہ ﷺ صلح حدیبیہ کے دوسرے سال عمرۃ القضاء کے لئے تشریف لے گئے اور مشرکین -- جن کی نظر ایمانی اور روحانی قوت کے بجائے صرف جسمانی قوت پر ہوتی تھی -- نے مسلمانوں کے تواضع اور انکسار کو دیکھتے ہوئے ان کے کمزور ہونے کا طعنہ دیا، تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو کسی قدر اکڑفوں کے ساتھ طواف کرنے کا حکم فرمایا، جو آج تک ''رمل'' کے نام سے حج کی ایک اہم ترین سنت ہے، فتحِ مکہ کے موقع سے اہلِ مکہ کو مرعوب کرنے اور قائد مشرکین ابوسفیان کو متاثر کرنے کی غرض سے آپ نے ایک خاص ترتیب سے مختلف قبائل کے الگ الگ فوجی دستے مرتب فرمائے، اور ایک تنگ وادی سے جوش ایمان سے معمور اور جذبہ جہاد سے بھرپور قافلہ کو گذارا، نیز حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ذریعہ ایسی تدبیر کرائی کہ ابوسفیان کو پھٹی آنکھوں اس لشکرِ جرار اور اس کے ہمت وحوصلہ اور جذبۂ وجوش کو دکھلایا، تاکہ اہلِ مکہ کو مقابلہ کی ہمت نہ ہو، اور وہ کسی مزاحمت کے بغیر اسلام کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فتحِ مکہ کی شب خاص طور پر آپ نے مسلمانوں کی فوج کو دور دور تک بکھر جانے، زیادہ سے زیادہ چولھے سلگانے اور کھانے پکانے کا اشارہ بھی دیا، تاکہ جب رات کی تاریکی میں مشرکین مکہ تاحد نگاہ اس لشکر کے چولہوں کو دیکھیں اور عربوں کے

طریقہ کے مطابق چولہوں کی تعداد کے مطابق افراد کا اندازہ کریں تو ان کے حوصلے ٹوٹ جائیں، اور ان کی ہمتیں شکستہ ہو جائیں، ان تدبیروں کا مقصد کبر اور اپنی برتری جتانا مقصود نہیں تھا، بلکہ یہ اس وقت کی مصلحت تھی، اور اسے اسلام کی تائید وتقویت اور مسلمانوں کی حفاظت کے ایک مؤثر وسیلہ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

پس ہر دور میں اپنی قوت بڑھانے، اپنی طاقت کا اظہار کرنے اور اپنے حقوق کی حفاظت اور اپنے قومی وجود کا دفاع کرنے کے الگ الگ ذرائع ہوتے ہیں، اس دور میں ان ہی ذرائع کو اختیار کرنا حکمت پن، فراست ایمان، اور اسوۂ نبوی کا تقاضا ہے۔

(۲۳ / فروری ۲۰۰۱ء)

کلوننگ ـــــ اسلامی نقطۂ نظر

فروری ۱۹۹۷ء سائنس اور ایجاد و اکتشاف کی دنیا میں ایک ایسا مہینہ بن کر آیا، جسے شاید کبھی فراموش نہ کیا جا سکے۔ اسی مہینہ میں اسکاٹ لینڈ میں ڈاکٹر ایان و... نے روزلین انسٹی ٹیوٹ کے تحت ایک ایسی بھیڑ کی پیدائش کا تجربہ کیا جس میں نر جانور سے کوئی مدد نہیں لی گئی، صرف مادہ کے ذریعہ یہ بھیڑ وجود میں آئی اور اس کا نام ''ڈولی'' رکھا گیا۔ یہ ایک ایسا تجربہ تھا جو ۲۷۸ دفعہ ناکامی سے دوچار ہو کر کامیابی کی منزل تک پہنچا تھا۔ جہاں اس تجربہ نے سائنسی تجربہ کرنے والوں کو شادکام کیا، وہیں اس نے عام لوگوں کو محوِ حیرت کر کے رکھ دیا۔

اس تجرباتی عمل کو ''کلوننگ'' کا نام دیا گیا۔ کلوننگ انگریزی زبان کا لفظ ہے جو یونانی لفظ ''کلون'' (Klon) سے ماخوذ ہے۔ کلون کے اصل معنی ''نئی پھوٹنے والی شاخ'' کے ہیں، کلوننگ (Cloning) کا لفظ اس وقت ہم شکل کی پیدائش یا نقل اُتارنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسی لئے عربی میں اس کو ''استنساخ'' کہتے ہیں، جس کے معنی ہیں ''فوٹو کاپی کرنا'' نباتات میں کلوننگ ایک زمانہ سے مروج ہے اور حیوانات پر ایک عرصہ سے اس کے تجربہ کا سلسلہ جاری ہے۔ ۱۹۵۲ء میں دو امریکی سائنس دانوں رابرٹ برگس اور سرتھامس کنگ نے کلوننگ کے ذریعے مینڈک کی پیدائش کو ممکن بنایا۔ ۱۹۹۳ء میں انسانی کلوننگ کی کوشش کی گئی اور اس میں ایک حد تک پیش رفت بھی ہوئی، لیکن اسے رحم میں نہیں ڈالا گیا، گویا تجربہ کو آخری مرحلہ تک پہنچانے سے اجتناب برتا گیا۔ فروری ۱۹۹۷ء میں ایک اور پیش رفت ہوئی اور ''ریگون یونیورسٹی، امریکہ'' میں کلوننگ کے ذریعہ دو ہم شکل بندروں کی پیدائش عمل میں آئی۔ بندر کا جسمانی نظام انسان کے جسمانی نظام سے بہت قریب تصور کیا جاتا ہے اور اسی مماثلت نے

ڈاروِن کو اس غلط نظریہ تک پہنچایا تھا کہ انسان پہلے بندر تھا اور ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے وہ انسان بنا ہے، حالاں کہ یہ ایسی ہی بات ہے کہ کوئی شخص لکڑی کی کرسی اور میز کو دیکھ کر یہ قیاس کرنے لگے کہ کرسی اصل میں میز ہی تھی، میز ہی نے ترقی کر کے کرسی کا روپ اختیار کیا ہے۔

لیکن ''ڈاروِنزم'' سے قطع نظر یہ ضرور ہے کہ بندروں میں کلوننگ کے کامیاب تجربہ نے انسان پر اس تجربہ کے کامیاب اور بارآور ہونے کو امکان سے بہت قریب کر دیا ہے اور اگر مستقبل قریب میں انسان پر کلوننگ کے کامیاب تجربہ کی اطلاع ملے تو حیرت نہیں ہونی چاہئے۔ سائنس کی اس نئی پیش رفت سے متعدد اعتقادی اور سماجی مسائل پیدا ہو رہے ہیں اور کئی سوالات ہیں جو غور و فکر کے منتظر اور جواب کے متقاضی ہیں، اور اس وقت ان تمام سوالات پر غور کرنا اور ان کے بارے میں قطعی رائے قائم کرنا غالباً قبل از وقت ہوگا، جب تک کہ اس کے نفع و نقصان کے تمام پہلو سامنے نہ آجائیں۔

اللہ تعالیٰ نے تخلیق کے نظام کو مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ قرآن مجید نے بار بار اللہ ہی کے خالق ہونے پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ ہر چیز کی تخلیق اللہ خود ہی فرماتا ہے: اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (زمر: ۶۲) ارشاد ہے کہ تخلیق کا تمام تر فیصلہ خدا ہی کے لئے مخصوص ہے: اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اعراف: ۵۴) قرآن چیلنج کرتا ہے کہ تمام لوگ مل کر بھی ایک مکھی تک کی تخلیق نہیں کر سکتے۔ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ (الحج: ۷۳)

قدرت کا نظامِ تخلیق ایک ایسا رازِ سربستہ ہے کہ نہ ماضی میں اس سے پردہ اٹھایا جا سکا ہے اور نہ مستقبل میں اٹھ سکے گا۔ ایسی کتنی ہی مثالیں موجود ہیں کہ مرد و عورت میں تولید کی بھرپور صلاحیت موجود ہے، لیکن پھر بھی وہ اولاد کی نعمت سے محروم ہیں اور ڈاکٹرس محرومین کے راز کو جاننے اور سمجھنے سے عاجز ہیں، تو کیا کلوننگ کے ذریعہ پیدائش خدا کے نظامِ تخلیق میں داخل ہونے کے مترادف ہے اور کیا اس سے اللہ تعالیٰ ہی کے خالق ہونے کی نفی ہوتی ہے؟ یہ ایک اہم اعتقادی سوال ہے!

اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے پہلے ہمیں خود کلوننگ کی حقیقت کو سمجھنا ہوگا۔ کلوننگ

کے عمل کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا جسم بے شمار خلیوں سے مرکب ہے، جسم میں یہ خلیے مسلسل ٹوٹ کر ایک سے دو اور دو سے چار ہوتے جاتے ہیں۔ یہ خدا کی عجیب قدرت ہے کہ خلیہ کا ہر جزء خود ایک مکمل خلیہ بن جاتا ہے، ہر ایک خلیہ میں ''مرکزہ'' (Nuclus) اور ہر مرکزہ میں چھیالیس ''کروموزوم'' (Chromosome) ہوا کرتے ہیں، لیکن جنسی خلیے یعنی نر کے مادۂ منویہ اور مادہ کے بیضۃ المنی میں تیئیس تیئیس کروموزوم ہی ہوتے ہیں، یہ بھی قدرت کی ایک نشانی ہے۔ اس طرح نر و مادہ سے مل کر چھیالیس کی تعداد مکمل ہوتی ہے تاکہ جب بچے کی تخلیق ہو تو اس میں ماں اور باپ دونوں کی خصوصیات پیدا ہوں اور اسی لئے بچوں میں صورت و شباہت، رنگ و روپ اور مزاج و اخلاق میں ماں اور باپ دونوں ہی کی مماثلت پائی جاتی ہے۔

کلوننگ کا بنیادی فعل یہ ہے کہ مادہ کے بیضہ میں کسی خلیہ سے مرکزہ نکال لیا جاتا ہے اور جسم کے کسی اور حصہ کے خلیے سے مرکزہ نکال کر اس خلیہ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ مرد کے جسم سے بھی لیا سکتا ہے اور عورت کے جسم سے بھی۔ جسم کے دوسرے حصوں میں ایک مرکزہ چھیالیس کروموزوم کا حامل ہوتا ہے، اس طرح مرد و عورت سے مل کر کروموزوم کی یہ تعداد مکمل ہو جاتی ہے، اس لئے جنین کے وجود میں آنے کے لئے یہ فعل کافی ہو جاتا ہے، اب اگر کسی مادہ کے بیضہ میں اسی کے جسم سے حاصل کیا ہوا مرکزہ ڈال دیا جائے تو نر سے اتصال کے بغیر بچہ کی پیدائش عمل میں آسکتی ہے اور چوں کہ اس میں صرف اس مادہ کے کروموزوم ہیں، اس لئے وہ بچہ شکل وصورت کے اعتبار سے اسی عورت کے مشابہ ہوگا، اگر مادہ کے بجائے کسی نر کا ''کروموزوم'' رکھا گیا ہو، تو چوں کہ بچہ کے جسم کی تشکیل صرف اس نر کے کروموزوم سے ہوئی ہے، اس لئے بچہ میں پوری مماثلت اسی نر کی ہوگی، پھر جب بار آوری کا مرحلہ طے ہو جائے تو جنین کی افزائش کے لئے اسے مادہ کے رحم میں ڈالنا ہوگا اور عام تولیدی نظام کے مطابق مادہ بچہ کو جنے گی، چاہے اسی مادہ کے رحم میں ڈالا جائے جس کا بیضہ ہے یا کسی اور مادہ کے رحم میں۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ کلوننگ سے جسمانی مماثلت پیدا ہوتی ہے، یہ ضروری نہیں کہ فکر وشعور

اور مزاج و اخلاق کے اعتبار سے بھی ان میں مماثلت پائی جائے، کیوں کہ ان اُمور کا تعلق محض مادۂ تخلیق سے نہیں ہوتا، بلکہ تعلیم و تربیت، سماجی اور خاندانی ماحول ان اُمور میں زیادہ مؤثر اور دخیل ہوتے ہیں۔

کلوننگ کی اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کلوننگ سے پیدائش کے لئے بھی مادہ کا بیضہ ضروری ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ بیضہ کے بارآور ہونے کے بعد اسے مادہ کے رحم میں ڈالا جائے اور عام تخلیق نظام کے مطابق چھیالیس کروموزوم کا وجود بھی ضروری ہے، البتہ اس طریقہ پیدائش میں نر کا واسطہ ضروری نہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ انسان نے تخلیق کی قدرت حاصل کرلی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تدبیر کی قدرت دی ہے، شوہر و بیوی کا اتصال بھی ایک تدبیر ہے، جو بچہ کی پیدائش کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس تدبیر کو نتیجہ خیز بنانے کا نام تخلیق ہے، اس پر کسی انسان کو قدرت نہیں۔ اسی ڈولی کی پیدائش کی کوشش میں ۲۷۸ تجربات ناکام ہوئے اور سائنس داں اس بات کو بتانے سے قاصر ہیں کہ یہ تجربات کیوں ناکام ہوئے اور اسی طرح کا ایک تجربہ کیوں کامیاب ہوسکا؟ ایک صاحب ایمان کے لئے یہ کامیابی اور ناکامی نہ اچنبھے کی بات ہے اور نہ حیرت و تعجب کی۔ اس لئے کہ ہمارا ایمان ہے کہ ہر تدبیر امرِ الٰہی کے تابع ہے، جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم اور فیصلہ نہ ہو، کوئی تدبیر نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی۔ قرآن نے حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کو مرد سے اتصال کے بغیر تنہا عورت سے بچہ کی پیدائش کا واقعہ بیان کیا ہے، حضرت حوا علیہا السلام کے بارے میں کہا ہے کہ تنہا مرد سے ان کی پیدائش عمل میں آئی، اس لئے اگر کلوننگ کے ذریعہ تنہا عورت سے کسی بچہ کی پیدائش کا واقعہ پیش آئے تو یہ قرآن کی تصدیق ہوگی نہ کہ تکذیب، اور یہ اسلام کے تصورِ تخلیق کی موافقت ہوگی، نہ کہ اس کی مخالفت۔

کلوننگ سے متعدد شرعی مسائل بھی متعلق ہیں: کیا کلوننگ کے ذریعہ پیدائش کی صورت میں نسب ثابت ہوگا؟ نسب اس عورت سے متعلق ہوگا جس کا بیضہ لیا گیا ہے یا اس عورت سے جس کے رحم میں جنین کی پرورش ہوئی ہے؟ کیا یہ بات درست ہوگی کہ کسی

اجنبی مرد کے مرکزہ کو عورت کے بیضہ میں رکھا جائے؟ کیا خود شوہر و بیوی کے درمیان ایسا عمل کیا جا سکتا ہے؟ بالخصوص ایسی صورت میں کہ وہ لاولد ہوں، کسی شخص کے کروموزوم سے جس بچہ کی پیدائش ہوگی وہ اس شخص کا بھائی تصور کیا جائے گا یا بیٹا؟ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جو انسان پر کلوننگ کے کامیاب تجربہ کی صورت میں اُبھر کر سامنے آئیں گے۔

بادیٔ النظر میں انسان کے معاملہ میں کلوننگ ایک خطرناک اور مضرت رساں تجربہ ہوگا، اس کی وجہ سے اولاد کے لئے نکاح کی احتیاج کم ہو جائے گی اور ظاہر ہے کہ اس طرح نکاح کی شرح بھی کم ہوگی، اس سے جو سماجی مسائل پیدا ہوں گے وہ محتاجِ اظہار نہیں۔ کلوننگ کے ذریعہ پیدا ہونے والے بچے اپنی شناخت اور خاندان سے محروم ہوں گے اور اس طرح خاندانی نظام بکھر کر رہ جائے گا۔ اسلام میں زنا کی حرمت اور نکاح کی اہمیت کا منشاء اس کے سوا کیا ہے کہ نسب کی حفاظت ہو اور خاندان کی تشکیل عمل میں آسکے، اس سے تلبیس اور فریب کا دروازہ کھلے گا، جرائم پیشہ لوگ اپنے ہم شکل بچوں کے وجود میں آنے کی تدبیریں کریں گے تاکہ فریب اور دھوکہ دہی سے کام لے سکیں۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس تدبیر سے پیدا ہونے والے بچے بعض فطری صلاحیتوں سے محروم اور نقائص کے حامل ہوں، کیوں کہ جب کوئی کام فطرت کے عام اُصول سے ہٹ کر کیا جاتا ہے تو ضرور وہ منفی اثر سے دوچار ہوتا ہے، اس لئے قدرت نے تخلیق کا جو عام طریقہ رکھا ہے، اس کو چھوڑ کر غیر فطری راستہ تلاش کرنا بے وقوفی بھی ہے اور انسانیت کے ساتھ ظلم بھی۔

تاہم کلوننگ کی بعض ایسی صورتیں بھی ہیں جن سے طبی فوائد اٹھائے جا سکتے ہیں اور وہ صورت ہے ''جین کلوننگ'' (Gene Cloning) کی۔ کروموزوم دراصل چھوٹے چھوٹے دانوں سے مرکب ہوتا ہے، یہی دانے جین (Gene) کہلاتے ہیں، انسان کی صحت اور بیماری سے ان دانوں کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اب یہ بات ممکن ہوگئی ہے کہ کسی جین کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا جین رکھ دیا جائے، لہٰذا اگر کوئی جین کسی

خاص مرض کا باعث ہو اور اسے نکال کر اس کی جگہ دوسرا صحت مند جین رکھ دیا جائے تو اس طرح اس بیماری کا علاج ممکن ہے۔ظاہر ہے کہ کلوننگ کی یہ صورت جائز ہوگی اور یہ علاج کے قبیل سے ہوگا، اور شاید اس طریقۂ علاج سے ایسے امراض کا علاج بھی ممکن ہو جن کو لا علاج سمجھا جاتا ہے، جیسے کینسر اور ایڈز وغیرہ۔ اور یہ اس حدیث کی تصدیق ہوگی جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی مرض نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا علاج پیدا نہ کیا ہو۔

(۱۱ر ستمبر ۱۹۹۸ء)

لائی ڈیٹکٹر —— اسلامی نقطۂ نظر

جرائم میں جوں جوں اضافہ ہورہا ہے، جرائم کی تحقیق وتفتیش کے لئے بھی نت نئے آلات ووسائل ایجاد کئے جارہے ہیں۔ ایسے ہی آلات میں ایک وہ برقی آلہ ہے جسے لائی ڈیٹکٹر (Lie Detector)، یعنی ''جھوٹ کا مخبر'' کہا جاتا ہے۔ مغربی ممالک میں اس کا استعمال زیادہ ہے اور عرصہ سے جاری ہے، لیکن ہندوستان میں ماضی قریب ہی میں یہ آلہ متعارف ہوا ہے۔ یہ آلہ دراصل انسان کی ان اندرونی کیفیات کا چغل خور ہے جن کو انسان چھپانا چاہتا ہے۔

اس طریقۂ تفتیش کا فلسفہ یہ ہے کہ اگر مجرم کسی سوال کا خلاف واقعہ جواب دے اور جھوٹ بولے تو اس کی اندرونی کیفیت میں فرق آجاتا ہے۔ دل کی حرکت تیز ہوجاتی ہے، بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے، سانس پھولنے لگتی ہے، پھر اندرونی کیفیت کا اثر جسم کے بیرونی حصے پر بھی پڑتا ہے، اس کا ہاتھ انجانے میں گردن اور چہرے کی طرف اٹھتا ہے۔ گفتگو میں ہچکچاہٹ پیدا ہوجاتی ہے، کبھی کبھی کاندھے کو اُچکاتا ہے۔ وہ اپنے مخاطب سے آنکھیں چرانے کی کوشش کرتا ہے اور اکثر اوقات اسے پسینہ بھی آجاتا ہے، گویا جسم کا اندرون اور بیرون دونوں ہی اس کے جھوٹے ہونے کی شہادت دیتا ہے، اگر انسان اپنی بیرونی کیفیت پر کسی طرح قابو بھی کرلے تو اندرونی کیفیت پر قابو پانا بہت دشوار ہوتا ہے۔

اس میں ایک پہلو تو عبرت وموعظت کا ہے، اور دوسرا پہلو فقہی اور قانونی ہے کہ شرعاً کسی جرم کو ثابت کرنے کے لئے یہ آلہ کس حد تک معتبر ہوسکتا ہے؟ عبرت و موعظت کا پہلو یہ ہے کہ انسان اس سے اندازہ کرسکتا ہے کہ اس کی زندگی کس طرح گواہوں کے درمیان گھری ہوئی ہے؟ ایسے گواہ جن کی آنکھیں خلوت وجلوت یہاں

تک کہ اس کے دل و دماغ کو بھی اپنے احاطہ میں لئے ہوئی ہیں۔ انسان کوئی کام ہزار پردوں میں کرے پھر بھی خدا کی طرف سے ایسے گواہ موجود ہیں جو ان پردوں کو تار تار کر کے واقعہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ دُنیا میں ان گواہوں نے اپنے آپ کو مہر بہ لب کر رکھا ہے، لیکن آخرت میں پوری جرأت اور بے خوفی کے ساتھ یہ تمام راز ہائے دروں کو کھول کر رکھ دیں گے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دائیں اور بائیں کاندھوں پر ان فرشتوں کو بیٹھا رکھا ہے، جو ان کی نیکیوں اور برائیوں کو مسلسل لکھ رہے ہیں اور انسان کی آخری سانس تک لکھتے رہیں گے۔ پھر یہ ریکارڈ محفوظ ہو جائے گا اور قیامت کے دن انسان کے سامنے ان کی نیکیوں اور برائیوں کا میزانیہ پیش کیا جائے گا۔ انسان اپنے نامۂ اعمال کو دیکھتا جائے گا اور اقرار کے سوا چارہ نہیں پائے گا۔ لیکن کچھ لوگ اتنے ڈھیٹ ہوں گے کہ اس وقت بھی جھوٹ بولنے سے نہیں شرمائیں گے اور اپنی بداعمالیوں سے انکار کرنا چاہیں گے۔ تب ان کی زبان بند ہو جائے گی اور قوت گویائی ساتھ چھوڑ دے گی، جسم کا ایک ایک عضو اس کے خلاف گواہی دینے کے لئے بول پڑے گا اور ہر عضو یہ کہانی سنائے گا کہ اس شخص نے اس کو کن کن برائیوں کے لئے استعمال کیا تھا؟ یہاں تک کہ زمین اور جمادات بھی ان کی نیکیوں اور برائیوں کے احوال سنائیں گے اور انسان کے لئے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

ایک زمانہ میں لوگ اس بات پر اعتراض کرتے تھے کہ انسان کی پوری زندگی کا نامۂ اعمال مرتب ہو تو اس کے لئے کتنی ہی جلدیں درکار ہوں گی۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ قیامت میں اس نحیف و نزار انسان کے ہاتھ میں اس کا نامۂ اعمال تھما دیا جائے، لیکن آج کے کمپیوٹر عہد میں اس قسم کا اعتراض بے معنی ہو کر رہ گیا ہے، جب انسان ایک معمولی دو تین انچ کی ڈسک میں ہزاروں صفحات محفوظ کر سکتا ہے تو خدائے خبیر و علیم کے لئے ایک مختصر سے اعمال نامہ میں پوری انسانی زندگی کو محفوظ کرنا کیا دشوار ہے؟ اسی طرح جب دُنیا میں انسان کی اندرونی اور بیرونی کیفیات اس کے مجرم ہونے کی گواہی دیتی ہیں تو آخرت

میں انسان کے اعضاء کا گواہ بننا کوئی ایسی بات نہیں جو ایک حقیقت پسند انسان کے لئے حیرت کا باعث ہو ـــــ اگر انسان غور و تدبر سے کام لے تو جتنی نئی سائنسی تحقیقات سامنے آرہی ہیں وہ اسلام کی تصدیق کرتی ہیں اور ان کے ذریعہ اسلام کے تصور آخرت کو سمجھنا اور سمجھانا آسان ہو گیا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ جھوٹ کے اس آلہ کی رپورٹ کے مطابق جھوٹ کی وجہ سے سب سے زیادہ انسان کا قلب متاثر ہوتا ہے اور قلبی کیفیات میں تغیر پیدا ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ انسان کے قلب پر اس کے گناہوں کا اثر پڑتا ہے۔ جب انسان کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو قلب پر ایک سیاہ دھبہ پڑتا ہے، اگر آدمی توبہ کرلے تو یہ دھبہ دُھل جاتا ہے ورنہ باقی رہتا ہے، پھر جب دوبارہ وہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو دوسرا دھبہ پڑ جاتا ہے، یہاں تک کہ پورا قلب سیاہ ہو کر رہ جاتا ہے اور انسان اتنا بے توفیق ہو جاتا ہے کہ اسے اپنے گناہ پر ذرا بھی ندامت اور پشیمانی نہیں ہوتی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے گناہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہر وہ بات گناہ ہے جس سے دل میں کھٹک پیدا ہو۔ الاثم ماحاك في نفسك (ترمذی: باب الزهد) پس ارتکابِ جرم کی وجہ سے قلب کی کیفیات میں ظاہری تغیر معنوی تغیر کی دلیل اور تصدیق ہے۔

جھوٹ اسلام کی نظر میں غیر معمولی اور بدترین گناہ ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مومن سے سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن وہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ (احیاء علوم الدین: ۳ / ۱۳۵) مطلب یہ ہے کہ جھوٹ بولنا کسی بھی درجے میں مسلمانوں کے شایانِ شان نہیں۔ آپ ﷺ جو دُعائیں فرمایا کرتے تھے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ خداوندا! میرے قلب کو نفاق سے محفوظ رکھئے، بے عفتی سے حفاظت فرمائیے اور میری زبان کو جھوٹ سے بچائیے!! (احیاء علوم الدین: ۱۳۵/۳) یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ہنسی مذاق میں بھی جھوٹ بولنے کو روا نہیں رکھا اور فرمایا کہ ایسے لوگوں کے لئے ہلاکت ہے جو دوسروں کو ہنسانے کے لئے جھوٹ بولے۔ (ابوداؤد: ۶۸۱/۲) بلکہ آپ ﷺ

نے اس کو بھی منع فرمایا کہ آدمی بلاتحقیق ہر سنی ہوئی بات کو نقل کرتا جائے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: آدمی کے جھوٹے ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جو کچھ سنے اسے نقل کر دے۔ (ابوداؤد:۲/۶۸۱)

غرض جھوٹ ایک سنگین جرم ہے اور جیسے روحانی اعتبار سے انسان پر گناہ کا اثر پڑتا ہے اسی طرح انسان جسمانی اور ذہنی طور پر بھی اس گناہ سے متاثر ہوتا ہے —— بدقسمتی سے یہ گناہ اس وقت سماج میں اتنا عام ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی شخص ملے گا جس کا دامن اس سے پاک ہو۔ آپ ﷺ نے بدترین جھوٹ، جھوٹی گواہی کو قرار دیا اور اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ چاول اور گیہوں کی طرح سماج میں جھوٹے گواہ بھی مل جاتے ہیں اور وہ بھی بہت ہی سستے داموں پر، قانون داں باضابطہ گواہوں کو جھوٹ بولنے کے لئے تیار کرتے ہیں اور اس کی تربیت دیتے ہیں۔ صحافت جس کا کام واقعات کو کسی کمی بیشی کے بغیر عام لوگوں تک پہنچانا ہے اور جسے بہر حال ناطرفدار اور حقائق کا ترجمان ہونا چاہئے، وہ بھی غیر واقعی خبریں شائع کرنے بلکہ خبریں وضع کرنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کرتی۔ اربابِ سیاست کا تو کہنا ہی کیا ہے؟ جھوٹ بولنا ان کے نزدیک عیب نہیں بلکہ ہنر ہے اور ہتھیلیوں میں جنت دکھانا سیاست کا اوج کمال، جھوٹے وعدوں اور جھوٹے دعوؤں کا اگر کوئی مقابلہ ہو تو شاید ہی کوئی طبقہ اہلِ سیاست پر بازی لے جاسکے۔

یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ آخرت میں جوابدہی کا احساس اور عنداللہ حساب و کتاب کا یقین کمزور پڑ گیا ہے اور انسان نے اس دنیا سے آگے دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ جو لوگ خدا کے خوف اور جواب دہی کے احساس سے عاری ہوں، کوئی چیز ان کو جرم سے روک نہیں سکتی اور جو لوگ اپنی جواب دہی کا احساس رکھتے ہوں، معمولی تنبیہ بھی ان کے لئے تازیانۂ عبرت بن سکتی ہے۔

جہاں تک اس آلہ کی وجہ سے کسی کو جھوٹا قرار دینے کی بات ہے تو اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے اصل میں کسی جرم کے ثابت ہونے کے چار ذرائع ہیں: اوّل یہ کہ ملزم

اقرار کرلے۔ اگر وہ اقرار نہ کرے تو مدعی اس کے خلاف گواہان پیش کرے۔ پھر مختلف معاملات میں گواہان کا نصاب الگ الگ ہے۔ زنا کے ثبوت کے لئے چار مرد گواہان مطلوب ہیں، قصاص اور حدود یعنی وہ جرائم کہ جن کی سزا شریعت کی جانب سے متعین ہے، کے مقدمات میں کم سے کم دو مرد گواہ ہونے چاہئیں۔ دوسرے مالی اور غیر مالی معاملات میں دو مرد یا ایک مرد اور دو عوتوں کی گواہی کافی ہے ــــ اگر گواہان موجود نہ ہوں تو ملزم سے قسم کھلائی جائے گی اور قسم کھا کر وہ بری ہو جائے گا۔ فیصلہ کی چوتھی بنیاد قسم سے انکار ہے یعنی اگر ملزم قسم کھانے سے انکار کرتا ہے تو یہ اس کی طرف سے جرم کا اقرار متصور ہوگا۔ اسی طرح اگر ملزم موقع دیئے جانے کے باوجود رفعِ الزام سے گریز کرتا ہے تو یہ بھی اس کی طرف سے جرم کا اقرار تصور کیا جائے گا۔

کسی دعویٰ کو ثابت کرنے کے یہ بنیادی ذرائع ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ متعدد اور طریقے ہیں جن سے دعوے ثابت کئے جاتے ہیں۔ ان میں ایک ''قرائنِ قاطعہ'' ہیں، یعنی کسی بات کو ثابت کرنے والی ٹھوس علامتیں۔ جیسے کوئی شخص کسی مکان سے نکلے، اس کے ہاتھ میں خون سے لت پت چھری ہو، چہرہ سے خوف نمایاں ہو اور رفتار تیز ہو، پھر اسی وقت لوگ گھر میں داخل ہوں تو ایسی لاش دیکھیں جو تازہ خون سے لت پت ہو اور گھر میں کوئی اور شخص نہ ہو، تو یہ اس بات کا قرینہ ہوگا کہ یہی شخص اس کا قاتل ہے۔ (البحر الرائق: ۷/ ۲۰۵) ــــ لائی ڈیٹکٹر کے ذریعہ کسی شخص کے جھوٹ کی تحقیق بھی دراصل قرائن ہی کی قبیل سے ہے اور کوئی ماہر نفسیات ہی ایسے شخص کی کیفیت کو دیکھ کر اندازہ کر سکتا ہے کہ اس آلہ کی رپوٹ کس درجہ اس کے سچ اور جھوٹ کو ظاہر کرتی ہے؟۔

تاہم میرا خیال ہے کہ محض اس آلہ کی رپورٹ پر سنگین جرائم میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ یہ آلہ اصل میں سچ اور جھوٹ کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اندرونی کیفیات کو کاغذ پر منتقل کرتا ہے۔ جھوٹے آدمی پر ایک طرح کا خوف طاری ہوتا ہے، یہی خوف ہے جس کی وجہ سے کیفیات میں تغیر رونما ہوتا ہے۔ اگر ملزم کسی اور وجہ سے دہشت زدہ ہو اور نفسیاتی خوف میں مبتلا ہو، تب بھی اس میں یہ کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں، کیوں کہ بے خوفی

کی وجہ سے ان کی کیفیات میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا، گویا یہ نفسیاتی کیفیت خوف و وحشت کا مظہر ہے، نہ کہ جھوٹ کا یقینی ثبوت۔ اس لئے اس آلہ سے جرم کی تحقیق میں مدد تو لی جاسکتی ہے لیکن محض اس آلہ کی رپورٹ جرم کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں۔ واللہ اعلم۔

(۲۵رستمبر ۱۹۹۸ء)

محافظینِ قانون کے لئے لاقانونیت کا جواز

حکومت اور مملکت کی تشکیل کی تاریخ قریب قریب اتنی ہی قدیم ہے، جتنی قدیم انسانی بستیوں کے بسنے اور آباد ہونے کی ہے، کیوں کہ انسانی سماج کے لئے یہ ایک فطری ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ایسی مخلوق کی شکل میں پیدا فرمایا ہے جو ایک دوسرے کی حد درجہ محتاج ہے، یوں تو ہر جاندار کو ایک دوسرے کی احتیاج ہے، لیکن بہ مقابلہ انسان کے وہ ایک دوسرے کے کم محتاج ہیں، گائے اور بکری کے بچے چند دنوں میں خود مکتفی ہو جاتے ہیں، نہ ان کو اپنے چارہ کے لئے خود زراعت کرنی ہوتی ہے کہ مزدوروں کے محتاج ہوں، نہ ان کو کسی تاجر سے خوراک و پوشاک خریدنی ہے، اور نہ کسی باورچی سے پکوان کرانا ہے، لیکن انسان اپنی ایک ایک ضرورت کے لئے اپنے ہی جیسے کتنے ہی انسانوں کا محتاج ہے، اسے سامان خریدنے کے لئے تاجر کی، اناج کے لئے کاشتکار کی، پکوان کے لئے باورچی کی، سلائی کے لئے درزی کی، اور سواری کے لئے ڈرائیور کی ضرورت ہے اور نجانے زندگی کے مختلف مسائل میں وہ کتنے ہی لوگوں کا محتاج ہے، اپنے ہم جنسوں پر ظلم و زیادتی کا غصہ بھی انسانوں میں بہ مقابلہ بہت سی مخلوقات کے زیادہ ہے۔ حکومت سماج کے مختلف افراد کو ایک دوسرے سے مربوط کرتی ہے، تاکہ ان کی ضروریات پوری ہو سکیں، اور سماج میں عدل و انصاف قائم رہ سکے، قیامِ حکومت کے یہ دو بنیادی مقاصد ہیں، اگر حکومت کسی طبقہ کے ظلم کو جواز عطا کردے، تو اس سے زیادہ کوئی امر باعث افسوس نہیں ہوگا۔

اس وقت ہندوستان میں پولیس اور سیکوریٹی عملہ کی ظلم و زیادتی ضرب المثل بنی ہوئی ہے، ان حضرات کی طرف سے عوام پر جو زیادتیاں ہوتی ہیں، عام طور پر ان کے

سلسلہ میں گواہان کا ملنا دشوار ہوتا ہے، کیوں کہ گواہی دینے والوں کو بھی اپنی خیر منانی پڑتی ہے، بعض واقعات میں لوگ بہ تقاضۂ حیا بھی سکوت اختیار کر لیتے ہیں، چند ہی مقدمات عدالتوں اور انصاف کے اداروں تک پہنچ پاتے ہیں، پھر مجرم کو شبہہ کا فائدہ پہنچنے کی وجہ سے اکاذکا کیس ثابت ہو پاتا ہے، اس پر جو سزائیں دی جاتی ہیں، ان کی نوعیت بھی اکثر بہت معمولی ہوتی ہے، مظلوم تو بے چارہ جان سے بھی گیا، لیکن ظالم زیادہ سے زیادہ کچھ دنوں کے لئے معطل کر دیا گیا، یا چند مہینوں کی قید ہوگی۔

ہماری حکومت کو یہ بھی گوارا نہیں ہے کہ سرکاری عملہ سے ان کے مظالم کے بارے میں پوچھ تاچھ بھی ہو، اور ان کی انسانیت سوز مظالم پر معمولی گوشمالی بھی کی جائے، چنانچہ حکومت بہت ہی سنجیدگی کے ساتھ کوشش کر رہی ہے کہ سیکوریٹی فورس سے متعلق انسانی حقوق کی پامالی کی بابت مقدمات میں انہیں چھوٹ دی جائے، اور ان کے جرم سے درگذر کیا جائے، یہ گویا مجرموں کی پیٹھ تھپکنا ہے، کہ تم نے جو کچھ کیا، خوب کیا ہے، یہ بالکل ناقابلِ فہم بات ہے، سیکوریٹی فورس امن فراہم کرنے، مظلوموں کی مدد اور ظالموں کے ہاتھ تھامنے اور معاشرہ میں عدل وانصاف کو نافذ کرنے کے لئے ہے، اس اعتبار سے اگر سیکوریٹی فورس کے لوگ ایسے جرائم کے مرتکب ہوں تو وہ نسبتاً زیادہ سزا کے مستحق ہیں، کیوں کہ وہ نہ صرف ایک جرم کے مرتکب ہیں، بلکہ وہ جس کام کی روٹی کھا رہے ہیں، انہوں نے عین اس کے برعکس حرکت کا ارتکاب کیا ہے، چوکیدار اس لئے ہے کہ وہ چور کو روکے، لیکن اگر چوکیدار خود چور بن جائے، تو پھر کون ہوگا جو چور کا ہاتھ تھام سکے؟

اسلامی تعلیمات اس بارے میں بالکل واضح ہیں کہ مجرم بہر حال مجرم ہے، اور کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہے، یہاں تک کہ سربراہ مملکت بھی اسی قانون کا پابند ہے، جو دوسروں سے متعلق ہے، اس کے لئے بھی کوئی چھوٹ اور استثناء نہیں، اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں عرب کے ایک معزز قبیلہ کی ایک خاتون نے چوری کا ارتکاب کیا، رسول اللہ ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ فرمایا، لوگوں کو یہ بات بہت گراں گذری، انہوں نے چاہا کہ رسول اللہ ﷺ سے اس مقدمہ کے سلسلہ میں سفارش

کریں، لیکن سفارش کون کرے؟ چنانچہ آپ کے محبوب حضرت زید بن حارثہ کے محبوب بیٹے حضرت اسامہ بن زید کو سفارش کے لئے وسیلہ بنایا گیا، جب حضرت اسامہؓ نے آپ ﷺ سے سفارش کی، تو آپ بہت برہم ہوئے، اور فرمایا کہ اگر ان کی جگہ فاطمہ بنت محمد ہوتیں تو ان کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے۔

خلفاء راشدین نے بھی تمام لوگوں کے لئے انصاف کی ایک ہی ترازو رکھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو قاضی مقرر فرمایا تھا، ایک مقدمہ میں ایک صاحب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مدعی علیہ بنایا، قاعدہ کے موافق اگر مدعی گواہان پیش نہ کر سکے، تو مدعی علیہ سے قسم لی جاتی ہے، چنانچہ اس اعتبار سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذمہ قسم کھانا تھا، لیکن حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقام کی رعایت کرتے ہوئے دوسرے فریق سے خواہش کی کہ امیر المومنین کو قسم سے سبک بار کردیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کی یہ بات پسند نہیں آئی، کہ وہ عدل کے معاملہ میں ان کے ساتھ رعایت کا برتاؤ کریں، اور مقدمہ کے دو فریق کے درمیان یکسانیت میں فرق آنے دیں، چنانچہ آپ نے اس پر اپنی ناگواری اور ناخوش کا اظہار فرمایا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے ایک مشہور قاضی قاضی شریح ہیں، جنہیں طویل عرصہ اور کئی خلفاء کے عہدِ خلافت میں کار قضاء انجام دینے کا موقع ملا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خود ان کے عہد خلافت میں ایک یہودی نے قاضی شریح کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف سے دو گواہان پیش کئے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ، جو آپ کے صاحبزادہ ہیں، اور جن کی توثیق و تحسین خود دربار نبوت سے ہو چکی تھی، اور قنبرہ جو آپ رضی اللہ عنہ کے غلام تھے، قاضی شریح نے بے تکلف دونوں شہادتیں یہ کہہ کر رد کردیں، کہ بیٹے کی شہادت باپ کے، اور غلام کی شہادت آقا کے حق میں معتبر نہیں، اور اس طرح فیصلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف ہو گیا، وہ یہودی اسلامی عدالت کے اس بے باک انصاف سے اس درجہ متاثر ہوا کہ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ ایسی کتنی ہی مثالیں ہمیں نہ صرف عہدِ صحابہ میں بلکہ بعد کے ادوار میں بھی ملتی ہیں، عہدِ اموی میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے یہاں، عباسی

دورِ حکومت میں اور خود ہندوستان کے مغلیہ عہد میں آپ کو اس کی کتنی ہی مثالیں مل جائیں گی، یہ نہ صرف اسلامی نقطۂ نظر ہے، بلکہ یہ بنیادی انسانی مسئلہ ہے، انصاف کا پیمانہ تو اپنوں ہی کے لئے نہیں، بیگانوں کے لئے بھی ایک ہی ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی گروہ تمہاری نگاہ میں بڑا ہو، تب بھی تمہیں انصاف اور عدل کے معاملہ میں کوئی دوئی نہیں برتنی چاہئے (المائدۃ:۸) اور ایک ہی سلوک روا رکھنا چاہئے، حضرت عمرؓ نے خود اپنے بیٹے پر حد جاری فرمائی، اور بعض روایتوں کے مطابق اسی میں ان کی وفات ہوگئی۔

حضرت عمرؓ کی شہادت فیروز نامی ایک مجوسی کے ہاتھوں پیش آئی، حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبید اللہ بن عمرؓ نے اس جوش میں دو غیر مسلموں ہرمزان اور جفینہ کو قتل کر دیا، حضرت عثمانؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد اس سلسلہ میں مشورہ کیا، تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ قصاص کے بطور عبید اللہ بن عمرؓ کو قتل کر دیا جانا چاہئے، اس وقت کسی طور وہ بچ گئے، تو پھر حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان سے قصاص لینا چاہا، لیکن وہ حضرت معاویہؓ کی طرف چلے گئے، اور جنگ صفین میں مارے گئے۔

یہ بات کہ کسی خاص طبقہ کو ان کی زیادتیوں سے بری کر دیا جائے، دوسرے لفظوں میں ان کو جرم کی چھوٹ دے دینا ہے، بالخصوص جو لوگ قیام امن کے ذمہ دار ہوں، اگر انہیں کو بدامنی اور قانون شکنی کی چھوٹ دے دی جائے، تو کسی اور سے کیوں کر توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ عدل وانصاف پر قائم رہ سکیں گے۔

عدل کے لئے یہ بات کافی نہیں کہ انسان عام معاملات میں عدل کو قائم رکھے بلکہ انسان کی صلاحیت کا اصل امتحان اس وقت ہوتا ہے، جب وہ اشتعال کے مواقع پر بھی عدل کی روش سے منحرف نہ ہو، جب فریق مخالف کا رویہ آپ کی انا کو ٹھیس پہونچائے، اور جذبات کو برانگیختہ کر دے، اس وقت بھی آپ اپنے آپ پر قابو رکھیں، غصہ کو پینا اور بے قابو کر دینے والے افعال ومحرکات کے باوجود اپنے آپ پر قابو رکھنا انسان کا بہت بڑا اخلاقی جوہر ہے، اسی کو قرآن نے ''صبر'' اور ''کظم غیظ'' سے تعبیر کیا ہے۔ (آل عمران:۱۳۴)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بہادر وہ نہیں ہے جو دشمن کو پچھاڑ دے، بلکہ اصل بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے، ہمارے جوانوں کو اس بہادری کا سبق دیا جانا چاہئے۔

کیا بہتر ہوتا کہ حکومت لاقانونیت کو قانونی جواز دینے کے بجائے ہمارے فوجیوں اور پولیس جوانوں کے لئے اخلاقی تربیت کے کیمپ منعقد کرتی، اس میں مذہبی اور اصلاحی شخصیتوں کی خدمات سے بھی استفادہ کرتی، انہیں تشدد کے بغیر جرائم کے سد باب کی تدابیر سے روشناس کراتی، اور ان کو اپنے عمل اور ردعمل کے بارے میں زیادہ جواب دہ بناتی، اس وقت ہمارے ملک میں صورت حال یہ ہے کہ پولیس اور فورسیز نہایت ہی ''خوفناک طبقہ'' سے عبارت ہے، جن کے نام سے مائیں اپنے بچوں کو ڈراتی ہیں، ظاہر ہے کہ اسے کسی بھی طرح بہتر نہیں کہا جا سکتا، یہ نہایت بدبختی کی بات ہوگی کہ جو لوگ اپنے وطن کی حفاظت کے لئے جانیں لڑا دیتے ہیں، اپنا خون اور لہو نثار کر کے مادر وطن کی حفاظت کرتے ہیں، نہایت ہی مشکل ترین حالات میں قوم کی مدد کے لئے آگے آتے ہیں، ان کی شبیہہ کسی قدر اخلاقی تربیت کے فقدان کی وجہ سے قوم کی نگاہ میں اتنی خراب اور قابل نفرت ہو جائے، اور ہم اس صورت حال کی اصلاح کے بجائے ایسے قوانین بنائیں جس سے اس بگاڑ میں مزید اضافہ ہو، نہ کہ کمی۔

اس لئے کوئی بھی ایسا قانون جو امن کے نام ہر ظلم کرنے کی سہولت فراہم کرتا ہو، جو قانون کے نام پر لاقانونیت کے لئے گرین سگنل ہو، اور جو انسانی قدروں کی پامالی اور جواب دہی سے بلا سبک باری، مجرموں کے بجائے معصوم شہریوں پر دست درازی اور خود مجرموں کے خلاف جرم کی مقدار سے بڑھ کر ردعمل کا جواز فراہم کرتا ہو، اور کسی انسانی گروہ کو اپنے رویہ کے بارے میں غیر ذمہ دار ہونے کا موقع فراہم کرتا ہو، انسانیت کے ساتھ بدترین ظلم اور جنگل راج قائم کرنا ہے، اور ملک کے تمام محب وطن شہریوں کا فریضہ ہے کہ وہ پوری قوت کے ساتھ حکومت کے ایسے عزائم کو روکنے کی کوشش کریں۔

(۱۴؍ ستمبر ۲۰۰۱ء)

میچ فکسنگ ـــــ مرض اور علاج

جب کسی سماج میں برائی در آتی ہے تو وہ کسی ایک شعبۂ زندگی تک محدود نہیں رہتی، بلکہ ہر جگہ اپنی پنجہ گاڑ دیتی ہے، اس وقت ہمارے ملک میں کرپشن کا کچھ ایسا ہی حال ہے، پہلے نچی سطح کے ملازمین تھوڑی بہت رشوت لیا کرتے تھے، پھر پولیس والوں نے اس میں قدم رکھا، اور اس فن میں ایسا امتیاز حاصل کیا کہ جیسے گالی، گلوج اور بدزبانی سے پولیس پہچانی جاتی تھی، اب کرپشن بھی اس طبقہ کے لئے ''وجہ شناخت'' ٹھہری، پھر اعلیٰ عہدیداروں میں اس مرض نے سرایت کیا، یہاں تک کہ وزراء اور مقننہ نے سوچا کہ عوامی نمائندہ ہوکر ہم اس ''کارِ خیر'' میں پیچھے کیوں رہیں؟ اور نتیجہ یہ ہوا کہ وزراء اور چوٹی کے سیاست داں اس میں ملوث ہوئے، اور ایسے ایسے اسکینڈل سامنے آئے کہ ماضی میں کسی وزیر اور مقتدر سیاسی رہنما کے بارے میں ایسا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ جو محکمہ رشوت ستانی کو روکنے کے لئے ہے بعض اوقات وہ خود اس میں ملوث ہو جاتا ہے، اور اس وقت ایک معزز جج بھی رشوت کے مقدمہ میں ماخوذ ہیں، جب عدل و انصاف اور بُرائی کے سد باب کے ایسے باوقار ادارے اور ملک کے اعلیٰ ترین رہنما اور قائدین اس حمام میں بے لباس ہوں تو اوروں کا پوچھنا ہی کیا ہے؟

اس وقت ایک نیا قضیہ کرکٹ بورڈ کا اٹھا ہے، کھلاڑی تو بہر حال کھلاڑی ہی ہیں، جن کی پوری زندگی تماشا بینوں کے لئے وقف ہے، جیسے ہی میچ فکسنگ کا ایک واقعہ سامنے آیا، اور ایک کھلاڑی نے اخلاقی جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے پیسے لے کر قصداً اپنے کھیل کو دکو کمزور کرنے کا اعتراف کیا، ایسا لگا کہ گویا ایک طوفان سا آگیا، اور میچ فکسنگ میں ہند و پاک کے بڑے بڑے نامی گرامی اور ناظرین کے محبوب و پسندیدہ کھلاڑیوں کا نام

آنے لگا، یہاں تک کہ حکومت کو کرکٹ بورڈ کے شائقین کے جذبات کی تسکین کے لئے تحقیقات کی بابت فیصلہ کرنا پڑا، حکومت ہند نے سابق آل راونڈر منوج پربھاکر کو تیقن دیا ہے کہ اگر وہ ۱۹۹۴ء میں ایک میچ میں خراب مظاہرہ کے لئے رشوت پیش کرنے والے ساتھی کھلاڑی کا نام بتادیں تو انہیں مکمل تحفظ فراہم کیا جائے گا، بعض قتل کے مشتبہ واقعات کے بارے میں یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اس کا مقصد میچ فکسنگ کی شہادتوں کو مٹانا ہے، اور اتنے کھلاڑیوں کے نام اس ضمن میں آرہے ہیں کہ گورنمنٹ کا ایک بیان یہ بھی آیا ہے کہ جو کھلاڑی اپنی غلطی کا اعتراف کر لے انہیں معاف بھی کیا جا سکتا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رشوت خوری کس طرح ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں سرایت کر گئی ہے، اور اس کی اصل وجہ ظاہر ہے کہ جوئے بازی ہے، ٹیموں کی جیت ہار پر شائقین کا بازی لگانا اور جوے کھیلنا ایک ایسا مرض ہے جس نے بہت بڑے طبقہ کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے، یہ بہت ہی تکلیف دہ صورتِ حال ہے اور اس طرح لاکھوں کروڑوں روپے جو یقیناً سخت محنت سے حاصل کئے جاتے ہیں، وہ لایعنی اور بے مقصد طریقہ پر خرچ ہو جاتے ہیں، جو یقیناً قوم کے لئے نقصانِ عظیم سے کم نہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے کھیل میں مقابلہ کی جو جائز صورتیں ہیں ان میں بھی بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ جوئے سے پاک ہو، قرآن مجید نے جوئے کی سخت مذمت کی ہے، جوے کا ذکر شراب اور مشرکانہ افعال کے ساتھ کیا ہے، پھر اسے نجاست اور ناپاکی "رجس" قرار دیا ہے، نیز آگے اس کو فعلِ شیطانی قرار دیا گیا ہے "رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ" (المائدہ:۹۰) اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جوا اور قمار اسلام کی نگاہ میں کتنی بدترین چیز ہے؟ قرآن مجید نے ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جوا سماج میں بغض وعداوت کو جنم دینے اور اس کو بڑھانے کا شیطانی ذریعہ ہے (المائدہ:۹۱) قمار کے حرام ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ دوسرے کا مال حاصل کرنے کا غیر فطری طریقہ ہے، کمائی کے بنیادی طور پر دو ہی فطری ذرائع ہیں، یا تو مال کے بدلے مال ہو، یا انسانی محنت کے بدلہ، جوئے کی صورت میں مال کا حاصل ہونا اور نہ ہونا محض ایک اتفاقی امر ہوتا ہے، نہ مال دے کر مال حاصل کیا جاتا ہے، نہ محنت کر کے

مال حاصل کیا جاتا ہے، اس سے انسان بغیر محنت کے مال حاصل کرنے کا عادی ہو جاتا ہے، اور تمام مجرمانہ افعال کی بنیاد اصل میں یہی ذہنیت ہے، پھر جس کو نقصان ہوتا ہے اس کو بھی یہ بات گراں گذرتی ہے کہ ایک شخص نے بغیر کسی سعی و محنت کے میرا قیمتی مال ہتھیا لیا، اس سے دلوں میں نفرت و عداوت کی تخم پڑتی ہے، اور بغض و حسد کے جذبات پرورش پاتے ہیں، اور بعض اوقات نہایت ہی ناگفتہ بہ واقعات پیش آجاتے ہیں، جوئے کے لئے کوئی عقلی جواز بھی نہیں، غور فرمایئے کہ فتح و شکست تو ''الف'' اور ''ب'' کے درمیان ہوئی ''ج'' اور ''د'' کا نہ جیتنے میں کوئی دخل ہے اور نہ ہارنے میں، لیکن ہوا یوں کہ ''ج'' نے ''د'' کو محض ایک زبانی شرط کی بنیاد پر کثیر رقم ادا کی، غور کیجئے کہ اس کا ادنیٰ درجہ بھی عقلی جواز ہے؟؟

جیت اور ہار میں بھی اسلامی تصور یہ ہے کہ مقابلہ صاف اور شفاف طریقہ پر ہو، کوئی ایسا مصنوعی طریقہ اختیار نہ کیا جائے جو کھیل کے مقابلہ میں غیر حقیقی نتیجہ کو ظاہر کرے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**لا جلب و لا جنب**'' (ابوداؤد، کتاب الزکوۃ باب این تصدق لا اموال) یعنی جلب اور جنب درست نہیں ہے، ''جلب'' سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص گھوڑ دور کے مقابلہ میں شریک ہو، اس کے گھوڑے پر اس طرح چیخا اور آواز لگایا جائے کہ اس میں دوڑ کی خصوصی امنگ پیدا ہو جائے اور ''جنب'' سے مراد یہ ہے کہ جس گھوڑے کو دوڑ کے مقاملہ میں شریک کیا گیا ہے، اس گھوڑے کے ساتھ دوسرا گھوڑا بھی رکھا جائے، یہاں تک کہ جب سواری کا اصل گھوڑا سست گام ہو تو سوار چالا کی کے ساتھ دوسرے گھوڑے پر منتقل ہو جائے۔ (بدل المجھول: ۳ / ۲۶ ط: ہند) گویا ہار جیت میں دھوکہ سے کام لیا جائے یا خارجی طریقہ پر اپنے گھوڑے کی رفتار بڑھائی جائے۔

اس حدیث سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ مقابلہ صاف اور شفاف ہونا چاہئے، خارجی عوامل کے ذریعہ مقابلہ کو متاثر کرنا درست نہیں، پھر کھیل میں اپنی کار کردگی کو متاثر کرنے کے پیچھے مالی حرص و طمع کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، اور رشوت لے کر معاملات طے کئے جاتے ہیں، جو بدترین گناہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رشوت لینے والے اور دینے والے پر اللہ کی لعنت ہو، **لعنة الله على الراشي**

والمرتشی (ابن ماجہ،حدیث نمبر:۲۳۱۳) بعض احادیث میں رشوت کو دوزخ کا پیش خیمہ قرار دیا گیا ہے، بلکہ جو شخص رشوت میں واسطہ بنتا ہو اور بچو لیئے کا کردار ادا کرتا ہو اس پر بھی رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی لعنت بھیجی ہے، والرائش الذی یمشی بینھا (مسند احمد: ۲۷۹/۵) اس لئے یہ نہایت ہی غیر اسلامی اور غیر اخلاقی حرکت ہے، اصل یہ ہے کہ جب انسان کے اندر حرص وطمع گھر بنالیتی ہے، تو پھر انسان کی پیاس بجھتی نہیں ہے، اگر اسے ہفت اقلیم بھی ہاتھ آجائے تب بھی اس کی طلب ''ھل من مزید'' کا نعرہ لگاتی رہے گی، عام طور پر کھلاڑیوں کی آمدنی بڑے بڑے تاجروں اور اعلیٰ ترین سرکاری ملازمین اور عوامی نمائندوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور جو شہرت انہیں حاصل ہوتی ہے وہ اس کے علاوہ ہے، اس کے باوجود مال کی ایسی نہ بجھنے والی پیاس نا قابلِ فہم نظر آتی ہے!

اس پس منظر میں یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ ہمارے ملک میں سیاسی استحکام، معاشی بہبود، سائنسی ترقی، عوام کے لئے وسائل سہولت کی فراہمی وغیرہ پر تو دن رات محنت ہو رہی ہے، لیکن سماج میں اخلاقی قدروں کو بلند کرنے اور انسانوں کو انسان بنانے کی کوئی منظم اور منصوبہ بند سعی نہیں ہو رہی ہے، یہ بہت بڑا المیہ ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان سنگین جرائم میں ملوث پائے جارہے ہیں، کرپشن نے عدل وانصاف اور قانون کے اعلیٰ ترین اداروں تک رسائی حاصل کرلی ہے، ملک کے انٹرنیشنل کھلاڑی جو آج کے مزاج کے مطابق ملک کا وقار اور اس کے لئے عزت وآبرو کا اثاثہ سمجھے جاتے ، ہیں وہ ملک سے باہر جا کر چند پیسوں میں قوم کی عزت اور خود اپنی عزت وآبرو کا سودا کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتے، قانون اور مادی وسائل کے ذریعہ ان بیماریوں کا علاج نہیں ہو سکتا، جب تک ہم سماج کی اخلاقی سطح کو بلند کرنے اور ہر طبقہ میں احساسِ ذمہ داری پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو جائیں، ایسے واقعات کا سدِ باب بھی نہیں ہو سکتا، اور جب تک ضمیر نہ جاگ جائے کوئی دوا ان بیماروں پر کارگر نہیں ہو سکتی!۔

(۵؍مئی ۲۰۰۰ء)

کھیل ــــ آداب واحکام

انسان کی فطرت میں قدرت نے جو دواعی اور تقاضے رکھے ہیں، ان میں ایک تفریح طبع بھی ہے، چاہے وہ شعروادب اور طنز ومزاح کے ذریعہ ہو یا کھیل کود کے ذریعے، اس لئے کھیل کود بھی ایک حد تک انسانی فطرت کا حصہ ہے، اسی لئے بچے جو ہر طرح کی تعلیم وتربیت سے ناآشنا ہوتے ہیں اور براہِ راست فطرتِ انسانی کے آغوش میں پلتے ہیں، وہ بھی کھیل کود کی طرف رغبت رکھتے ہیں، پھر خدا کے نظامِ ربوبیت کو دیکھئے کہ لڑکے اپنے بچپن ہی سے ایسے کھیل کا رجحان رکھتے ہیں جو مردانہ مزاج ومذاق کے حامل ہیں، جیسے: دوڑنا، کودنا وغیرہ، لڑکیاں بچپن ہی سے ایسے کھیل کی طرف راغب ہوتی ہیں جو زنانہ مزاج سے مطابقت رکھتے ہوں، جیسے: بچے کھلانا، جھاڑو دینا، کھانا پکانا وغیرہ۔

اسلام سے پہلے کھیل کود کے معاملہ میں بھی بڑی بے اعتدالی پائی جاتی تھی، یورپ جو اپنے آپ کو تہذیب وتمدن کا ''ازلی معلم'' سمجھتا ہے، اس کا حال یہ تھا کہ غلاموں کے باہم قاتلانہ مقابلے کرائے جاتے، درندہ جانوروں سے مقابلہ کرایا جاتا، جو آخر ان کی بے دردانہ ہلاکت پر ختم ہوتا، لوگ اس سنگ دلانہ قتل کا تماشہ شوق سے دیکھتے اور تالیاں بجاتے، یہ کھیل ''سیافی'' کہلاتا تھا اور یورپ میں اس کے لئے بڑے بڑے اسٹیڈیم بنے ہوئے تھے، پروفیسر لیکی نے ''تاریخ اخلاقِ یورپ'' میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔

اسلام مذہب فطرت ہے، جس نے زندگی کے ہر شعبہ میں طبعی تقاضوں کی رعایت کی ہے اور جہاں کہیں بے اعتدالی پیدا ہوئی ہے، وہاں افراط وتفریط کو دور کر کے ایک معتدل اور متوازن طریقہ کی رہنمائی کی ہے۔ اس نے کھیل کود کی بھی بالکل نفی نہیں کی، بلکہ مناسب حدود وقیود کے ساتھ اس کی اجازت مرحمت فرمائی۔ کھیل کے سلسلے میں

جو بنیادی شرعی اصول ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ کھیل میں ان اُمور کی رعایت کی جائے:

(۱) کھیلنے والے ایسا لباس اختیار کریں جو ساتر ہو یعنی مرد ہو تو ناف سے گھٹنے تک کا حصہ ڈھکا ہوا ہو، خواتین مردوں کے درمیان نہ کھیلیں، خواتین کے لئے خواتین کے سامنے پردہ کی حدود وہی ہیں جو مردوں کے لئے ہیں کہ ناف سے گھٹنے تک کا حصہ چھپا ہوا ہو۔ اس کی رعایت کے بغیر کھیلنا حرام ہے، کیوں کہ حصہ ستر کو چھپانا شرعاً واجب ہے۔

(۲) ایسا کھیل ہو جو مختصر وقت میں پورا کیا جا سکتا ہو، جیسے فٹ بال، والی بال، ایسا طویل کھیل نہ ہو، جو آدمی کو شرعی فرائض اور اپنی متعلقہ ذمہ داریوں سے غافل کر دے، جیسے: شطرنج اور فی زمانہ کرکٹ، تاش! ایسے کھیل مکروہ ہیں۔ لوڈو وغیرہ بھی کراہت سے خالی نہیں۔ فقہاءِ حنفیہؒ کے یہاں شطرنج بغیر جوے کے بھی مکروہ ہے اور بعض احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، کیوں کہ یہ ایسا کھیل ہے جس میں جسمانی توانائی صرف نہیں ہوتی اور انسان گھنٹوں کھیل میں لگا رہتا ہے، یہ چیز انسان کو نکما بنا دیتی ہے اور اپنے اصل مقصد سے غافل کر دیتی ہے۔ کرکٹ کے شائقین سے معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ آج کل یہی کیفیت بلکہ اس سے بڑھ کر کرکٹ دیکھنے والوں کا حال ہے، یہ کھیل شیطان کی آنت کی طرح طویل ہے کہ نتیجہ حاصل ہونے میں کئی کئی دن لگ جاتا ہے اور نہ صرف اسٹیڈیم میں آنے والے بلکہ پوری دنیا میں کرکٹ کے شائقین ٹی وی پر آنکھیں اور ریڈیو پر کان لگائے رہتے ہیں، کہیں بھی کام کر رہے ہوں، ذہن کرکٹ کی طرف لگا رہتا ہے۔ طلبہ کے امتحان کا وقت ہے لیکن کرکٹ کا بخار اس پر غالب ہے، وہ مزدور جس کی حالت یہ ہے کہ ''دن میں کمائے تو رات کو کھائے'' وہ بھی بال بچوں کی فکر سے آزاد کرکٹ دیکھنے اور کامنٹری سننے میں محو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسی قوم جس میں ہزاروں لوگ دو وقت کے کھانے کو ترستے ہوں، ایسے کھیل مناسب نہیں اور شاید اسی لئے ترقی یافتہ ممالک میں یہ کھیل مقبول نہیں۔

(۳) ایسا کھیل نہ ہو جو اپنے یا دوسرے کے لئے ایذاء رسانی کا باعث ہو اور جسم کو شدید نقصان پہنچنے کا کافی امکان ہو، جیسے فری اسٹائل کشتی اور باکسنگ وغیرہ: ایسے کھیل بھی

جائز نہیں ہیں۔

(۴) مردوں کے لئے زنانہ کھیل اور عورتوں کے لئے مردانہ کھیل جیسے کشتی کبڈی درست نہیں ہے، کیوں کہ آپ ﷺ نے مردوں کو عورتوں کی اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت اختیار کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

(۵) کھیل خواہ کوئی بھی ہو اگر اس میں جوا ہو تو جائز نہیں، کیوں کہ جوا حرام ہے۔ جوے سے مراد یہ ہے کہ دونوں کھلاڑی آپس میں یہ شرط باندھیں کہ جو ہارے گا وہ جیتنے والے کو اس شرط کے مطابق مال ادا کرے گا یا دوسرے لوگ کھلاڑی ب آپس میں شرط کر لیں کہ اگر فلاں کھلاڑی جیتا تو الف، ب کو اور اس کا مخالف جیتا تو ب، الف کو اتنی رقم ادا کرے گا، یہ صورت قطعاً ناجائز اور سخت گناہ ہے۔ اگر چند کھیلنے والے ہوں اور دو طرفہ شرط نہ ہو بلکہ ایک طرفہ شرط ہو، مثلاً یوں کہا جائے کہ اگر تم جیت گئے تو میں تم کو اتنی رقم دوں گا اور میں جیت گیا تو تم کچھ نہیں دینا، یہ صورت جوے میں داخل نہیں اور جائز ہے، اسی طرح کھیلنے والے آپس میں شرط نہ باندھیں بلکہ ایک تیسرا شخص کہے کہ تم دونوں میں سے جو جیت جائے گا میں اسے اتنی رقم دوں گا، یہ صورت بھی درست ہے، کیوں کہ یہ جوا نہیں، انعام ہے۔

(۶) ایسے کھیل جس سے جسمانی ریاضت ہوتی ہو، جو صحت انسانی کے لئے مفید ہو اور جس سے انسان کے اندر قوتِ مدافعت بہم پہنچتی ہو، مستحب ہے اور اسلام ایسے کھیل کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

یہ کھیل کے سلسلے میں بنیادی شرعی اصول ہیں اور ان کی روشنی میں مختلف قسم کے کھیلوں کے بارے میں حکم شرعی جانا جا سکتا ہے۔

کچھ کھیل جن کا احادیث سے ثبوت ہے، یہاں ان کا ذکر مناسب محسوس ہوتا ہے:

۞ ''دوڑ'' کو آپ ﷺ نے پسند فرمایا، خود آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑ فرمائی ہے۔ حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ میں پہلے حضور ﷺ سے بڑھ جاتی، جب میرا جسم بھاری ہو گیا تو آپ ﷺ مجھ پر سبقت لے گئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ

اس کا بدلہ ہو گیا، ھذہ بتلک السبقۃ حضرت سلمہ بن اکوع ﷛ راوی ہیں کہ انصار میں سے ایک شخص نے اعلان کیا کہ کوئی ہے جو میرے ساتھ مدینہ تک دوڑ کا مقابلہ کرے؟ یہ شخص اتنا تیز دوڑتا تھا کہ لوگ اس پر سبقت حاصل نہیں کر پاتے تھے، میں نے اس سے کہا کہ تم کو کسی کی عزت و شرافت کا بھی خیال نہیں، یعنی تم ہر بڑے چھوٹے کو دعوتِ مقابلہ دے رہے ہو، اس نے کہا کہ سوائے رسول اللہ ﷺ کے میں کسی اور کو دعوتِ مقابلہ دینے سے باز نہیں آسکتا، حضرت سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے اجازت چاہی اور مقابلہ کیا، تو سبقت حاصل کر لی۔ (نیل الاوطار: ۹۲/۸) اسی لئے فقہاء اسے جائز قرار دیتے ہیں۔

✿ اسلام کشتی کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ رکانہ ﷛ عرب کے مشہور پہلوان تھے، انہوں نے آپ ﷺ کو دعوتِ مقابلہ دیا، آپ ﷺ نے قبول فرمایا، کشتی ہوئی، آپ ﷺ جیت گئے اور یہی شکست حضرت رکانہ ﷛ کے قبولِ اسلام کا باعث بنی۔ (نیل الاوطار: ۹۲/۸)

مگر کشتی سے مراد یہاں صرف وہ کشتی ہے جس میں فریق مخالف کو زمین پر گرا دیا جائے، وہ فری اسٹائل کشتی نہیں جس کا آج کل رواج ہے اور جس میں فریق مخالف پر آزادانہ تکلیف دہ وار کئے جاتے ہیں اور بعض دفعہ شدید جسمانی نقصان پہنچایا جاتا ہے: اخلاقی اور انسانی حدود سے متجاوز ایسی کشتیاں بالکل جائز نہیں اور حرام ہیں۔ موجودہ زمانے میں جوڈو کراٹے بھی کشتی کے حکم میں ہے، کیوں کہ اس کا مقصد بھی جسمانی ورزش اور مدافعانہ صلاحیتوں کو پروان چڑھانا ہے، البتہ کراٹے کا ایسا مقابلہ جائز نہیں جس میں دوسرے فریق کو ہر قسم کا نقصان پہچانے کی اجازت ہو۔

✿ تیراکی کو بھی حضور ﷺ نے پسند فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے ذکر کے سوا ہر چیز لہو ولعب ہے سوائے چار چیزوں کے: شوہر اپنی بیوی سے دل لگی کرے، اپنے گھوڑے کی تربیت کی جائے، دو مقرر نشانوں کے درمیان چلنا اور تیراکی کا فن سیکھنا۔ (الجامع الصغیر ۵/ ۲۳) ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے بچوں کو تیراکی اور تیراندازی سکھانے کی ترغیب دی۔ حضرت عمر ﷛ نے اہلِ شام کو خاص طور پر تیراکی، تیراندازی اور گھوڑسواری سیکھنے کی نصیحت فرمائی تھی اور اس سلسلہ میں ان کو ایک خط لکھا تھا۔ (فیض القدیر: ۳۲۷/۴)

✿ گھوڑ دوڑ بھی جائز ہے آپ ﷺ نے اس کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ گھوڑے کی دوڑ کا مقابلہ کراتے، جو گھوڑے چھریرے اور ہلکے بدن کے ہوتے ان کے لئے دوڑنے کی حد حفیہ سے ثنیۃ الوداع تک ہوتی اور جو بھاری بدن کے ہوتے ان کی ''ثنیۃ الوداع'' سے ''مسجد بنو زریق'' تک (بخاری مع الفتح: ۱/۲۱۴) گھوڑے کے علاوہ دوسرے جانور جیسے اونٹ کی دوڑ کا ذکر بھی جائز ہے، خود حدیث میں اونٹ کی دوڑ کا ذکر موجود ہے، **لا سبق الا فی نصل او خف او حافر** (ابوداؤد) لیکن ظاہر ہے کہ یہ اس وقت ہے جب کہ اس میں قمار اور جوے کی صورت نہ ہو، آج کل جو گھوڑ دوڑ ہوتی ہے، جس کا اصل مقصد جوا ہی ہوتا ہے، یہ جائز نہیں۔

✿ تیراندازی کی بھی آپ ﷺ نے حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر کام جو تفریح طبع کے طور پر کیا جاتا ہے، ناروا ہے، سوائے تین باتوں کے، ان میں ایک تیراندازی کا ذکر فرمایا (ترمذی) ابھی روایت گذر چکی ہے کہ آپ ﷺ نے بچوں کو تیراندازی سکھانے کی ترغیب دی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت منقول ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے بچوں کو تیراندازی سکھانے کا حکم فرمایا، گو یہ روایت ضعیف ہے۔ (الجامع الصغیر: ۴/۲۸-۳۲۷) موجودہ زمانے میں بندوق وغیرہ کی نشانہ بازی بھی اسی حکم میں ہے۔

(۱۹/فروری/۱۹۹۹ء)

ٹریفک —— شرعی ہدایات

گذشتہ ہفتہ حکومت کے اعلان کے مطابق ہمارے شہر میں ٹریفک سیٹی کا ہفتہ منایا گیا ہے۔ حکومت کی طرف سے وقتاً فوقتاً لوگوں میں ٹریفک کا شعور پیدا کرنے کی غرض سے اس طرح کے ہفتے منائے جاتے ہیں، جو یقیناً ایک مستحسن قدم ہے۔ واقعہ ہے کہ ٹریفک قواعد کی خلاف ورزی، بے اصولی اور نامناسب حد تک جلد بازی کی وجہ سے حادثات میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جاتا ہے، کوئی دن ایسا نہیں گذرتا کہ جس میں اخبار سڑک حادثہ کی اطلاع سے خالی ہو اور کچھ ہلاکتیں اس کی وجہ سے پیش نہ آئی ہوں۔ اسلام نے اس سلسلہ میں بھی ہماری رہنمائی کی ہے اور قرآن وحدیث میں ہمیں اس سلسلہ میں اصولی ہدایات مل سکتی ہیں۔

بنیادی بات یہ ہے کہ کچھ چیزیں وہ ہیں جن کا شریعت نے حکم دیا ہے اور کچھ باتوں سے شریعت نے منع فرمایا ہے، ان باتوں پر بعینہٖ عمل کرنا ضروری ہے، ان میں کسی کمی یا اضافہ کی گنجائش نہیں، کچھ چیزیں وہ ہیں کہ نہ ان کا حکم دیا گیا ہے اور نہ ان سے منع کیا گیا ہے، ان سے ایسی مصلحت متعلق ہے کہ نہ صراحتاً شریعت میں اس کے معتبر ہونے کا ذکر ہے اور نہ نامعتبر ہونے کا، ان چیزوں کے بارے میں حکومت کو حق ہے کہ عام لوگوں کے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی انتظامی قانون بنائے اور حسب ضرورت لوگوں پر کسی پہلو کو لازم قرار دیدے۔ اسلام کے اصولِ قانون کی اصطلاح میں ان کو ''مصالح مرسلہ'' کہا جاتا ہے، جیسے: انسان دائیں بھی چل سکتا ہے اور بائیں بھی، شریعت میں کوئی ہدایت نہیں ہے کہ چلنے میں کون سی سمت اختیار کی جائے اور کون سی سمت اختیار نہ کی جائے حکومت حفاظتی نقطۂ نظر سے عوام کو پابند کرسکتی ہے کہ وہ متعینہ سمت سے ہی سفر کرے، اس

میں کوئی قباحت نہیں۔

اس لئے ٹریفک کے جو اصول و قواعد مقرر کئے گئے ہیں، کہیں تیز چلنے کے اور کہیں آہستہ چلنے کے، رکنے کے اور نہ رکنے کے، گاڑی کسی مقام پر ٹھہرانے کے اور کسی مقام پر نہ ٹھہرانے کے، یہ انتظامی نوعیت کے قوانین ہیں، جن کا مقصد ہماری جان اور ہماری سواری کا تحفظ ہے۔ جان و مال کی حفاظت ایک شرعی فریضہ ہے اور حکومت کے ایسے قوانین کی اطاعت کا ہم نے عہد کیا ہے جو احکامِ شریعت سے متصادم نہیں ہیں، اس لئے ان اصول وضوابط کی رعایت ہم پر واجب ہے اور ان کی رعایت نہ کرنا نہ صرف قانونِ ملکی کی مخالفت ہے بلکہ عہد کی خلاف ورزی اور اپنی جان و مال کی حفاظت میں بے احتیاطی کی وجہ سے شرعاً بھی ایک قبیح فعل ہے اور گناہ کا باعث ہے، اس لئے مذہبی نقطۂ نظر سے بھی ان مفید قوانین کی رعایت کا پاس ولحاظ رکھنا ضروری ہے۔

قرآن نے انسان کی چال کے بارے میں ہدایت دی ہے کہ اس سے تکبر اور اکڑفوں کا اظہار نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

" ولا تمش فی الارض مرحاً انك لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولًا۔ " (الاسراء:۳۷)

" زمین میں اکڑ کر نہ چلو، کہ نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ لمبائی میں پہاڑوں کو پہنچ سکتے ہو۔"

ایک اور موقع پر اللہ کے نیک بندوں کی چال ڈھال اور گفتار و رفتار کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا:

" وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا " (الفرقان:۶۳)

" رحمٰن کے سچے بندے وہ ہیں جو زمین پر عجز و فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب نادان لوگ ان سے ہمکلام ہوتے ہیں تو سلامتی کی بات کہہ کر نکل جاتے ہیں۔"

زمین پر اکڑ کر چلنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا ایک مطلب تو ظاہر ہے کہ سینے تنے ہوئے ہوں اور گردنیں تکبر سے اکڑی ہوئی ہوں، لیکن اکڑ کر چلنے کی صرف یہی ایک کیفیت نہیں، بلکہ ہر وہ چال جس میں اپنی بڑائی کا اظہار ہو اور دوسروں کی تحقیر محسوس ہو، اس ہدایتِ ربانی کا مصداق ہے۔ آپ گاڑی پر سوار ہیں اور آپ کو یہ گوارا نہیں کہ کسی کی گاڑی آپ سے آگے رہے، آپ بلاوجہ اس کو پیچھے کر کے خود آگے بڑھنے کے درپے ہیں، اس کے لئے نامناسب طریقے اختیار کرتے ہیں، ہارن بجا بجا کر اسے پریشان کرتے ہیں، تو یہ بھی اکڑ کر چلنے ہی کے حکم میں ہے۔ تواضع کی چال یہ ہے کہ آپ اپنی رفتار معتدل رکھیں، جو آپ سے آگے چل رہا ہے، اسے آگے رہنے دیں، اگر کسی کی سواری آپ سے پیچھے ہے، لیکن اس کی رفتار بہ مقابلہ آپ کی سواری کے تیز ہے اور راستہ میں اس کی گنجائش ہے کہ آپ اسے آگے بڑھنے کا موقع دیدیں، تو آپ اس کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بنائیں اور اپنے دوسرے بھائی کو آگے بڑھنے دیں۔ یہ تواضع کی چال اور قرآن کی زبان میں ''مشی ہون'' ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم جب آپ کے ساتھ سفر میں ہوتے اور آگے کی سمت سے دشمن کا اندیشہ نہ ہوتا تو اہتمام کرتے کہ اپنی سواری کو حضور ﷺ کی سواری سے پیچھے رکھیں اور اس کا مقصد یہ ہوتا کہ آپ ﷺ کے احترام کو ملحوظ رکھا جائے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی اونٹنی آگے بڑھ گئی، یہ اونٹنی بڑی سرکش تھی اور قابو میں نہ آتی تھی، صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ بات گراں گذری اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو اس پر ڈانٹ ڈپٹ بھی فرمائی، لیکن آپ ﷺ نے اس کا برا نہ مانا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس سے منع فرمادیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو اس پر اصرار نہ کرنا چاہئے کہ اسی کی سواری آگے رہے اور دوسرے چلنے والے اس کے پیچھے پیچھے چلیں۔

قرآن مجید نے اچھے انسان کی صفت یہ بھی بیان کی ہے کہ اگر نا سمجھ لوگ اس سے الجھنے کی کوشش کریں تو وہ سلامتی کی بات کہہ کر گذر جاتے ہیں۔ یہ نہایت اہم بات ہے، جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے، راستہ میں چلتے ہوئے بار بار اس کی نوبت آتی

ہے کہ ٹریفک کے اصول سے ناواقف، جلد باز اور جاہل و اُجڈ قسم کے لوگ منہ آنے لگتے ہیں، کوئی اپنی سواری غلط طریقہ پر بیچ میں لے آتا ہے، کوئی اپنی مخالف سمت میں گھس آتا ہے، کوئی بے موقع ہارن بجا کر دِق کرتا ہے، کوئی ایسی جگہ گاڑی روک دیتا ہے جہاں گاڑی روکنے کی اجازت نہیں، اس سے ٹریفک کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، بعض لوگ خود غلطی کرتے ہیں اور اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے الٹے دوسروں کو سب وشتم کا نشانہ بناتے ہیں، یہ بڑے جذباتی مواقع ہوتے ہیں، اگر دوسرا آدمی بھی یہی طرزِ عمل اختیار کرے تو اس سے ماحول کے اور خراب ہونے، آویزش بڑھ جانے اور ٹریفک جام ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ انہی صورتوں میں یہ آیت ہماری طرف متوجہ ہوتی ہے کہ یہ وقت برداشت، تحمل اور کلمۂ خیر کہہ کر گذر جانے کا ہے کہ ایک شخص تو کانٹا پھینک ہی رہا ہے، اگر دوسرے لوگ بھی پھول پھینکنے کے بجائے کانٹے ہی پھینکنے پر اصرار کریں تو کانٹے ہی کانٹے جمع ہو جائیں اور گلہائے محبت کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہے۔

رفتار حالات کے اعتبار سے ہونی چاہئے، جہاں ازدحام ہو وہاں آہستہ چلا جائے، جہاں ازدحام نہ ہو اور آپ کے آہستہ چلنے کی وجہ سے ان لوگوں کو دشواری ہو جو آپ کے پیچھے ہیں تو وہاں سبک خرامی کے بجائے تیز گامی اختیار کیجئے۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ حجۃ الوداع کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی رفتار کی بابت فرماتے ہیں کہ جب کہیں خالی جگہ ہوتی تو تیز چلتے ورنہ رفتار اس سے کم رہتی: **''یسیر العنق، فاذا وجد فجوۃ نص''** (بخاری: حدیث نمبر: ۲۹۹۹، مسلم، حدیث نمبر: ۱۲۸۶) پیدل چلنے میں وقار اور متانت ہو۔ نماز ایک عبادت ہے اور نماز کے لئے آنا ایک عبادت کی طرف سبقت ہے، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس میں بھی وقار کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے، ارشاد ہے: **''اذا اتیتم الصلاۃ فاتوھا بالوقار''** (......احمد عن عبد الرحمن بن عوفؓ) حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ سکون کے ساتھ چلو، تیز چلنا کچھ نیکی کا کام نہیں، **''علیکم السکینۃ، فان البر لیس بالایضاع''**۔ (مسند احمد عن اسامہ بن زیدؓ)

راستہ پر بے ضرورت ہارن بجانا بھی پسندیدہ نہیں، اس سے آگے چلنے والے کو وحشت ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ حادثہ کا باعث بھی ہو جاتا ہے، اس لئے بھی ہارن کی آواز سنجیدہ لوگوں کے لئے گراں خاطر ہوتی ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے راستہ چلتے ہوئے گھنٹہ بجانے سے منع فرمایا، عربوں کا طریقہ تھا کہ اونٹ کی گردنوں میں گھنٹیاں باندھ دیتے، جب پورا قافلہ چلتا تو راستہ گھنٹیوں کی آواز سے گونج اٹھتا، آپ ﷺ نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمائے۔ اس سے بے ضرورت ہارن بجانے کی قباحت پر روشنی پڑتی ہے۔ بعض حضرات نت نئی آوازوں کے ہارن گاڑیوں میں لگاتے ہیں، جیسے کتے کی آواز، چھوٹے بچے کے رونے کی آواز، یہ نہایت ہی ناشائستہ بات ہے، اس آواز کے مکروہ ہونے کے علاوہ لوگ اس سے دھوکہ بھی کھا جاتے ہیں اور چونک اٹھتے ہیں، جو خطرناک حادثہ کا باعث ہوسکتا ہے، اس لئے ایسی چیزوں سے گریز ضروری ہے۔

یہ بات بھی مناسب نہیں کہ جہاں پارکنگ کی جگہ نہ ہو وہاں گاڑی کو پارک کر دیا جائے، یہ دوسرے راستہ چلنے والوں کے لئے تکلیف اور مشقت کا باعث ہے، اس سے ٹریفک جام ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو بھی ایمان کا ایک درجہ قرار دیا ہے کہ راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کو کو ہٹا دیا جائے، وادناھا اماطۃ الاذی عن الطریق (مسند احمد، حدیث: ۹۷۴۷) اذیٰ میں وہ تمام چیزیں داخل ہیں جو تکلیف دہ ہوں، خواہ وہ گندگی یا نجاست ہوں یا کچھ اور، اس لئے بے جگہ گاڑی کا کھڑا کرنا بھی اس میں شامل ہے، کیوں کہ اکثر اوقات اس کی تکلیف راستہ چلنے والوں کے لئے گندگی سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ اسی حکم میں یہ ہے کہ پٹرول اور ڈیزل کے بجائے کیروسن تیل پر گاڑیاں چلائی جائیں، کہ یہ یقیناً دوسرے راہ گیروں کے لئے تکلیف واذیت کا باعث ہے اور اس سے پھیلنے والی آلودگی عام لوگوں کے لئے بھی مضر اور نقصان دہ ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ پیدل چلنے والے گاڑی والوں کا اور گاڑی پر چلنے والے پیدل چلنے والوں کا خاص کر عورتیں، بچے اور ضعیف لوگ جو جلد راستہ طے نہیں کر سکتے، ان کی رعایت ملحوظ رکھیں، رسول اللہ ﷺ نے راہ گیروں کو عورتوں کی بابت خصوصی رعایت کا حکم

فرمایا، حضرت عبد اللہ ابن عمر ؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے مرد کو دو عورتوں کے درمیان چلنے سے منع فرمایا۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۵۲۷۳) حضرت ابو اسید انصاری ؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے خواتین کو نصیحت فرمائی کہ وہ راستہ کے کناروں سے چلیں۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۵۲۷۲) اس سے معلوم ہوا کہ فٹ پاتھ کے حصہ میں سواریاں نہ چڑھائی جائیں، بلکہ ان کو پیدل راہ گیروں کے لئے چھوڑ دیا جائے اور پیدل چلنے والے لوگوں کے حالات کی رعایت کرتے ہوئے چلا کریں۔

غرض، راستہ چلتے ہوئے مزاج میں تحمل و برداشت ہو، رویہ میں اعتدال ہو، دوسرے راہ گیروں کے ساتھ رعایت اور ایثار کا معاملہ ہو، اگر دوسرے راہ رو بے احتیاطی سے کام لیں اور نامناسب رویہ اختیار کریں تو ان کے بارے میں عفو درگذر ہو اور ہر شخص اپنے اپنے طور پر ٹریفک کے اصول وقواعد کو ملحوظ رکھے۔ یہ ہیں وہ اصول جن کی طرف قانونِ شریعت میں اشارہ ملتا ہے۔

(۲۰۰۰/۲/۲۵)

ٹیلی فون —— آداب واحکام

اس میں شبہ نہیں کہ موجودہ عہد علمی اکتشاف اور ایجادو اختراع کا عہد ہے، انسان نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوتِ فکر کو استعمال کر کے ایسی ایسی چیزوں کو وجود بخشا ہے کہ ماضی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ فضاء ہو یا سمندر، زمین کی تہیں ہوں یا انسان کا خود اپنا وجود، انسان نے ایک حد تک ان سبھوں کو علم وتحقیق کی گرفت میں لے لیا ہے۔ ان ایجادات میں ایک اہم حصہ ابلاغ اور مواصلات کے ذرائع میں ہونے والی حیرت انگیز ترقی ہے۔ کل تک انسان اپنی آواز کو ایک دو فرلانگ بھی پہنچانے کی طاقت نہیں رکھتا تھا، لیکن آج دنیا کے ایک کونہ میں بیٹھ کر ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ وہ اپنا پیغام ہر چہار سمت پہنچا سکتا ہے، ٹیلیفون کے ذریعہ سات سمندر پار رہنے والے لوگوں سے گفت وشنید کا ایسا رابطہ قائم کر سکتا ہے کہ گویا وہ اس کے سامنے موجود ہے۔ ٹیلی فون کے نظام میں مصنوعی سیاروں کی مدد نے اس کی تیز رفتاری اور ہمہ گیری میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

غور کیا جائے تو پیغام رسانی کے یہ ان دیکھے ذریعے اسلام کے بعض عقائد اور افکار کی تصدیق ہیں۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ اللہ کے حکم کا پابند ہے، گویا ہر شئی کو اللہ تعالیٰ کا پیغام ملتا رہتا ہے اور اسی کے مطابق پوری کائنات سرگرم عمل رہتی ہے۔ وحی کا نظام بھی کچھ اسی طرح ہے کہ کبھی براہِ راست اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے مخاطب ہوتا ہے، کبھی منشاءِ ربانی نبی کے قلب پر نقش ہو جاتا ہے، کبھی فرشتے اَن دیکھی صورت میں پیغمبر کے پاس آتے ہیں اور اسے اللہ کا کلام سناتے ہیں۔ مادہ پرستوں کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ پیغمبروں پر کس طرح وحی نازل ہوا کرتی تھی اور کائنات کو کس طرح خدا کا پیغام ملتا ہے، حالاں کہ ان کے درمیان کوئی ظاہری رابطہ موجود نہیں؟ ریڈیائی لہروں کے

ذریعہ پیغام رسانی کے اس انظام نے اس نظریہ کو مشاہدہ بنادیا کہ کسی ظاہری رابطہ کے موجود نہ ہونے کے باوجود ایک جانب سے دوسری جانب پیغامات کی ترسیل ہوسکتی ہے۔ جب عاجز انسانوں نے اس کی طاقت حاصل کرلی ہے تو قادرِ مطلق کے لئے یہ کیا دشوار ہے؟۔

انسانیت کے لئے نفع بخش ایجادات میں سے ایک ٹیلیفون ہے، جو فاصلوں کو کم کرتا ہے۔ جغرافیائی فاصلوں کے باوجود ایک کو دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رکھتا ہے اور شاعروں کی زبان میں ''ہجر'' کو ایک گونہ ''وصال'' بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ۱۸۷۶ء میں ''الگزینڈر گراہام بَیل'' کے ذہن رسا نے فون کو وجود بخشا اور اب موبائل فون نے گویا اس نظام کو اوجِ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ اب فون کا ہونا اعلیٰ سرکاری عہدیدار یا بڑے تاجر یا صنعت کار ہونے کی علامت نہیں، بلکہ آہستہ آہستہ فون رکھنا شہری زندگی کے لوازم میں سے ہوتا جارہا ہے۔ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی مفید چیز کا حاصل ہوجانا ہی بڑی کامیابی ہے، لیکن شاید یہ درست نہیں۔ کسی چیز کے حصول سے زیادہ اہم اس کا استعمال ہے اور یہ رہنمائی ہمیں قرآن وحدیث ہی سے مل سکتی ہے کہ کس چیز کا استعمال کس طرح ہو؟ استعمال کا کون سا طریقہ روا ہے اور کون سا ناروا؟

فون دراصل ایک طرح کی ملاقات ہے، اس لئے بنیادی طور پر جو احکام وآداب ملاقات کے ہیں وہی فون پر گفتگو کرنے کے بھی ہیں۔ آپ ﷺ نے کسی کے یہاں جانے کا یہ ادب بتایا ہے کہ پہلے سلام کرے پھر داخل ہونے کی اجازت چاہے۔ (ابوداؤد عن کلدۃ بن حنبل) اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی مسلمان کو فون کیا جائے تو پہلے ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' کہنا چاہئے۔ چوں کہ سلام کے یہ کلمات مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں، اس لئے غیر مسلموں کو کسی اور کلمۂ احترام سے مخاطب کرنا چاہئے۔ غیر محرم مردوں اور عورتوں کو سلام کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ (ردالمحتار ۲۶۱/۵) کہ اس میں فتنہ کا اندیشہ ہے، چوں کہ فون پر گفتگو میں یہ اندیشہ کم ہے: اس لئے ایک حد تک فون پر اگر اچانک غیر محرم سے ملاقات ہوجائے تو سلام کی گنجائش ہے، لیکن احتیاط بہتر ہے۔

بعض حضرات فون کرتے ہوئے اپنا نام نہیں بتاتے، بلکہ بعض اوقات تو دریافت

کرنے کے باوجود نام بتانے سے گریز کرتے ہیں، یہ بُری بات ہے۔ اس سے مخاطب کو وحشت ہوتی ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ سلام کرنے کے بعد خود ہی اپنا نام بتادے کہ میں فلاں شخص گفتگو کر رہا ہوں۔ ایک بار حضرت جابر رضی اللہ عنہ خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے، دروازہ پر دستک دی، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: کون؟ عرض کیا: میں، آپ ﷺ نے ان کے اس جواب کو ناپسند فرمایا۔ (بخاری و مسلم عن جابر) کیوں کہ ''میں'' سے آنے والے کو پہچانا نہیں جا سکتا ہے، اس لئے اپنے نام کی صراحت ضروری ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے، تو فرمایا: ''یستاذن ابو موسیٰ'' یعنی ابوموسیٰ حاضری کی اجازت چاہتا ہے، اسی طرح فون کرتے ہوئے پہلے اپنا نام بتادے۔

جس شخص سے گفتگو کرنی ہو، اگر اس کا نام ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہ ہو تو خود ہی وضاحت کر دینی چاہئے کہ میں فلاں شخص ہوں اور فلاں شخص سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی نظیر آنحضرت ﷺ کے مکتوبات ہیں، کہ آپ ﷺ نے جتنے خطوط لکھے ہیں، ان میں خط کے آغاز پر اپنا نام اور پھر مکتوب الیہ کا نام لکھا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب تم کسی کے گھر جاؤ، تین بار گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرو اور اجازت نہ ملے بلکہ خاموشی اختیار کی جائے، تو واپس آجاؤ۔ (بخاری و مسلم عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ) ٹیلیفون کی گھنٹی گویا ملاقات کی اجازت حاصل کرنا ہے، لہٰذا اگر تین بار فون کی گھنٹی بجنے کے باوجود فون نہ اٹھایا جائے تو سمجھنا چاہئے کہ اس وقت ملاقات کی اجازت نہیں ہے اور فون کا ریسیور رکھ دینا چاہئے۔ بار بار گھنٹی بجا کر تنگ نہ کرنا چاہئے۔

آپ ﷺ کا طریقہ تھا کہ دروازہ پر اس طرح دستک دیتے اور اس طرح سلام کرتے کہ سونے والوں کی نیند خراب نہ ہونے پائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رات دیر گئے یا ایسے اوقات میں شدید ضرورت کے بغیر فون کرنے سے گریز کرنا چاہئے جس میں مخاطب کے سونے اور آرام کرنے کا معمول ہو۔ اگر کسی شخص سے طویل گفتگو کرنی ہو تو چاہئے کہ پہلے اجازت حاصل کر لی جائے کہ مجھے اتنی دیر گفتگو کرنی ہے، اگر مناسب ہو تو

اسی وقت گفتگو کریں یا کوئی وقت مقرر کردیں، اس میں دونوں کے لئے راحت ہے۔ قرآن مجید نے کسی کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت لینے کا اصول بتاتے ہوئے کہا ہے کہ یہی تمہارے لئے باعث پاکیزگی ہے۔ ''ھو ازکی لکم'' (النور: ۲۷) یعنی اس اخلاق اور برتاؤ سے تمہارے قلوب ایک دوسرے سے پاک اور صاف رہیں گے۔ قرآن کے اس حکم سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگر کوئی شخص اپنی مشغولیت کی وجہ سے گفتگو کرنے سے معذرت کردے، تو اس کا برا نہ ماننا چاہئے اور نہ اسے تکبر پر محمول کرنا چاہئے، کیوں کہ ہر شخص کے اپنے مشاغل ہوتے ہیں، اس میں دخل اندازی کسی طرح مناسب نہیں۔

قرآن مجید نے ایسی جگہوں پر بلا اجازت آنے کی اجازت دی ہے جو رہائشی نہ ہوں۔ (النور: ۲۹) اس سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ پبلک مقامات جیسے ایرپورٹ، ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ، سرکاری اور نجی عوامی اداروں کو ان کے مقررہ اوقات کار میں کسی بھی وقت فون کیا جاسکتا ہے اور ان اداروں سے متعلق تفصیلی استفسار پیشگی اجازت کے بغیر بھی کرنے کی گنجائش ہے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم پر ملاقات کرنے والوں کا بھی حق ہے، ''ان لزورك عليك حقا'' ملاقات کے لئے آنے والوں کا حق یہی ہے کہ ان سے ملاقات کی جائے اور کسی شرعی یا طبعی مجبوری کے بغیر ملاقات سے انکار نہ کیا جائے، کہ اس میں ملاقات کو آنے والے کے ساتھ بے احترامی اور بے مروتی کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی حکم ٹیلیفون کا بھی ہوگا۔ بلا وجہ فون پر گفتگو کرنے اور جواب دینے سے انکار کرنا بد اخلاقی کی بات ہے اور ایک طرح کی حق تلفی ہے، اس سے بچنا چاہئے۔ اسی طرح جھوٹ بولنا اور رہتے ہوئے موجود نہ رہنے کی اطلاع دینا گناہ ہے، البتہ اگر جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے جھوٹ بولنے کے سوا چارہ نہ ہو اور سچی اطلاع دینے میں کسی مسلمان کو ناحق گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو، تو ایسی صورت میں ایک اہم تر مقصد کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہے، لیکن عام حالات میں اس طرح جھوٹ بولنا نہ شرعاً درست ہے اور نہ اخلاقاً۔

آج کل بعض ایسے فون بھی ہیں جن کے استعمال کرنے کی صورت میں فون کرنے

والے اور وصول کرنے والے دونوں ہی کو پیسے ادا کرنے ہوتے ہیں، ایسی صورت میں فون کر کے ہم فون وصول کرنے والے کو زیر بار کرنے کے بھی مرتکب ہوتے ہیں۔ ایسے فون کا استعمال دو ہی صورتوں میں درست ہو سکتا ہے، یا تو پہلے ہی سے فون پر بات کرنے کی اجازت لے لی گئی ہو یا فون کرنے والا دوسرے فریق کی اُجرت بھی ادا کرنے کو تیار ہو اور اس سے وہ مطلوبہ اُجرت ادا کرنے کی پیشکش کرے۔

بعض حضرات فون میں موسیقی لگا لیتے ہیں کہ اگر فون کرنے والے کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے، تو وہ اس ساز سے محظوظ ہو سکے، اسلام نغمہ و موسیقی اور ساز و سارنگی کا قائل نہیں، اس لئے فون کے ساتھ موسیقی کے ساز لگانا کراہت سے خالی نہیں، یہ اخلاقی تقاضوں کے بھی مغائر ہے؛ کیوں کہ ہر فون کرنے والا اس موسیقی کے سننے پر مجبور ہوگا، یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص تکلیف دہ خبر دینے والا ہو، ظاہر ہے ایسے لوگوں کے لئے یہ موسیقی بارِ خاطر ہی ہوگی۔

بعض جگہ بار بار فون کر کے اور فون کی گھنٹیاں بجا کر پریشان کرنے کے واقعات سننے میں آتے ہیں، ایسی بھی شکایتیں سنی جاتی ہیں کہ فون پر گالی گلوج کیا جاتا ہے، فحش باتیں کہی جاتی ہیں، دھمکیاں دی جاتی ہیں اور دوسروں کو ہراساں کیا جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں سخت ناپسندیدہ اور گناہ ہیں، یہ نہ صرف اسلام کے خلاف ہیں بلکہ عام تقاضۂ اخلاق کے بھی مغائر ہیں، اور گناہ بے لذت بھی، جن سے خود کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے۔

فون ایسی ملاقات ہے جس کی اُجرت ادا کرنی ہوتی ہے، اس لئے فون پر مختصر اور ضروری باتیں کرنا چاہئے، غیر ضروری اور خواہ مخواہ لمبی گفتگو کرنا اسراف اور فضول خرچی ہے اور فضول خرچی کو اسلام نے جتنی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے، وہ ظاہر ہے۔ آپ ﷺ نے خوش کلامی کو پسند فرمایا ہے، اس لئے کسی متعارف شخص کا فون ہو یا غیر متعارف شخص کا، نرم گفتگو کرنی چاہئے، جس سے مخاطب مانوس ہو، گفتگو خشک اور روکھی نہ ہو، البتہ عورتوں کو غیر محرم مردوں سے گفتگو کرنی پڑے تو اس کا خیال رہے کہ بات چیت میں لوچ اور حلاوت

کا اظہار نہ ہو، اس سے منع کیا گیا ہے، کیوں کہ ایسی گفتگو مریضانہ ذہن رکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوسکتی ہے۔

ملاقات کا ادب یہ ہے کہ ملاقات کے اختتام پر دوبارہ سلام کیا جائے، یہی آپ ﷺ کی سنت ہے، لہٰذا فون پر بھی گفتگو کا اختتام سلام ہی پر ہونا چاہئے، تاکہ اس سنت پر عمل ہوسکے، غرض فون ایک بڑی نعمت ہے، لیکن اگر اس کے استعمال میں شرعی حدود وآداب کی رعایت ملحوظ نہ رکھی جائے تو اسی قدر باعث زحمت بھی ہے۔

(۱۳؍ نومبر ۱۹۹۸ء)

تہذیب کے نام پر بدتہذیبی

رسول اللہ ﷺ نے قیامت کی جو علامات بتائی ہیں، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ بہت سی برائیوں کا مہذب اور شائستہ ناموں سے ارتکاب کریں گے، شراب پئیں گے لیکن ان کے نام بدل دیں گے، سود کھائیں گے اور ان کا نام کچھ اور دے دیں گے، دراصل یہ برائی کی سب سے بدترین شکل ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں بھلائی کے نام سے برائی کی جاتی ہے، تہذیب کے نام پر بدتہذیبی کو روا رکھا جاتا ہے، آزادی کے نام پر نفس کی غلامی کی راہ ہموار کی جاتی ہے، اسلام جس وقت اس دنیا میں آیا، اس وقت بھی کم وبیش یہی کیفیت تھی، عربوں کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو دین ابراہیمی کا حامل کہتے تھے، لیکن پوری طرح شرک میں ملوث تھے، بہت سے لوگ مرد اور عورتیں بے لباس کعبۃ اللہ کا طواف کرتے تھے، اور اسے نیکی تصور کرتے تھے، کہ جن کپڑوں میں ہم نے گناہ کیا ہے، ان میں کیوں کر طواف کیا جائے، اہل مکہ اپنی امتیاز کو قائم رکھنے کے لئے میدان عرفات نہیں جاتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم اہل حرم ہیں، حدود حرم سے باہر کیسے جائیں۔

جب کوئی انسانی گروہ گناہ کا عادی ہو جاتا ہے، اور جانتے بوجھتے گناہ کو روا رکھتا ہے، اس کا طریقہ کار یہی ہوتا ہے، وہ بدی کو نیکی اور برائی کو اچھائی ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے، مغربی تہذیب نے آج یہی صورت اختیار کر رکھی ہے، آج بہت سی مسلمہ اخلاقی برائیاں، تہذیب وثقافت کے نام پر روا ہوگئی ہیں، جو لوگ اس سے اختلاف رکھتے ہوں اور اسے برا جانتے ہوں ان کو تہذیب ناآشنا اور متشدد سمجھا جاتا ہے، اور آج کل تو ایسے لوگ بنیاد پرست اور انتہاء پسند بھی کہے جاتے ہیں، اور پوری قوت کے ساتھ اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ طوعاً یا کرہاً مغربی ثقافت کو اہلِ مشرق پر مسلط کر دیا جائے۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی ''یوم عاشقاں'' کا فتنہ ہے، جو ۱۴؍ فروری کو منایا جاتا ہے،

مغربی ممالک میں تو مدت سے اس کی دھوم سنی جاتی تھی ، ہندوستان میں لوگ اسے کسی مہذب قوم کے کھنڈرات کی طرح واقعہ عبرت کے طور پر ذکر کیا کرتے تھے، لیکن عالمیانہ کی نئی اصطلاح کے تحت مشرقی ممالک میں مغربی تمدن کی جو یلغار شروع ہوئی ہے، اس کے نتیجے میں اب ہندوستان میں بھی آوارہ خیال لوگوں کے لئے یہ ایک محبوب دن بن گیا ہے، سنا ہے کہ اس مناسبت سے ایک دوسرے کو بھیجنے کے لئے فحش مضامین اور فحش تصویروں کے کارڈ چھپ رہے ہیں، خاص اس مناسبت سے کیک بنائے جارہے ہیں، اگر اس حیا سوز سلسلہ کو روکا نہیں گیا تو اندیشہ ہے کہ یہ بداخلاقی کی اشاعت وترویج کا بہت بڑا ذریعہ بن جائے گا ، اور معاشرہ پر نہایت ہی منفی اثرات مرتب ہوں گے ، پھر ہمیں اس تہذیب کو بھی قبول کرنے کے لئے تیار رہنا ہوگا جس میں انسان کو اپنے جسم پر لباس بھی بوجھ محسوس ہونے لگے ، جس میں نکاح کے بندھن سے انسان کو اپنی آزادی مقید ہوتی نظر آتی ہے، اور جس میں نفس پرستی کی لہریں شرافت واخلاق کے ساحل سے گریزاں رہتی ہیں ، کیا ہم دیارِ مشرق میں اور ہندوستان جیسے مذہبی ملک میں جہاں مسلمان ہی نہیں، ہندو بھی عفت وعصمت کو انسانی جوہر سمجھتے ہیں، اور جن کے نزدیک سیتا کا سب سے بڑا وصف اس کی حیاء اور پاکدامنی تھی ، دین واخلاق اور شرافت وحیاء سے آزاد ثقافت کو دعوت دینا چاہتے ہیں۔

اسلام نے حیاء کو کس قدر اہمیت دی ہے؟ کہ اسے ایمان کا ایک جزء قرار دیا گیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حیاء بہرصورت خیر وبھلائی ہے: **الحیاء شعبة من الایمان** (مسلم حدیث نمبر: ۵۷) حضرت عمران بن حصین سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حیا بہرصورت خیر وبھلائی ہے: **الحیاء خیر کله** (ابوداؤد حدیث نمبر: ۴۷۹۶) حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ جس شخص کو حیاء نہ ہو وہ کسی بھی برائی کا مرتکب ہوسکتا ہے: **اذا لم تستحی فافعل ماشئت** (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۷۹۷) حیاء دراصل انسان کو برائی سے باز رکھنے اور نیکی کی طرف لے جانے والی طاقت ہے۔

حیاء ہر معاملہ میں مطلوب ہے، رسول اللہ ﷺ کو اگر کوئی ایسا مسئلہ بیان کرنا ہوتا جو

مرد وعورت کے صنفی معاملات سے متعلق ہوں تو اس کے لئے بہت ہی پردہ دار تعبیر اختیار فرماتے، خواتین کو اگر ایسا مسئلہ پوچھنا ہوتا تو وہ ازواج مطہرات کے واسطہ سے دریافت کرتیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مذی یعنی وہ مادہ جو صنفی ہیجان کے وقت انسان کے جسم سے نکلتا ہے، اور جس کی نوبت جنسی اتصال سے پہلے پیش آیا کرتی ہے، کے بارے میں حضور ﷺ سے سوال کرنا تھا۔ تو چوں کہ حضرت فاطمہ صاحبزادئ رسول آپ رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں، اس لئے مارے حیاء کے آپ ﷺ سے دریافت نہیں کر سکے، اور حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے استفسار کرایا۔

خود رسول اللہ ﷺ کی حیاء کا حال یہ تھا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ کنواری لڑکی سے بھی زیادہ حیاء دار تھے آپ ﷺ کی حیاء کا حال یہ تھا کہ کبھی کسی غیر محرم کے ساتھ آپ نے تنہائی اختیار نہیں فرمائی، عورتوں میں اللہ تعالیٰ نے حیاء کا عنصر زیادہ رکھا ہے، اور یہ ان کی فطرت اور ضرورت کے عین مطابق ہے، اسی لئے ان کے لئے پردہ کے احکام رکھے گئے، ساتر لباس کو مردوں اور عورتوں کے لئے ضروری قرار دیا گیا، نماز میں خواتین کی صف پیچھے رکھی گئی، نکاح میں کنواری لڑکی کے لئے خاموشی کو رضامندی قرار دیا گیا، اور زبان سے اظہار ان کے لئے ضروری نہیں سمجھا گیا، میاں بیوی کو ہدایت دی گئی کہ وہ خلوت کی باتوں کو لوگوں سے مخفی رکھیں، اور انہیں دوسروں کے سامنے زبان پر بھی نہ لائیں، لباس و پوشاک، آواز، چال ڈھال، گفتگو، غرض تمام امور میں تقاضۂ حیاء کو ملحوظ رکھنے کی تلقین کی گئی۔

افسوس کہ لوگوں نے محبت کے لفظ کو بھی بدنام کر دیا ہے، اور بے شرمی اور بے غیرتی کو محبت جیسا باعزت نام دے دیا ہے، محبت بے غرض اور پاکیزہ چاہت کا نام ہے، جس چاہت کا مقصد نفس کی آگ کو غذا فراہم کرنا اور بے لگام خواہشات کی پیاس بجھانا ہو وہ بے غرض چاہت نہیں ہے، جو چاہت محض ہوس نفس کی تکمیل سے عبارت ہو، وہ تو پاکیزگی سے ناآشنا ہے، اسلام دین محبت ہے، اس نے ہر شئی سے محبت کا سبق دیا ہے، خدا سے محبت، خدا کے رسول ﷺ سے محبت، ہر مسلمان اور ہر انسان سے محبت، اللہ کی ہر مخلوق سے

محبت، ماں باپ اور بھائی بہنوں سے محبت، یہ ایک تحفۂ محبت ہے، جسے ہر شخص اور ہر جگہ پر پیش کرنا ہے، اس میں پاکیزگی ہے، اس میں بے غرضی ہے، اور اس میں دوام و پائیداری ہے۔

مرد و عورت کا ایک دوسرے کی طرف رجحان یہ بھی فطرت انسانی کا ایک حصہ ہے، اور خاندانوں کی تشکیل کے لئے یہ ایک سماجی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے حلال اور جائز صورت رکھی ہے، اگر کوئی لڑکا کسی لڑکی کی طرف میلان محسوس کرتا ہو تو شریعت میں اس کے لئے ایک پاکیزہ طریقہ ہے کہ خاندان کے بزرگوں کے ذریعہ سلسلہ جنبانی کیا جائے، اور طرفین کی رضامندی سے ایک دوسرے کے ساتھ رفاقت کا معاہدہ کر لیا جائے، جسے ''نکاح'' کہتے ہیں، اس میں پاکیزگی ہے، یہ چند دنوں اور چند مہینوں کے لئے نفس کی تسکین کا سامان خریدنا نہیں ہے، بلکہ زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ دینے اور ہمیشہ دکھ سکھ کو بانٹنے کا ایک باعزت معاہدہ ہے، یہ معاہدہ خود غرضی کا نہیں، بلکہ ایک دوسرے کے بوجھ کو اٹھانے کا ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نکاح دو انسانوں کے درمیان محبت پیدا کرتا ہے، یہ پاکیزہ محبت ہے، اسی لئے جوں جوں حسن و شباب ڈھلتا جاتا ہے، ایک دوسرے کے ساتھ شفقت اور حسن سلوک کے جذبات بڑھتے جاتے ہیں، نفسانی چاہت کا حال یہ ہے کہ جو طبیعتیں اس کی خوگر ہوتی ہیں وہ ہرجائی بن جاتی ہیں، کچھ دنوں کی دلچسپی کے بعد ان میں ایک دوسرے سے اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے، بے رخی اور بے توجہی بڑھنے لگتی ہے۔ جو ایک دوسرے کے لئے بے چین رہتے تھے، وہ ایک دوسرے سے اپنا دامن بچانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں، اور اس تعلق کے بوجھ ہونے کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے۔

نکاح عورت کا اعزاز اور اس کا احترام ہے، اور زندگی بھر تعلق کو نباہنے کا پیمان ہے، اور عشق و محبت کے نام پر مغربی تہذیب نے جس چاہت کا سبق سکھایا ہے، یہ ہوس کی پرستش اور ناپاک اور خود غرضانہ چاہت ہے، اس میں عورتوں کی تذلیل و تحقیر اور اس کی رسوائی کا سامان ہے، اور اکثر اوقات اس کا استحصال ہے، آج مغرب خدا کی نافرمانی اور قانونِ فطرت سے بغاوت کی سزا چکھ رہا ہے، کہ ان کی زندگی سکون کی نعمت سے محروم ہے،

وہ ان گلہائے حسن و جمال سے عاجز آچکے ہیں جن میں وفا کی خوشبو نہیں، جس میں انسان کو ایک کربناک بڑھاپے سے گذرنا پڑتا ہے، جہاں بے غرض محبت کے لئے کوئی جگہ نہیں، جہاں ایک مرد یا عورت سانس سے زیادہ قریب رہنے والے ساتھی کے بارے میں بھی یہ اطمینان نہیں کرسکتا کہ اس کی محبت اس کے لئے وقف ہے، اور اس کی وفاداریاں اٹوٹ اور ناقابل یقین ہیں۔

کیا ہم مذہب کی گرویدہ حیاء اور وفاء کی پرستار اور بے غرض محبت کی ترجمان کی سرزمین میں حیاء و اخلاق سے آزاد اس تہذیب کو خوش آمدید کہنا چاہتے ہیں۔

(۸؍فروری ۲۰۰۲ء)

خدائی منصوبہ بندی یا خاندانی منصوبہ بندی؟

ہم جس کائنات میں رہتے ہیں، وہ جس قدر خوبصورت ہے، اسی قدر منصوبہ بند بھی ہے۔ صبح سے شام تک دنیا میں جو کچھ واقعہ پیش آتا ہے، غور کیا جائے تو وہ ایک پروگرام اور منصوبہ بندی سے مربوط ہے۔ قدرت کے مرتب کئے ہوئے نظام الاوقات کے مطابق ہی سورج اپنی آنکھیں کھولتا ہے اور اپنی روشن اور گرم کرنوں کے ذریعہ دنیا کے ذرہ ذرہ کو روشن اور گرم کرتا جاتا ہے، انسان ہو کہ چرند و پرند، ہر ایک اپنی غذا کی تلاش میں زمین پر دوڑ پڑتے ہیں، پھر جب انسان دن بھر کی محنت سے تکان محسوس کرنے لگتا ہے، تو سورج اپنی کرنوں کو سمیٹنے لگتا ہے، یہاں تک کہ سورج چھپ جاتا ہے اور رات اپنی دلآویز چاندنی یا سیاہ نقاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے، تا کہ انسان ہو یا چرند و پرند، اپنے گھر کو واپس آجائیں، راحت و آرام کی سانس لیں اور رات کی سیاہ چادر میں منہ چھپا کر سو جائیں۔ اس پرسکون اور خاموش فضا میں شبنم مسلسل ان پر نثار ہوتا رہتا ہے اور گل بوٹے بھی عطر بیزی کرتے رہتے ہیں، کہ دن بھر کا تھکا مسافر چند ساعت سکون و راحت کے ساتھ گزار لے۔

پھر خدا نے اس زمین کے لئے کیسے کیسے موسم رکھے، سخت گرمی کہ بدن جھلسا جا رہا ہو، یہ گرمی جو بظاہر تکلیف اور زحمت کا باعث ہے، سمندر کو گرماتی ہے اور جوش دیتی ہے، یہاں تک کہ اس سے بھاپ نکلنے لگتا ہے، پھر ہوائیں آتی ہیں اور اس بھاپ کو اپنی آغوش میں اٹھائے اٹھائے فضاؤں میں گھومتی رہتی ہیں اور انہیں جمع کر کے بادل بناتی ہیں، ٹھیک جب گرمی اپنے شباب پر ہوتی ہے تو یہ پانی سے بھرپور بادل زمین کی طرف اُترتے ہیں اور کائنات کی پیاس بجھاتے ہیں، زمین پانی کو اپنے اندر جذب کرتی ہے اور اپنا سینہ چیر کر لہلہاتی ہوئی سبزہ زار کھیتیاں حضرت انسان کے حوالہ کرتی ہیں، زمین انہیں پالتی ہے، بارش ان کو پانی پلاتی ہے اور

شبنم ان پودوں کی بے روح بالیوں کو دانے کے وجود میں آنے کا باعث بنتا ہے۔ کتنے منصوبہ اور حسن انتظام کے ساتھ قدرت کا یہ کاروبار بلا وقفہ اپنا کام کر رہا ہے۔

پھر مختلف نباتات اور حیوانات کی افزائش کا نظام بھی دیکھیں ! تو قدرت کی وسیع منصوبہ بندی کا شاہکار ہے۔ شیر کو سب سے طاقتور حیوان مانا گیا ہے، بڑا سے بڑا جانور اس کے لئے لقمۂ تر ہے، اپنی حفاظت اور مدافعت اس پر چنداں دشوار نہیں، لیکن شیر کی نسلیں ختم ہوتی جاتی ہیں اور آج شیر کی نسلوں کو باقی رکھنے کے لئے کتنے ہی جوکھم کئے جا رہے ہیں، ہاتھی اس سے بھی بڑے حجم کا جانور ہے، اس کا ایک قدم کئی انسانوں کی جان لینے کے لئے کافی ہے؛ لیکن اس کی نسلیں بھی دن بدن کم ہوتی جاتی ہیں، بکری ایک کمزور اور نحیف الجثہ جانور ہے اور ایک کتا بھی اس کو پھاڑ کھانے کے لئے کافی ہے، ایک ایک دن میں اور ہر ہر شہر میں ہزاروں بکریاں ہیں، جو انسان کی غذا بن جاتی ہیں، لیکن اس کے باوجود بکری کی نسل میں روز افزوں اضافہ ہے اور کبھی اس کی کمی کی شکایت نہیں ہوئی، گائے بیل بمقابلہ ہاتھیوں کے کس قدر کمزور اور عاجز ہیں اور ہر دن کتنی ہی بڑی تعداد میں ذبح ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی وافر تعداد میں موجود ہیں۔ مقام فکر ہے کہ کیا یہ سب کسی تدبیر و منصوبہ بندی کے بغیر ہو رہا ہے اور کیا اس کے پیچھے کسی حکیم اور علیم و خبیر کا ہاتھ نہیں؟

یقیناً یہ سب کائنات کے خالق و رب کا بنایا ہوا منصوبہ ہے، جو پوری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ درخت کا ایک پتہ جو زمین پر گرتا ہے اور بلوں میں رہنے والی معمولی جسم و جثہ کی چیونٹی جو پیدا ہوتی ہے اور مرتی ہے، وہ اس کے مقرر کئے ہوئے منصوبہ کا ایک حصہ ہے، اسی لئے قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کو رب العالمین قرار دیا ہے، یعنی کائنات کے انتظام و انصرام کو ہر لحہ براہِ راست انجام دینے والا، جس خدا نے سورج اور چاند سے لے کر چیونٹی و مچھر تک کے لئے ایک منصوبہ بنا رکھا ہے، کیا اس نے انسانیت کے لئے جو اس کائنات کا حاصل اور مقصود ہے، کوئی منصوبہ نہیں بنا رکھا ہوگا؟ وہ حکیم اور رب ہے، رزق کی ذمہ داری اس نے قبول کی ہے اور اس شان سے قبول کی ہے کہ شیر و ہاتھی سے لے کر مچھر اور مکھی تک کے لئے روزی کا سامان کرتا ہے:

• " وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا" (ہود:۶) تو کیا اس نے اس کا

انتظام نہ کیا ہوگا کہ خلیفۂ کائنات حضرت انسان کی تعداد تو روز بروز بڑھتی جائے، لاکھ سے کڑور اور کڑور سے اربوں ہو جائے، لیکن ان کے لئے رزق کے وسائل اس نسبت سے محدود تر ہوتے جائیں گے، تو آخر یہ کیا کھائیں گے اور کیوں کر اپنی ضروریات پوری کریں گے؟۔

نہ کوئی صاحب ایمان ایسا سوچ سکتا ہے اور نہ کوئی صاحبِ عقل اس پر یقین کر سکتا ہے، قرآن مجید نے خوب کہا ہے کہ خدا کے پاس ہر چیز کے خزانے موجود ہیں، لیکن وہ اس میں سے ایک متعین مقدار انسان کو عطا فرماتے ہیں، " وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ" (الحجر:۲۱) یعنی جیسے انسانی ضروریات بڑھتی جاتی ہیں، اسی نسبت سے اللہ تعالیٰ وسائل بھی بڑھاتے جاتے ہیں۔ جب ایک معمولی سربراہِ خاندان اپنے افرادِ خاندان کی فکر رکھتا ہے اور ان کی تعداد کی نسبت سے ان کی خورد و نوش کا انتظام کرتا ہے، تو کیا خدائے حکیم و خبیر اپنی مخلوق سے غافل رہ سکتا ہے، جو اسی کے حکم و اشارہ سے دُنیا میں آئی ہے؟۔

کوئی بھی شخص دُنیا میں افرادی قوت میں اضافہ اور زمین کی پیداوار میں اضافہ کے تناسب کو دیکھے تو وہ قرآن کے اس بیان کی تصدیق پر مجبور ہوگا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی گراں قدر تالیف ''ضبط ولادت'' میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ برطانیہ کے ایک تجزیہ نگار نے ۱۸۹۸ء میں چیلنج کیا تھا کہ افزائش آبادی میں کثرت اور وسائل پیداوار کے محدود ہونے کی وجہ سے تیس سال میں یہ کیفیت ہو جائے گی کہ لوگوں کو اپنی ضروریات کے لئے گیہوں نہیں مل سکے گا، لیکن صورت حال یہ ہے کہ اس کے بعد کئی تیس سال گزرے اور گیہوں کی پیداوار میں اتنا اضافہ ہوا کہ بعض ملکوں کو قیمت پر کنٹرول رکھنے کے لئے فاضل گیہوں نذرِ آتش کرنے پڑے یا سمندر میں ڈبو دیئے گئے۔

کرۂ ارض کی وسعت کے اعتبار سے انسانی آبادی کا حال یہ ہے کہ فی مربع کیلومیٹر صرف اکیس افراد کا اوسط ہوتا ہے اور زمین پر انسانی آبادی کی صلاحیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہالینڈ میں فی مربع کیلومیٹر ۳۴۵ آدمی تمام سہولتوں کے ساتھ اقامت پذیر ہیں۔ جاپان میں یہ تناسب اور بھی زیادہ ہے۔ گویا موجودہ آبادی کئی گونہ بھی

بڑھ جائے تو اقامت ورہائش کا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوگا، پھر اس پر غور فرمائیے کہ زمین کا کتنا حصہ ہے، جسے انسان کے لئے غذائی وسائل حاصل کرنے کی غرض سے آباد کیا جاتا ہے؟ اعداد وشمار کے مطابق زمین کا صرف دس فیصد حصہ اس وقت زیر کاشت ہے، بیس فیصد حصہ جنگلات وغیرہ پر مشتمل ہے اور ستر فیصد حصہ وہ ہے جسے قابل کاشت بنایا جاسکتا ہے اور ابھی افتادہ پڑا ہوا ہے، جتنے مالی وسائل حکومتیں خاندانی منصوبہ بندی کی ترویج اور پروپیگنڈہ پر خرچ کرتی ہیں، اگر وہی وسائل ان افتادہ اراضی کو قابل کاشت بنانے پر صرف ہوں، تو انسانیت کی بھلائی اور خیر خواہی کا بڑا کام ہوگا۔

پھر زراعتی سائنس کی ترقی نے بھی پیداوار کو بڑھانے میں حیرت انگیز کردار ادا کیا ہے غور فرمائیے کہ ہندوستان میں فی ایکڑ گیہوں کی پیداوار کا اوسط ۲۹/ کوئنٹل اور پاکستان میں ۳۰/ کوئنٹل ہے اور اسی کا اوسط مصر میں ۹۵/ کوئنٹل اور ڈنمارک میں ۱۶۳/ کوئنٹل ہے۔ یہ ۱۹۵٦ء کا تجزیہ ہے اور یقیناً اس اوسط میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہوگا۔ اس وقت پسماندہ ملکوں میں جس چیز کی ایک فصل حاصل کی جاتی ہے، ترقی یافتہ ممالک میں اسی کی تین تین فصلیں حاصل کی جاتی ہیں۔ اگر ایشیاء کے غریب ممالک ایٹم بم اور میزائل بنانے اور ۳۵، ۴۰ فیصد دفاعی ٹکنالوجی کے بجائے زراعتی اور طبی ٹکنالوجی حاصل کریں، تو نہ کسی گھر میں فاقہ کی نوبت آئے اور نہ کاشت کار خودکشی کرنے پر مجبور ہوں!

یہ تو اعداد وشمار پر مبنی تجزیے ہیں، لیکن کچھ حقیقتیں اور تجربات ہیں، جن کو ہر شخص محسوس کرسکتا ہے۔ جن لوگوں کی عمریں تیس چالیس سال ہیں، وہ لوگوں کے موجودہ معیارِ زندگی اور پچیس تیس سال پہلے کے معیارِ زندگی کا تقابل کرکے دیکھ لیں، تو نمایاں فرق محسوس کریں گے، ایک زمانہ تھا کہ لوگوں کے لئے ٹرین میں تھرڈ کلاس کا سفر بھی دشوار ہوتا تھا، سیکنڈ کلاس اور فرسٹ کلاس کے مسافرین خال خال ہوا کرتے تھے، لیکن آج صورتِ حال یہ ہے کہ ٹرین کے اونچے درجے پہلے پر ہوجاتے ہیں اور ہوائی جہاز میں سیٹ حاصل کرنے کے لئے ویٹنگ لسٹ میں جگہ لینی پڑتی ہے۔ دو تین دہے پہلے قصبہ جات ہی نہیں اوسط درجہ کے شہروں میں بھی زیادہ تر خام اور سفال پوش مکانات ہوا کرتے تھے، پختہ مکان اور خوبصورت حویلیاں رئیسوں اور

زمینداروں کی ہوا کرتی تھیں، لیکن آج صورتِ حال یہ ہے کہ حکومت جن علاقوں کو سلم علاقہ قرار دیتی ہے، وہاں بھی ایک سے ایک عالی شان اور خوبصورت مکان مل جاتے ہیں، شخصی سواری کی حیثیت سے پندرہ بیس سال پہلے سائکلیں بھی ایک اہمیت رکھتی تھیں اور بہت کم لوگ تھے جن کو موٹریں میسر تھیں، لیکن آج اعلیٰ سے اعلیٰ اور قیمتی سے قیمتی موٹروں کا اژدحام شہروں میں فضائی آلودگی کا مسئلہ پیدا کررہا ہے۔

یہی حال کھانے پینے کے معیار کا ہے۔ چوتھائی صدی پہلے جس معیار کی دعوت نوابوں اور بڑے رئیسوں کے لئے مخصوص سمجھی جاتی تھیں، اب عام آدمی بھی دعوت میں اس معیار کو بر قرار رکھنا ضروری خیال کرتا ہے۔ مرغیوں اور انڈوں کی جو افزائش اس دور میں ہوئی ہے اور اس نے غریبوں کے لئے ان چیزوں کو جتنا سہل الحصول بنا دیا ہے، ماضی میں اس کا تصور بھی دشوار تھا، ریڈیو، ٹی وی، ٹیلیفون اور اس طرح کی جدید گراں قیمت ایجادات اب دولت مند ہونے کی علامت نہیں ہیں، بلکہ اوسط سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے سماج میں بھی ان کا استعمال عام ہے، اور پوری دُنیا میں آبادی کے مسلسل بڑھنے کے باوجود فی کس آمدنی میں نمایاں اضافہ ہوتا جارہا ہے، کیا اس کے باوجود خدا کی رزاقیت سے مایوس ہونے اور یہ سوچنے کا جواز ہے کہ اگر انسان بڑھ گئے تو وہ کیا کھائیں گے اور کہاں رہیں گے؟۔

یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ خود قدرت نے آبادی کی تحدید اور افزائش نسل میں اعتدال و توازن کا کوئی خیال نہیں رکھا ہے، نوعِ انسان ہی کے مسئلہ کو دیکھئے کہ عورت کے اندر فطری نظام کے تحت ہر سال کم سے کم ایک بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت ہے، اسی طرح اگر ایک خاتون اپنی ازدواجی زندگی کے پچیس سال تولید اور حمل کی صلاحیت کی حامل رہی تو اس کے پچیس بچے ہونے چاہئیں، لیکن ایسی مثالیں بھی شہر میں خال خال ہی ملیں گی کہ کوئی عورت دس بارہ بچوں کی ماں ہو، اب تو اس طرح خبریں اتنی انوکھی ہوگئی ہیں کہ وہ اپنی ندرت کی وجہ سے اخبار کی سرخی بن جاتی ہیں۔ یہ قدرت کی منصوبہ بندی ہی تو ہے کہ مرد و عورت کی تولیدی صلاحیت کے اعتبار سے اس کا کنبہ نا قابل بیان حد تک مختصر ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ انسان اس دُنیا میں حادثات کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ طوفان،

سیلاب، قحط، زلزلے، آتش فشاں پہاڑوں کا اُبل پڑنا، آتشزدگی، وبائی امراض کا پھیلنا، ٹرین اور ٹریفک کے حادثات، یہ اور اس طرح کے کتنے ہی قدرتی اسباب ہیں، جس میں ہر سال لاکھوں جانیں ضائع ہوتی ہیں اور انسان خود اپنے ہاتھ اپنی ہلاکت کا جو سروسامان کررہا ہے اور کرتا رہا ہے، وہ ان سب سے سوا ہے، پہلی جنگ عظیم میں روس کو چھوڑ کر صرف یورپ میں دو کروڑ چوبیس لاکھ افراد کی کمی واقع ہوئی، صرف جرمنی میں انیس لاکھ افراد جنگ میں کام آئے۔ دوسری جنگ عظیم میں بھی ایک کروڑ ہلاکتوں کا اندازہ کیا گیا ہے اور اب انسان نے جس اعلیٰ درجہ کے ہلاکت خیز اور تہلکہ انگیز ہتھیار تیار کئے ہیں، خوانخواستہ اگر تیسری جنگ عظیم ہوجائے، تو نہ معلوم کتنے لوگوں کا خون پی کر یہ آسودہ ہوگی؟ اسی طرح قدرتی طور پر انسانی آبادی کا ایک قابلِ لحاظ حصہ ہر سال غیر معمولی حادثات اور واقعات کی نذر ہوجاتا ہے۔ یہ قدرت کی منصوبہ بندی ہی تو ہے، جو اپنے خاموش ہاتھوں سے نسل انسانی کی تحدید کرتی جارہی ہے۔

جن ملکوں اور قوموں نے خاندانی منصوبہ بندی کے اس نسخہ کو آزمایا ہے، وہ اس کے مضر پہلوؤں کو کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں، افرادی وسائل کی کمی، زنا اور بدکاری کی کثرت اور اس کی وجہ سے امراض خبیثہ کی بہتات، بے اولاد یا کم اولاد ہونے کی وجہ سے زوجین میں ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی قوت کا فقدان اور اس کی وجہ سے طلاق کی کثرت، شرح پیدائش اور نکاح کے رجحان میں کمی، یہ وہ نتائج ہیں، جن سے آج مغربی اقوام دوچار ہیں، تو کیا ہم نوشتۂ دیوار کو پڑھتے اور انسان کی خودساختہ خاندانی منصوبہ بندی کے بجائے خدائی منصوبہ بندی کے ساتھ چلنے کو تیار نہیں ہیں؟

(۳۱ر جولائی ۱۹۹۸ء)

تمباکو نوشی ــــ اسلامی نقطۂ نظر

۲۱ر فروری کے اخبار میں یہ خوش کن خبر دیکھنے کو ملی کہ حکومت آندھرا پردیش گٹکھا پر پابندی عائد کر رہی ہے، کوئی بھی پان مصالحہ گٹکھا کا مہر کے ساتھ اب ممنوع ہوگا، حکومت کے اعلامیہ میں بتلایا گیا ہے کہ ۱۹۹۷ء میں 8.56 فیصد منہ کے کینسر کے مریض تھے، 2000ء میں یہ تعداد بڑھ کر 21.43 فیصد ہوگئی، جو دراصل گٹکھا کی خراب عادت کا نتیجہ ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ بُری عادت کس طرح بہ تدریج معاشرہ میں سرایت کرتی جارہی ہے، اور کتنے ہی لوگوں کے خون سے اپنی پیاس بجھارہی ہے۔

تمباکو خواہ کسی بھی صورت میں ہو، صحت کے لئے سخت نقصان دہ اور مضرت رساں ہے۔ عالمی صحت تنظیم کی رپورٹ کے مطابق ہر سال تمباکو خوری کی وجہ سے تقریباً ۳۰ر لاکھ افراد کی اموات واقع ہو جاتی ہے، جن میں ۲۰ر لاکھ اموات کا تعلق ترقی یافتہ ممالک سے ہے، یہ بیسویں صدی کے دسویں دہے کے وسط کی رپورٹ ہے، اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر تمباکو نوشی کا یہ رجحان باقی رہا تو ۲۰۲۵ء تک دنیا بھر میں سالانہ ایک کروڑ اموات ہو سکتی ہیں، یہ ایسا بھیانک خطرہ ہے جو کسی خون ریز جنگ کے خطرہ سے بھی بڑھ کر ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تمباکو کی ابتداء امریکہ کی سرزمین سے ہوئی ہے، ۱۵ر ویں صدی کے اخیر میں کرسٹوفر کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا تھا، وہاں کولمبس نے سب سے پہلے اصل امریکی باشندوں جن کو اس نے ریڈ انڈیا کا نام دیا، کو تمباکو پیتے ہوئے دیکھا تھا، اس وقت ایشیا، یورپ اور افریقہ کے لوگ اس سے قطعاً ناواقف تھے، پھر یہ بلا امریکہ سے اسپین اور پرتگال پہنچی، پرتگال سے اس نے فرانس کا سفر طے کیا، اور فرانس نے اس کی کاشت کو فروغ دینے اور اسے مقبول عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا، یورپ ہی کے ذریعہ ایشیا تک اس کی رسائی ہوئی، اور اس وقت تقریباً سو ممالک میں تمباکو کی باضابطہ

کاشت کی جاتی ہے۔

چین اور امریکہ کے بعد تمباکو کی سب سے زیادہ کاشت ہمارے ملک ہندوستان ہی میں ہوتی ہے، حکومت کو تمباکو کے ٹیکس سے سالانہ ایک عرب پچاس کروڑ ڈالر ملتے ہیں، ایک اندازہ کے مطابق ہمارے ملک میں ۵۲ر کروڑ کیلوگرام تمباکو پیدا کیا جاتا ہے، اس میں سے نصف مقدار برآمد کردی جاتی ہے، اور باقی ہندوستان ہی میں مختلف صورتوں میں استعمال کی جاتی ہے، ۱۵ر لاکھ کسان تمباکو اگاتے ہیں، ۱۰ر لاکھ تمباکو فارم ہیں، جس میں ۵۰ر لاکھ افراد کام کرتے ہیں،

ہندوستان میں کہا جاتا ہے کہ تمباکو کی ابتداء جنوب کے علاقہ سے ہوئی، کیوں کہ انگریز ہندوستان میں اسی طرف سے داخل ہوئے تھے، ایک صاحب علم اس پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> امریکہ کا جنگلی تمباکو آج کل بھی بمبئی، ٹراونکور اور لنکا میں بکثرت پیدا ہوتا ہے، مآثر رحیمی میں رقم ہے کہ تمباکو پہلے دکن میں آیا، اور وہاں سے اکبر کے زمانہ میں شمالی مشرقی ہند میں پہنچا، (خواص تمباکو: ۱۳ر۱۴)

تمباکو خوری کی خُو ایسی ہوتی ہے کہ اس کو چھوڑنا آسان نہیں ہوتا، ایسا نہیں ہے کہ زمانۂ قدیم میں لوگ تمباکو کی مضرتوں سے واقف نہ رہے ہوں، تمباکو کی تاریخ جتنی قدیم ہے تمباکو کی مضرت کا احساس بھی اسی قدر قدیم رہا ہے، سرکاری طور پر اس کے مضر صحت ہونے کا اعلان پہلی دفعہ ۱۶۰۴ء میں فرمان روانے برطانیہ جیمس اول نے کیا، اور پھر اس کے نقصانات دن بہ دن لوگوں پر واضح ہوتے چلے گئے، ۱۸۵۹ء میں فرانس کی وہ رپورٹ سامنے آئی جس میں ایک ہسپتال میں کینسر کے مریضوں کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں جس کے مطابق پیٹ، گلے اور منہ کے کینسر کے کل مریضوں کی تعداد ۶۶ر تھی، اور یہ سبھی تمباکو کو استعمال کرنے والے لوگ تھے۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد سگریٹ نوشی میں بہت اضافہ ہوگیا، اور اس عادت نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، ۱۹۶۴ء میں امریکہ کی ایک تنظیم کی جانب

سے دوسالہ تحقیقات کا نتیجہ پیش کیا گیا، جس میں بتایا گیا کہ امریکی مردوں میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک پھیپھڑے کے کینسر کے مریضوں میں ستر فیصد شرح اموات کا اضافہ ہوگیا ہے، امریکہ میں جو تمباکو جنم واتا ہے، تمباکو نوشی کے روک تھام کے لئے بہت سی کوششیں بھی کی گئی ہیں، سب سے پہلے امریکہ ہی میں ۱۹۶۶ء میں سگریٹ کے پیکٹوں پر تمباکو کے مضر صحت ہونے کی عبارت لکھنی لازم قرار دی گئی اور یکم جنوری ۱۹۶۶ء سے اس کا نفاذ ہوا، یکم جنوری ۱۹۷۱ء سے سگریٹ کا اشتہار ٹی وی پر بند کر دیا گیا، لیکن ان کوششوں کے باوجود صورت حال یہ ہے کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں ۱۹۹۱ء میں تمباکو نوش کی وجہ سے ساڑھے تین لاکھ افراد کی موت واقع ہوگئی اور خود ہندوستان میں ہر سال آٹھ لاکھ افراد تمباکو نوشی کی وجہ سے لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔

دنیا میں اس وقت جو مشہور مذاہب پائے جاتے ہیں، ان سب کے مذہبی پیشواؤں نے تمباکو نوشی کی مذمت کی ہے، ہندو مذہبی کتابوں میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے، سکھوں کے دسویں گرو گرو گوبند سنگھ نے تو اپنے متبعین کے لئے تمباکو کی بہت ہی سختی کے ساتھ ممانعت کی ہے، جس پر سکھ فرقہ کا عمل بھی ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر اس سلسلہ میں واضح ہے، قرآن مجید نے کچھ بنیادی اصول حلال وحرام ہونے کے سلسلہ میں بتایا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ پاک وطیب ہیں، وہ حلال ہیں، اور جو خبیث ہو وہ حرام ہیں: ''**یحل لهم الطيبت ويحرم عليهم الخبائث**'' (الأعراف: ۱۵۷) خبیث سے ایسی چیزیں مراد ہیں، جس کو سلیم طبیعتیں ناپسند کرتی ہوں: **تستخبثه الطباع السليمه و تنفر منه** (التفسير الوجيز للزحيلي ۱۷۱) ___ اور یہ بات ظاہر ہے کہ تمباکو کی ہر صورت عموماً اور گٹکھے کی یہ نئی شکل خصوصاً ثقہ اور شریف لوگوں کی نگاہ میں نہایت ناپسندیدہ اور مذموم ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ انسان اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لے: ''**لاتلقوا بايديكم الى التهلكة**'' (البقرة: ۱۹۵) ___ اور اس طرح کی چیزوں کا استعمال انسان کو ہلاکت سے قریب اور مہلک بیماریوں میں مبتلاء کر دیتا ہے،

پھر اس سے انسان کو کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں، نہ اس سے بھوک دور ہو سکتی ہے، نہ اس سے دل ودماغ کو جلاء حاصل ہوتی ہے، اور نہ کسی حصہ جسم کو اس سے کوئی نفع پہونچتا ہے، اور اس مضرِ صحت خو کی وجہ سے انسان اپنی گاڑھی کمائی اس بے فائدہ کام میں خرچ کرتا چلا جاتا ہے، اس لئے یہ خرچ یقیناً فضول خرچی میں داخل ہے اور اللہ تعالیٰ نے فضول خرچی کو منع فرمایا ہے: **ولا تسرفوا** (الانعام:۱۴۱)— بلکہ فضول خرچی کرنے والے کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا: "**ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین**" (الاسراء:۲۷)

رسول اللہ ﷺ نے ہر ایسی چیز سے منع فرمایا ہے، جو انسان کو نشہ میں مبتلاء کرنے والی، یا اس کے جسم کو کمزور اور اس کی صحت کو متاثر کرنے والی ہو: **نهى رسول الله ﷺ عن كل مسكر ومفتر** (الحدیث) — گٹکھا بھی یقیناً مفتر چیزوں میں داخل ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایسی چیزوں سے بھی منع فرمایا جو مضرت رساں ہو، خواہ اس کی ذات کے لئے یا دوسروں کے لئے: "**لاضرروا لاضرار**" گٹکھا اور سگریٹ وغیرہ خود اس کے لئے ضرر رساں ہے اور اس کا دھواں دوسروں کو بھی نقصان میں مبتلاء کرتا ہے۔

اسی لئے بعض فقہاء نے تمباکو حرام اور بعض نے مکروہ تحریمی قرار دیا ہے، علامہ علاء الدین حصکفیؒ رقمطراز ہیں:

> "**وكذا تحرم جوزة الطيب وكذا النتن الذي شاع في زماننا ولاسيما بعد نهي ولي الامر نصره الله.**"
>
> (الدر المنتقی علی ہامش مجمع الانہر ۵۳۲/۲، کتاب الاشربہ)
>
> "ایسا ہی جائفل اور تمباکو جو ہمارے زمانہ میں عام ہو گیا ہے، حرام ہے، خاص کر سلطان (اللہ ان کی مدد کرے) کی طرف سے ممانعت کا فرمان جاری ہونے کے بعد۔"

گو اکثر علماءِ احناف نے اور ہندوستان میں ماضی قریب کے اہلِ علم نے تمباکو مباح یا صرف مکروہ تنزیہی قرار دیا ہے، لیکن ایسا اس وجہ سے کہ تمباکو کے استعمال کی متنوع صورتیں، اس میں پائے جانے والے زہرناک اجزاء اور صحت کے لئے اس کا شدید

مضرت رساں ہونا، ان حضرات کے سامنے غالباً نہیں آیا تھا، خاص کر گٹکھے کی مضرت اور اس کی وجہ سے منھ میں کینسر کا پیدا ہونا، اور ہونٹوں کی وضع کا سکڑ جانا ایک عام مشاہدہ ہے، اس لئے اس کو خبائث میں شمار کیا جانا چاہئے، جو لوگ گٹکھے استعمال کرتے ہیں وہ بھی اپنے اس عمل کو اپنے بزرگوں کی نظر سے چھپاتے ہیں اور مہذب وشائستہ مجالس میں اس کے ارتکاب سے گریز کرتے ہیں، یہ خود اس بات کی علامت ہے کہ سلیم طبیعتوں کے لئے یہ ایک ناگوار شئی ہے۔

اس لئے گٹکھا اور اس طرح کے مضرت رساں تمباکو کی مصنوعات کو یوں تو حرام ہونا چاہئے، لیکن اگر از راہِ احتیاط حرام نہ کہا جائے، تو یہ مکروہ تحریمی اور قریب بہ حرام ضرور ہیں، حکومت کا یہ اقدام خوش آئند اقدام ہے، ہمیں اس کو سراہنا چاہئے، جو لوگ اپنے آپ کو ملک وقوم کے بہی خواہ اور محب وطن کہتے ہیں، ان کو لوگوں میں نفرت کی سوداگری کرنے کے بجائے ایسی چیزوں کے خلاف مہم جوئی کرنی چاہئے، اور سماج میں انسانوں سے نفرت کے بجائے مہلک انسانیت چیزوں سے نفرت کی تعلیم دے، تو یہ واقعی حب الوطنی کا صحیح ثبوت ہوگا۔

(یکم مارچ ۲۰۰۲ء)

پتی میں خون کی آمیزش

جام و مینا اور بادہ و ساغر ہمیشہ شاعروں کا محبوب اور ممدوح رہا ہے اور اکثر شعراء اس کے اسیر زلف رہے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ مرتے مرتے بھی ہمارے شاعروں کو شراب و کباب کی یاد تڑپاتی اور تر ساتی رہتی تھی، چچا غالب تو کہہ گئے ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دَم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

یہاں تک کہ جو لوگ دہن سے شراب کو نہیں لگاتے تھے وہ بھی اپنی شاعری کو ضرور ہی اس سے خمار آلود کرتے تھے، جب ہی تو ریاض خیر آبادی جیسے زاہد مزاج شاعر کے یہاں بادہ و مے کی بہتات سب سے بڑھ کر ہے، بلکہ کہنے والے نے کہا کہ:

بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

یہاں تک کہ مرزا حالیؔ کو اردو شعراء سے گلہ کرنا پڑا کہ ان کی شاعری تاڑی کی دکان ہو کر رہ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''رندان خوش مذاق'' کو چائے کی طرف کم توجہ ہوئی، کم سے کم اردو شعراء کے دیوان میں شاید ہی چائے کے بارے میں پانچ دس اشعار بھی مل سکیں، کیوں کہ اس میخانہ میں شراب طہور کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں تھی، ایک ملحد شاعر نے چائے پر کچھ کہا بھی، تو اس کو بھی ''الحاد'' سے آلودہ کر کے، کہ :

وہ تو کہیے عرب میں چائے نہ تھی
ورنہ وہ بھی حرام ہو جاتی

لیکن لگتا ہے کہ شاعر کا یہ اندیشہ اب شرمندۂ تعبیر ہونے کو ہے!

اس خبر نے یقیناً چائے پینے، پلانے اور بیچنے اور خریدنے والوں کو اچنبھے میں ڈال دیا ہوگا کہ بعض کمپنیاں چائے کو خوش رنگ بنانے کے لئے اس میں خون اور گوشت کے رس

کی آمیزش کر رہی تھیں، اور بی جے پی حکومت جو بانگِ دہل اپنے آپ کو ہندو فکر اور ہندو ثقافت کا ترجمان کہتی ہے، اور اس فلسفہ پر یقین رکھتی ہے کہ انسانی ضرورت کے لئے بھی حیوانات کو ذبح نہیں کرنا چاہئے، اور انسان کو لحمی غذاؤں کے بجائے جو حیوانات سے حاصل ہوتی ہیں، ساگ سبزی پر اکتفا کرنا چاہئے (اسی ضمن میں گاؤ کشی بند کرنے کی بات بھی بڑی قوت کے ساتھ کہی جاتی ہے، اور اس کے لئے تحریکیں چلائی جاتی ہیں) نے اس کے لئے پروانۂ اجازت بھی دے دیا تھا۔

باعثِ تعجب اَمر یہ ہے کہ خون کی آمیزش کے معاملہ میں کسی جانور کی تخصیص بھی نہیں، ذبیحہ ہو یا مردار، اور گائے ہو یا خنزیر، میں نے جب اخبار میں یہ خبر پڑھی تو ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی یاد آئی، اس تحریک کو جس خبر یا افواہ نے قوت پہونچائی، وہ یہی تھی کہ بندوق کے کارتوس جسے غالباً دانت سے کھینچنا پڑتا تھا، اس پر خنزیر کی چربی لگائی جاتی ہے، یہ خبر ایک آگ بن گئی، ایسی آگ جو بنگال سے اٹھی اور میرٹھ ہوتے ہوئے آتش فشاں بن کر دہلی پر ٹوٹ پڑی، لیکن آزاد ہندوستان میں آج کے اس واقعہ نے کوئی چنگاری بھی پیدا نہیں کی، کیوں کہ مال ومتاع اور معاشی ترقی کی حرص نے ملک سے اس کی غیرت کا سودا کر لیا ہے، اب بیرونی کمپنیاں صنعت وتجارت کی آڑ میں ہماری فکر پر وار کر سکتی ہیں، ہماری ثقافت کو تباہ و برباد کر سکتی ہیں، اور ہماری اس آزادی پر قہقہہ زن ہیں کہ عہد غلامی میں جو غیرت تھی، آزادی کی اس زندگی میں ہم اس سے بھی محروم ہیں۔

خون ایک ناپاک شئی ہے، قرآن مجید نے پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ خون کے ناپاک ہونے کا ذکر کیا ہے (النحل: ۱۱۵) اور غالباً اس کے ناپاک اور حرام ہونے پر تمام ہی مذاہب متفق ہیں، اسلامی شریعت میں اگر جانور کو شرعی طریقہ پر ذبح کیا جائے، تو اس کا پورا وجود حلال اور پاک ہو جاتا ہے، لیکن سات اجزاء وہ ہیں، کہ اس کے باوجود حرام رہتے ہیں، فقہ کی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے، ان ہی میں سے ایک خون ہے، حلال جانوروں کا گوشت چوں کہ ذبح کی وجہ سے پاک ہو جاتا ہے، اس لئے اس سے حاصل کیا گیا رس بھی اسلامی نقطۂ نظر سے پاک اور حلال ہے۔ لیکن حرام جانور کا کوئی بھی

جزء حرام ہی ہے، بعض صورتوں میں اس کا خارجی استعمال تو کیا جا سکتا ہے، لیکن کھانے پینے کی اشیاء میں کسی طور اس کا استعمال درست نہیں، خنزیر کے بارے میں اسلامی تصور یہ ہے کہ وہ سراپا نجاست ہے، اس کے کسی جزء کا جسم کے خارجی حصہ میں بھی استعمال کرنا اضطرار کی کیفیت کے بغیر جائز نہیں۔

پھر چائے ایسی جامد شئی ہے، جس میں سیّال مادہ کو جذب کرنے کی بہت صلاحیت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر خون چائے میں ملایا جائے، تو چائے اسے اپنے اندر پوری طرح سمو لیتی ہے، ایسی جذب کی صلاحیت رکھنے والی شئی میں اگر کوئی ناپاک چیز مل جائے، تو بعض فقہاء کے نزدیک اسے پاک کرنے کی کوئی صورت نہیں، اور بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ اسے تین بار پانی میں ابالا یا بھگایا جائے، اور ہر بار ابالنے سے پہلے خشک کر لیا جائے، تب ہی وہ پاک ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر پتی کو اس مرحلہ سے تین بار گذارا جائے، تو کیا خاک اس میں خوش ذائقی اور خوش رنگی باقی رہے گی؟ فقہاء کے یہاں ایک مسئلہ خون میں رنگے ہوئے کپڑوں کا ملتا ہے، جس سے چائے کے مسئلہ پر زیادہ وضاحت کے ساتھ روشنی پڑتی ہے، مشہور فقیہ علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

" ثم قال سيدى عبد الغني و هذا بخلاف المصبوغ بالدم كالثياب الحمر التي تجلب في زماننا عن ديار بكر فلا تطهر ابدا مالم يخرج الماء صافيا و يعفى من اللون . "

(ردالمحتار: ۱/۳۲، ۲۴۱)

"میرے بزرگ شیخ عبدالغنی نے فرمایا کہ یہ صورت اس صورت کے برخلاف ہے جب کہ کوئی چیز خون میں رنگی جائے، جیسے وہ سرخ کپڑے، جو ہمارے زمانہ میں دیار بکر کے علاقے سے لایا جاتا ہے، کہ جب تک اس کپڑے سے صاف پانی نہ نکلنے لگے، اور رنگ سے بالکل خالی نہ ہو جائے، وہ کپڑے قطعاً پاک نہیں ہو سکتے"

اس لئے حاصل یہی ہے کہ چائے میں اگر اس طرح کی کوئی ناپاک شئی مل جائے،

تو شرعاً وہ ناقابلِ استعمال ہے۔

بحث کا ایک اور پہلو بھی ہوسکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ فقہی نقطۂ نظر سے کسی شئی میں تغیر کی دو صورت ہوتی ہے، ایک یہ کہ وہ اپنے وجود کو باقی رکھتے ہوئے دوسری چیز کے ساتھ مل جائے، اور دونوں خلط ملط ہو جائیں، اس صورت میں اس شئی کا حکم باقی رہتا ہے، مثلاً پانی میں پیشاب مل جائے، تو پیشاب کے اجزاء پانی کی معمولی مقدار میں اپنے اثرات کے ساتھ باقی رہتے ہیں، اس لئے پیشاب کا حکم باقی رہے گا، اور وہ ناپاک ہی سمجھا جائے گا، دوسری صورت یہ ہے کہ شئی اپنی حقیقت کو کھو دے، اور اس کا وجود ہی باقی نہ رہے، جیسے گوبر آگ میں جلایا جائے اور راکھ ہو جائے، کسی نشہ آور مشروب میں نمک ڈال کر اسے سرکہ بنا دیا جائے، اور نشہ پیدا کرنے کی جو کیفیت اس مشروب میں تھی جس سے اس کی شناخت اور پہچان تھی، وہ کیفیت ہی مفقود ہو جائے، تو یہ کیفیت حقیقت کی تبدیلی سے عبارت ہے، اس لئے اس میں حکم بدل جاتا ہے، لہٰذا گوبر ناپاک ہے اور اس کی راکھ پاک، نشہ آور مشروب ناپاک ہے اور اس کا بنا ہوا سرکہ پاک اور حلال۔

پتی میں اگر خون ملایا جائے تو اس سے خون کی حقیقت اور ماہیت بدل نہیں جاتی، بلکہ وہ اپنے خواص کے ساتھ باقی رہتا ہے، اسی لئے چائے کے رنگ اور ذائقہ پر اس کا اثر پڑتا ہے، اس لئے اس پہلو سے بھی ایسی پتی ناپاک اور حرام ہی ہوگی۔

وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ چند ہی دنوں بعد تاجران چائے کی جانب سے یہ وضاحت آگئی کہ خون کی آمیزش اور حکومت کی جانب سے اس کی اجازت کا تعلق صرف بین الاقوامی کمپنیوں سے ہے، نہ کہ دیسی کمپنیوں سے، اس خبر نے یقیناً چائے پینے والوں کو سہارا دیا ہوگا، اور ایک حد تک انہیں اطمینان ہوا ہوگا۔ فقہی نقطۂ نظر سے جب صاحب معاملہ کوئی اطلاع دے، یا بیچنے والا اپنے سامان کے بارے میں حلال و جائز ہونے کی خبر، تو اس کی خبر معتبر ہوگی، اور اس پر اعتماد کرنا درست ہوگا، اس پس منظر میں ایسی کمپنیوں کی پتی استعمال کی جاسکتی ہے۔

اس واقعہ کے سلسلہ میں دو باتیں بڑی اہم ہیں، اول یہ کہ پتی کے بارے میں اس

انکشاف پر زیادہ تر آواز ہندو انتہاء پسندوں اور بنیاد پرستوں نے اٹھائی، مسلمان قائدین زیادہ تر اس پر خاموش رہے، چاہے یہ ان کی بے شعوری کی وجہ سے ہو یا کم ہمتی کی وجہ سے، بہر حال! یہ افسوس ناک بات ہے، افسوس کہ مسلمانوں میں جو لوگ بام اقتدار پر چڑھتے ہیں، وہ اپنے اقتدار کی حفاظت کو زیادہ ملحوظ رکھتے ہیں، اور دین اور امت کی حفاظت کو کم، حالاں کہ یہ مسلمان ہی ہیں، جو ان کے لئے سیڑھی کا کام کرتے ہیں ــــ دوسرا خوشگوار پہلو یہ ہے کہ اس واقعہ نے عام مسلمانوں میں بے چینی کی لہر دوڑا دی، خود راقم الحروف کو کتنے ہی بھائیوں نے فون کیا، خطوط لکھے، اور بالمشافہہ ملاقات کی، بلکہ بعضوں نے چائے سے احتیاط برتنی شروع کر دی، اور یقیناً دوسرے اہل علم اور ارباب افتاء کو بھی اس کا تجربہ ہوا ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی کتاب وسنت اور اپنے دین و مذہب سے عام مسلمانوں کا گہرا رشتہ ہے، وہ قدم قدم پر حلال وحرام کو سوچتا ہے، وہ مسجد میں عبادت کیلئے آیا ہو، یا دکان میں تجارت کے لئے بیٹھا ہو، وہ کہیں ملازم اور نوکر ہو، یا ذمہ دار وعہدیدار، رشتہ داروں کے ساتھ تعلق کا معاملہ ہو یا پڑوسیوں کے ساتھ، نکاح وطلاق کا مسئلہ ہو یا ترکہ ومیراث کا، آج بھی مسلمانوں کی بڑی تعداد زندگی کے ان مسائل میں علماء اور ارباب افتاء کی طرف رجوع کرتی ہے، شاید ہی کسی اور قوم میں اپنے دین اور اپنی شریعت سے ایسا گہرا ربط و تعلق پایا جاتا ہو، یہ یقیناً مقام شکر بھی ہے اور موقعۂ دعاء بھی کہ اللہ تعالیٰ امت میں اس کیفیت کو باقی رکھے!

(۱۸ر اگست ۲۰۰۰ء)

دستخط ـــــ اسلامی احکام

''دستخط'' کے اصل معنی ہاتھ کی تحریر کے ہیں ، لیکن اصطلاح میں دستخط کرنا اپنا نام لکھنے کو کہتے ہیں ۔ نام لکھنے کی ایک صورت یہ ہے کہ سادہ طریقہ پر اپنا نام تحریر کر دیا جائے ، جس کی نقل دوسروں کے لئے دشواری کا باعث نہ ہو ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس انداز پر نام لکھا جائے کہ اس کی نقل ایک گونہ دشوار ہو ، گویا یہ ایک علامتی تحریر ہے ، جو دستخط کرنے والے کی جانب سے کسی بات کی تصدیق و توثیق کو ظاہر کرتی ہے ، ایسی ہی تحریر کو عرفِ عام میں ''دستخط'' کہتے ہیں ۔

ایک زمانہ میں اس مقصد کے لئے مہر (Stamp) کا استعمال ہوا کرتا تھا ۔ یہ مہر انگوٹھی میں بنائی جاتی تھی ۔ ممکن ہے کہ انگوٹھی میں مہر بنانے کا مقصد اس کی حفاظت ہو ، کیوں کہ انگوٹھی ہر وقت آدمی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اسے چوری کرنا آسان نہیں ، اسی لئے عربی زبان میں انگوٹھی کے لئے خاتم کا لفظ معروف ہو گیا ، حالاں کہ ''ختم'' کے اصل معنی مہر لگانے کے ہیں اور قرآن میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے ۔ (البقرۃ : ۷) صلح حدیبیہ کے بعد جب مسلمانوں اور اہلِ مکہ کے درمیان ایک محدود مدت کے لئے ناجنگ معاہدہ ہو گیا اور آپ ﷺ کو دعوتِ اسلام کی طرف یکسوئی کے ساتھ توجہ کا موقع ملا ، تو آپ ﷺ نے شاہانِ عجم اور رؤساءِ عرب کو دعوتی خطوط بھیجنے کا ارادہ فرمایا ۔ اس موقع سے بعض حضرات نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ یہ حضرات مہر کے بغیر خطوط کو قبول نہیں کرتے ، چنانچہ آپ ﷺ نے مہر بنوائی جس پر ''محمد رسول اللہ'' کندہ کیا گیا اور آپ ﷺ نے کمالِ احترام کا لحاظ کرتے ہوئے نیچے ''محمد'' ، اس کے اوپر ''رسول'' اور سب سے اوپر ''اللہ'' کے کلمات لکھے ۔ (بخاری : ۸۷۳)

آپ ﷺ کا یہ عمل گویا دستخط کی اصل ہے ۔ دستخط کا مقصود چوں کہ کسی تحریر کے تشخص

اور استناد کو ظاہر کرنا ہے۔ یعنی یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ تحریر اسی شخص کی ہے اور مذکورہ شخص کی طرف اس کی نسبت قابلِ اعتماد و اعتبار ہے، اس لئے دستخط ایسا کرنا چاہئے، جس کی نقل ایک حد تک مشکل ہو اور اس کی تحریر کا تشخص محفوظ رہے، کہ اگر اس کی رعایت نہ کی جائے تو بدقماش لوگ اس کے مصنوعی دستخط کا سہارا لے کر تلبیس اور دھوکہ دہی سے کام لے کر دوسروں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ البتہ دستخط اتنا غیر واضح اور پیچ در پیچ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ صاحب دستخط کا نام ہی معلوم نہ ہو سکے اور پہلے سے نام معلوم نہ ہو تو دستخط میں اس نام کو پہچاننا دشوار ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کو اس بات سے منع فرمایا تھا کہ آپ ﷺ کی انگوٹھی کے نقش پر لوگ اپنی انگوٹھیاں بنائیں۔ (بخاری ومسلم عن ابن عمرؓ) اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کے دستخط کی نقل کرنا یا اپنے دستخط کو اس سانچے میں ڈھالنا جائز نہیں، اس لئے کہ یہ اس کے تشخص کو مجروح کرنا ہے، اور اس سے تلبیس اور دھوکہ دہی کا راستہ کھل سکتا ہے، بلکہ ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں کہ مہر اور دستخط کی نقل کر کے کسی شخص کی طرف خلافِ واقعہ بات منسوب کر دی گئی اور اس کو ظلم و جور اور افترا پردازی کا ذریعہ بنایا گیا۔

ظاہر ہے کہ شریعت میں دھوکہ دینا سخت گناہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ دھوکہ دہی انسان کو جہنم میں لے جاتی ہے، ''الخديعة في النار'' (بخاری ۱/۲۸۷ باب النجش) حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ جو دھوکہ دے اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ ''من غش فليس منا'' (ترمذی ۱/۲۴۵) اور جو چیز گناہ اور حرام کا ذریعہ بنتی ہو وہ خود بھی گناہ اور حرام ہے۔ پس دستخط کی نقل چوں کہ تلبیس اور دھوکہ دہی کا ذریعہ بن سکتی ہے، غلط دستخط کر کے حقوق چھینے جا سکتے ہیں، کسی شخص پر غیر واقعی ذمہ داریاں عائد کی جا سکتی ہیں اور کسی شخص کی طرف ایسی بات کو منسوب کیا جا سکتا ہے جس سے وہ بریٔ الذمہ ہے اور جو بات کسی خلافِ شرع کام کا ذریعہ بنتی ہے وہ خود بھی ناجائز ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ دستخط کی نقل جائز نہیں اور اس سے خوب اجتناب کرنا چاہئے۔

دستخط سے متعلق ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ شریعت میں کس حد تک دستخط کا اعتبار

ہے؟ اس سلسلہ میں فی الجملہ دستخط کا معتبر ہونا تو ظاہر ہے، کیوں کہ آپ ﷺ نے اپنے خطوط پر مہر لگائی ہے، جو دستخط کے قائم مقام ہے، اگر اس کا اعتبار نہ ہوتا اور شریعت میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی تو آپ ﷺ نے مہر لگانے کا اہتمام نہ فرمایا ہوتا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مقدمات اور نزاعی معاملات میں بھی دستخط کو ثبوت کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے؟ یہ سوال اہم اور علماء کے غور وفکر کا محتاج ہے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ حدود و قصاص -- یعنی ان سنگین جرائم سے متعلق مقدمات جن کی سزائیں شریعت میں معین و مقرر ہیں -- میں محض دستخط کی وجہ سے جرم ثابت نہیں ہوتا، اگر مطلوبہ گواہی موجود نہ ہو یا اس نے عدالت میں اپنے جرم کا اقرار نہ کیا ہو، البتہ دوسرے معاملات بالخصوص مالی مقدمات میں دستخط بھی ثبوت کی فراہمی کے لئے کافی ہو سکتا ہے کیوں کہ اسبابِ قضاء میں سے ایک ''قرائن قاطعہ'' بھی ہے (البحر الرائق: ۲۰۵/۷) یعنی کسی واقعہ پر ٹھوس اور واضح علامتوں کا موجود ہونا، دستخط بھی ایسی ہی علامتوں میں سے ہے۔

فقہاء کے یہاں بھی ہمیں اس سلسلہ میں بعض نظیریں ملتی ہیں۔ تحریر کس حد تک کس معاملہ کے ثبوت پر دلیل ہو سکتی ہے؟ اسلام کے عدالتی قوانین میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے (دیکھئے: تبصرۃ الحکام ۳۵۹/۱) اور فی الجملہ تحریر کو بھی ثبوت کا ایک ذریعہ تسلیم کیا گیا ہے، اس سے ''دستخط'' کے مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اگر دستخط سے قاضی کو اس تحریر کے درست ہونے کا بھروسہ ہو جائے اور ایسی وجوہ موجود ہوں جو اس تحریر کے معتبر ہونے کا تقاضا کرتی ہوں، تو دستخط کی وجہ سے وہ دستاویز اور اقرار نامہ معتبر ہوگا، اسی لئے قرآن مجید نے دین کو لکھ لینے کا حکم دیا ہے (بقرہ: ۲۸۲) اگر تحریر کی اہمیت نہیں ہوتی تو اس حکم کا کوئی معنی نہیں اور جب عام تحریر بھی معتبر ہے تو دستخط کا معتبر ہونا تو ظاہر ہے، اسی لئے اسلام کے قانونِ قضاء کے مشہور عالم قاضی ابن فرحون مالکیؒ (م ۷۹۹ھ) نے وثیقہ یعنی دستاویز کی شہادت کی اساس پر فیصلہ کرنے کا ذکر کیا ہے (تبصرۃ الحکام علی ہامش فتح العلی المالک ۸۳/۲-۸۲) پس خلاصہ یہ ہے کہ ایسی تحریریں جو دستخط سے مزین ہوں، شرعاً معتبر ہیں الا یہ کہ اس میں تلبیس

پائے جانے کی کوئی قوی وجہ موجود ہو۔

دستخط کے آداب میں سے یہ ہے کہ جس بات کی تصدیق مقصود ہو اس کے نیچے دستخط کیا جائے، اسی طرح خطوط و مراسلات میں بھی مکتوب نویس اپنا دستخط نیچے کرے، جیسا کہ آپ ﷺ نے اپنے مکتوبات میں نیچے مہر لگائی ہے۔ دراصل دستخط اور مہر کا مقصود سلسلۂ کلام کو وہاں ختم کرنے کے ہیں اور یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ آگے اس میں جو بھی اضافہ ہوگا وہ صاحبِ تحریر کی طرف سے تصدیق شدہ نہیں ہے، اسی لئے آپ ﷺ پر سلسلۂ نبوت کے اختتام کو ظاہر کرنے کے لئے قرآن مجید میں ''خاتم النبیین'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ (احزاب: ۴۰)

جو حکم دستخط کا ہے قریب قریب وہی احکام نشانِ ابہام، مہر اور لیٹر اور لیٹر پیڈ کے بھی ہیں۔ البتہ مہر اور لیٹر پیڈ میں بہ مقابلہ دستخط کے تلبیس اور دھوکہ دہی کا اندیشہ زیادہ ہے، کیوں کہ ان کی نقل آسان ہے، اس لئے اعتماد و اعتبار کے لحاظ سے بھی ان کا درجہ دستخط سے کم ہے۔ نشانِ ابہام میں دھوکہ دہی کا امکان بہت کم ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے انگوٹھے کے نشانات کو دوسرے سے ممتاز رکھا ہے، بظاہر انسان اس معاملہ میں دوسرے کی نقل کرنے پر قادر نہیں، اس لئے یہ زیادہ قابلِ بھروسہ ہے۔ اسی لئے یہ بات بہتر ہے کہ اہم معاملات کی دستاویزوں پر دستخط کے ساتھ ساتھ نشانِ ابہام بھی لے لیا جائے۔

آدمی کا ہر عمل اس کے مزاج و مذاق کا آئینہ دار ہوتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص تیز تیز چلتا ہو، تو یہ اس کے عجلت پسند ہونے کی علامت ہے، کوئی شخص اپنی مونچھیں اونچی کرتا ہو تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کے مزاج میں عُجب اور تکبر ہوگا، چال ڈھال، گفتار و رفتار اور نشست و برخاست کی طرح آدمی کی تحریر بھی اس کی اندرونی کیفیات کی غماز ہوتی ہے۔ اسی لئے ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ آدمی کا دستخط بھی اس کی اندرونی کیفیت اور صلاحیت کا عکس ہے۔ بعض لوگ اپنے دستخط اس طرح کرتے ہیں کہ گویا پھول بنا رہے ہیں، بعض لوگوں کا دستخط تلوار یا کسی ہتھیار کے مماثل ہوتا ہے، بعض دستخط بہت پر پیچ ہوتے ہیں، بعض ایسے جن سے کوئی نام ہی نہ سمجھا جا سکے اور بعض اتنے سادہ کہ گویا عام طریقہ پر

نام لکھ دیا گیا ہو۔ یہ آدمی کے جمالیاتی ذوق، حلم یا غضب، فکر وعمل کی صداقت یا نفاق، نیز ذہانت وغباوت کی کیفیتوں کو ظاہر کرتے ہیں، لیکن دستخطوں کے ذریعہ کسی شخصیت کے بارے میں قطعی رائے قائم کرنا دشوار ہے، کیوں کہ اکثر اوقات لوگ اپنی محبوب شخصیتوں کے دستخط کی نقل کرنا چاہتے ہیں اور تھوڑی تبدیلی کے ساتھ اسی کو اختیار کرتے ہیں، گویا یہ ان کا طبع زاد دستخط نہیں ہوتا، بلکہ یہ ایک طرح کی نقل ہے۔ ظاہر ہے اس کو دستخط کرنے والے کی اپنی اندرونی کیفیت کا مظہر قرار نہیں دیا جا سکتا، اس لئے محض دستخط کو کسی شخص کے مزاج اور صلاحیت کو سمجھنے کا ذریعہ تصور کرنا درست نہیں کہ اس سے بدگمانی اور غلط فہمی کا دروازہ کھل سکتا ہے اور کسی مسلمان بلکہ بلاوجہ کسی انسان سے بھی ''سوءِ ظن'' درست نہیں۔

(۲۳/اکتوبر ۱۹۹۸ء)

قرض —— فضائل ومسائل

اللہ تعالیٰ نے رزق کی تقسیم میں اپنے بندوں کے درمیان فرق کیا ہے، اور یکسانیت نہیں برتی ہے، یہی نابرابری ہے جس سے کائنات کا نظام جاری وساری ہے، اگر یہ نابرابری نہ ہوتی تو نہ کوئی شخص دوسرے کے یہاں ملازمت کا محتاج ہوتا، اور نہ کسی سرمایہ دار کو کوئی مزدور اور کارکن ہاتھ آتا۔ یہی احتیاج اور ضرورت بعض اوقات انسان کو قرض کے لین دین پر مجبور کرتی ہے، اگر جائز طریقے پر اہلِ ثروت اپنے غریب بھائیوں کو قرض دیدیں تو خود بخود سود کا راستہ بند ہو جائے، افسوس کہ ایک تو مسلمانوں میں یہ برادرانہ اسپرٹ باقی نہیں رہی کہ وہ اپنے زائد از ضرورت مال میں دوسرے غریب بھائیوں کا حق محسوس کریں، اور ان کو غیر سودی قرضے فراہم کریں، اور نہ لوگ قرض کے احکام ومسائل ہی سے واقف ہوں۔

قرض کے لین دین کا ثبوت قرآن سے بھی ہے اور حدیث سے بھی، اور اس پر اجماع واتفاق بھی ہے اور مصلحت انسانی کا تقاضا بھی ہے، قرآن نے اللہ کے راستہ میں انفاق کو "قرض حسن" قرار دیا ہے، (البقرہ ۲۴۵) اس میں قرض کے جائز بلکہ مستحب اور مطلوب ہونے کی طرف واضح اشارہ ہے، ایک جگہ "دین" کے ساتھ مدت لکھنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، (البقرۃ:۲۸۲) دین کا لفظ عام ہے اور قرض بھی اس کے دائرہ میں آتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود ارشاد نبوی ﷺ نقل کرتے ہیں کہ کسی مسلمان کو دو بار قرض دینا ایک بار صدقہ کرنے کے برابر ہے (سنن بیہقی: ۳۵۳/۵، ابن ماجہ ۶۰/۲ مع تحقیق: الاعظمی، وفیہ سلیمان وھو متروک) اور بھی متعدد روایتیں ہیں جن میں قرض دینے کی فضیلت وارد ہے، اسی لئے اس کے جائز ہونے پر امت کا اجماع ہے (المغنی: ۲۰۷/۴) پھر قرض ایک ایسی مصلحت ہے کہ بہت سے مواقع پر اس سے مفر نہیں ہوتا، اس لئے اگر اس کی

گنجائش نہ رکھی جائے تو تنگی اور دشواری کا باعث ہوگا اور نا قابلِ برداشت حرج وتنگی کو دور کرنا شریعت کا ایک اہم ترین مقصد ہے، ارشاد ربانی ہے: "ما یرید اللہ لیجعل علیکم من حرج" (المائدۃ:٦) نیز فرمایا گیا کہ اللہ تم پر آسانی چاہتے ہیں نہ کہ دشواری: "یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" (البقرۃ:۱۸۵)

قرض لینا گو مباح ہے لیکن قرض دینا مستحب ہے، کیونکہ یہ نیکی اور بھلائی میں تعاون ہے (الشرح الصغیر:۲۹۲/۳) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے قرض دین کی فضیلت اوپر مذکور ہو چکی ہے، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں نے جنت کے دروازہ پر شب اسراء میں لکھا ہوا دیکھا کہ صدقہ کا ثواب دس گونہ ہے اور قرض کا اٹھارہ گونہ، میں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے استفسار کیا کہ قرض صدقہ سے افضل کیوں ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ سائل رہنے کے باوجود دست سوال دراز کرتا (اور اس پر صدقہ کیا جاتا ہے) اور قرض کا خواستگار ضرورت ہی پر طلب گار قرض ہوتا ہے، (ابن ماجہ:۵٦/۲، رقم الحدیث:۲۴۳۱) نیز حضرت ابودرداءؓ سے مروی ہے کہ یہ بات کہ میں دو دینار قرض دوں پھر وہ واپس آجائیں اور میں ان کو کسی اور کو قرض دے دوں مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں ان کو صدقہ کر دوں۔ (المغنی:۲۰۷/۴) حضرت انسؓ کی ایک روایت میں آپ سے منقول ہے کہ کسی چیز کو قرض دینا اس کے صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔ "قرض الشئی خیر من صدقتہ" (سنن بیہقی:۳۵۴/۵)

ان روایات سے نہ صرف قرض کی فضیلت اور اس کا استحباب ظاہر ہوتا ہے، بلکہ مواقع واحوال کے لحاظ سے قرض کا بعض اوقات صدقہ سے بھی زیادہ باعثِ ثواب ہونا معلوم ہوتا ہے، اگر محتاج کی حاجت مندی کا یقین کر کے اُسے دیا جائے تو ظاہر ہے کہ صدقہ افضل ہے، لیکن اگر یقینی طور پر اس کا علم نہیں تو قرض کی فضیلت زیادہ ہے، اس لئے کہ جو لوگ خوددار طبیعت کے مالک ہوں وہ مجبوراً ہی قرض کے طالب ہوتے ہیں۔

قرض کے مستحب ہونے کا حکم، ظاہر ہے، اس وقت ہے جب قرض دہندہ کے علم یا اندازہ کے مطابق قرض کسی جائز ضرورت کے لئے لیا جا رہا ہو، اگر کسی مکروہ یا حرام و

معصیت کے ارتکاب کے لئے قرض لے، تو دانستہ اس مقصد کے لئے قرض دینا درست نہیں، مکروہ میں، تعاون بھی مکروہ، اور حرام کا تعاون بھی حرام ہے، کیونکہ جو حکم مقصد کا ہوتا ہے، وہی حکم ''ذریعہ'' کا بھی ہوتا ہے۔

قرض لینا مباح ہے (المغنی ۴/ ۲۰۷) خود آپ ﷺ سے قرض لینا ثابت ہے، البتہ یہ ضروری ہے، کہ جائز مقصد کے لئے قرض لیا جائے، ابن ماجہ میں روایت ہے، کہ اللہ تعالی قرض لینے والے کے ساتھ ہوتا ہے، جب تک وہ ادا نہ کرلے، سوائے اس کے کہ کسی ایسے مقصد کے لئے دین حاصل کرے جو اللہ کو ناپسند ہو (ابن ماجہ ۲/ ۵۶، رقم الحدیث: ۲۴۳۳) یا اس ارادہ سے قرض کرلے، کہ ادا نہیں کرنا ہے، یہ بھی گناہ کی بات ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے یہاں چور شمار کیا جائے گا (حوالۂ سابق، رقم الحدیث: ۲۴۳۴) ایک اور روایت میں ہے کہ جو شخص دوسروں کا پیسہ ڈبانے کے لئے قرض کرلے، اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کردیں گے، (حوالہ سابق: رقم الحدیث: ۲۴۳۶) حضرت میمونہؓ راوی ہیں کہ جو شخص اس ارادہ سے دین لے کہ اسے ادا کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کا دین ادا کرادیں گے، (حوالہ سابق: رقم الحدیث ۲۴۳۲) ـــــ غرض شدید ضرورت کے بغیر اور غیر شرعی ضرورت کے لئے، نیز عدم ادائیگی کی نیت سے قرض لینا گناہ ہے، جائز مقصد کے لئے، ضرورت کی وجہ سے اور حسب وعدہ ادا کرنے کی نیت سے قرض لینا مباح اور جائز ہے۔

اگر مقروض تنگدستی میں مبتلا ہو، تو اس کو مزید مہلت دینی چاہئے، اور ممکن ہو تو کچھ معاف بھی کردینا چاہئے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، جو اللہ کے سایہ میں رہنا چاہتا ہے، اسے چاہئے کہ تنگدست شخص کو مہلت دے، یا اس کا کچھ حصہ معاف کردے (حوالہ سابق: رقم الحدیث: ۲۴۴۴) پھر آپ نے یہ بھی ہدایت فرمائی کہ قرض کی ادئیگی کا مطالبہ مناسب طریقے پر کرنا چاہئے۔ (حوالۂ سابق: باب حسن المطالبۃ)

جہاں ایک طرف آپ ﷺ نے قرض دہندہ کو، حسنِ سلوک کی ہدایت دی، وہیں مقروض کو بھی تلقین فرمائی کہ وہ قرض خواہ کے ساتھ زیادتی نہ کرے، اور بہتر معاملہ رکھے، باوجود استطاعت کے، قرض کی ادائیگی میں کوتاہی اور ٹال مٹول کو آپ ﷺ نے بہت ناپسند

فرمایا ہے، اور فرمایا کہ یہ چیز، اس کی بے عزتی اور سزا کا جواز پیدا کر دیتی ہے، "**لی الواجد یحل عرضه و عقوبته**" (ابن ماجہ: ۶۰/۲، رقم الحدیث: ۲۴۵۲) یہاں تک کہ آپ ﷺ نے متوفی کے مال میں سے پہلے اس کا دین ادا کرنے کا حکم فرمایا، (ابن ماجہ: ۶۰/۲، رقم الحدیث: ۲۴۵۸) یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو دَین کی ادائیگی میں بہتر ہو (ابن ماجہ: ۶۰/۲، رقم الحدیث: ۲۴۴۸) ایک حدیث میں وارد ہے کہ مومن کی روح اس کے دین کے ساتھ معلق رہتی ہے، تا آں کہ اس کی طرف سے ادا کر دیا جائے۔

(ابن ماجہ: ۶۰/۲، رقم الحدیث: ۲۴۳۷)

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ جس کا انتقال ہو اس پر ایک دینار یا درہم بھی باقی ہو تو اسے اس کی نیکیوں میں سے وصول کیا جائے گا۔

(ابن ماجہ: ۶۰/۲، رقم الحدیث: ۲۴۳۹)

قرض دہندہ کو قرض پر نفع حاصل کرنا اور شرط لگانا کہ مقروض سے اضافہ کے ساتھ واپس کرے حرام ہے، اور سود میں داخل ہے کیونکہ آپ ﷺ نے قرض پر نفع حاصل کرنے سے منع فرمایا اور بعض روایتوں میں اسے سود قرار دیا گیا "**کل قرض جر منفعة فهو ربا**" (دیکھئے: تلخیص الحبیر: ۳۴/۳) اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔

مقدار میں اضافہ تو حرام ہے ہی، کیفیت میں عمدگی کی شرط لگانا بھی جائز نہیں، مثلاً معمولی چیز دی اور شرط لگائی کہ اس کے بدلے بہتر چیز واپس کرے، یہ بھی درست نہیں (ھندیہ: ۲۰۲/۳) اگر قرض دہندہ نے شرط تو نہ لگائی لیکن مقروض نے بہ طور خود عمدہ چیز واپس کی یا زیادہ مقدار کے ساتھ واپس کی، تو ایسا کرنا جائز ہے۔

آج کل بعض ادارے قرض جاری کرتے ہیں اور قرض کے تناسب سے مقروض سے ماہانہ فیس رکنیت وصول کرتے ہیں، یہ صورت بھی جائز نہیں اور یہ بھی سود کے دائرہ میں آتا ہے ایسے قرض کو غیر سودی قرض کہنا محض دھوکہ ہے۔

فقہاء نے نہ صرف یہ کہ قرض پر اضافہ کو ناجائز قرار دیا اور اس کو نفع اٹھانے کا ذریعہ بنانے سے منع فرمایا ہے بلکہ بالواسطہ طریقہ پر قرض سے نفع حاصل کرنے کا راستہ

بھی بند کردیا، مثلاً مقروض قرض دہندہ سے کوئی معمولی چیز گراں قیمت میں خرید ے، یہ بھی مکروہ ہے (الدر المختار علی ہامش الرد: ۱۹۵/۴) اسی طرح یہ صورت بھی مکروہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص قرض لینے کے لئے آئے تو قرض دہندہ ساٹھ روپیہ تو اسے قرض کے دیدے اور بیس روپیہ کی چیز اسے چالیس روپیہ میں فروخت کردے تا کہ مقروض کے یہاں اس کے سو روپیہ ہو جائیں حالانکہ مقروض کو اس سے اسی روپیہ ہی حاصل ہوگا (ردالمحتار: ۱۹۵/۴)

سودخوار کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور سود کے چور دروازوں کو بند کرنے کی غرض سے آپ ﷺ نے مقروض کی طرف سے تحائف کے قبول کرنے میں بھی احتیاط برتنے کا حکم دیا ہے، حضرت انس ؓ سے آپ ﷺ کا ارشاد مروی ہے کہ جب کوئی قرض دے اور مقروض کوئی تحفہ دے یا اپنی سواری پر بیٹھائے تو اسے قبول نہ کرنا چاہئے سوائے اس کے کہ پہلے سے ان کے درمیان باہم تحائف کا لین دین رہا ہو (ابن ماجہ: ۸۱۳/۲) حضرت اُبی ابن کعبؓ جہاد کی غرض سے عراق کی طرف سے جارہے تھے تو زر بن جیش نے حضرت اُبی ؓ سے کہا کہ آپ ایسی جگہ جارہے ہیں جہاں سود کا عام رواج ہے، اس لئے اگر آپ کسی کو قرض دیں اور وہ آپ کو قرض کے ساتھ کچھ تحفہ بھی دیں تو اس کا تحفہ قبول نہ کریں۔

اسی بنا پر فقہاء نے بھی مقروض کی ہدایات اور دعوتوں میں احتیاط کا حکم دیا، حنفیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو لوگ پہلے سے دعوت نہ دیتے رہے ہوں یا ہدایا و تحائف کا معمول نہ رہا ہو تو ایسی دعوت و تحفوں کا قبول کرنا جائز نہیں ہاں معاملہ قرض سے پہلے سے اس طرح کا معمول رہا ہو تو اب جائز ہے (ہندیہ: ۲۰۳/۳) قریب قریب یہی رائے دوسرے فقہاء کی بھی ہے۔ (دیکھئے مواہب الجلیل: ۵۴۶/۴، کشف القناع: ۳۰۵/۳)

(۷/مئی/۱۹۹۹ء)

زکوٰۃ ــــ کچھ نئے مسائل

زکوٰۃ اسلام کا ایک اہم رکن ہے، زکوٰۃ ہر مال میں واجب نہیں، بلکہ کچھ مخصوص اموال میں ہی واجب ہے، زمین میں سے نکلنے والی معدنیات میں سے صرف سونا اور چاندی میں ہی زکوٰۃ واحب ہے، البتہ تجارت کی صورت مستثنیٰ ہے، تجارت خواہ کسی بھی سامان کی کی جائے، وہ مال زکوٰۃ ہے اور اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

اس سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ جو موجودہ حالات میں پیدا ہوا ہے، یہ ہے کہ بعض حضرات اپنی دولت کی حفاظت اور ٹیکس سے بچاؤ کے لئے نقد رقم کو ہیرے اور جواہرات کی صورت میں تبدیل کر لیتے ہیں، اس تبدیلی کا مقصد گو تجارت نہیں ہوتا لیکن یہ روپیوں کی بدلی ہوئی صورت ہے، لہٰذا کیا ایسے ہیرے اور جواہرات میں زکوٰۃ واجب ہوگی؟ ایک رائے یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیوں کہ شریعت نے مخصوص اموال میں زکوٰۃ واجب قرار دی ہے اور یہ ان اموال میں سے نہیں ہے، جہاں تک روپیہ کی دوسری صورت میں تبدیلی کی بات ہے تو روپیہ سے زمین بھی خریدی جاتی ہے، مکان بھی خرید کیا جاتا ہے اور دوسری اشیاء کی صورت میں بھی روپیہ کو تبدیل کیا جاتا ہے، لہٰذا پھر زکوٰۃ کے لئے کسی کو خاص مال کی تخصیص باقی نہیں رہ پائے گی، جو شریعت کے منشاء کے خلاف ہے۔ چنانچہ کتب فقہ میں صراحت موجود ہے کہ ہیرے جواہرات میں اس وقت زکوٰۃ واجب ہے جب ان کو تجارت کی نیت سے خرید کیا گیا ہو، ورنہ نہیں، (عالمگیری: ۱۸۰/۱) یہی اکثر اہلِ علم کی رائے ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ چونکہ ان ہیرے اور جواہرات کا مقصود روپیہ کا محفوظ

کرنا ہے نہ کہ خود ہیرے اور جواہرات کا حصول، اس لئے گویا وہ نقد رقم ہی ہے جو ایک تبدیل شدہ صورت میں موجود ہے، لہٰذا اس میں بھی زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے ــــ راقم الحروف کے خیال میں پہلی رائے قوی ہے اور یہ دوسری رائے زیادہ احتیاط پر مبنی ہے، اس لئے ایسے ہیرے اور جواہرات جو استعمال کے لئے نہیں، بلکہ سرمایہ کی حفاظت کے لئے خرید کئے گئے ہوں، ان کی زکوٰۃ ادا کر دینا ہی بہتر ہے۔

مال سے مال حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں، ایک تجارت اور دوسرے اجارہ، تجارت یہ ہے کہ کوئی شئی کھو کر اس سے نفع حاصل کیا جائے، مثلاً: اگر دس روپیہ کا قلم بارہ روپیہ میں فروخت کرتے ہیں، تو قلم سے محرومی کو گوارا کر کے اس پر دو روپیہ نفع حاصل کرتے ہیں، یہ تجارت ہے، مال تجارت پر زکوٰۃ واجب ہے، چاہے مٹی اور زمین ہی کی کیوں نہ ہو؟ ــــ اور کسی چیز پر اپنی ملکیت باقی رکھتے ہوئے اس سے نفع حاصل کیا جائے یہ ''اجارہ'' ہے، جیسے: مکان، گاڑی وغیرہ کرایہ پر لگائی جاتی ہے، مالک کی ملکیت ان اشیاء پر باقی رہتی ہے اور کرایہ کی صورت میں وہ اس پر نفع حاصل کرتا ہے، ایسی چیزوں پر زکوٰۃ واجب نہیں، فتاویٰ قاضی خاں میں ہے: ''لو اشتری قدورًا من صفر یمسکھا او یواجرھا لا تجب فیھا الزکوٰۃ''

(قاضی خاں: ۱/۲۵۱)

یہی حکم ان اشیاء کا بھی ہے جو ''آلاتِ کسب'' ہیں، جیسے: سلائی مشین، پریس، کمپیوٹر، لیتھر مشین وغیرہ، کہ ان کی اصل پر زکوٰۃ واجب نہیں، بلکہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی میں دوسرے سرمایہ کے ساتھ ملا کر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(عالمگیری: ۱/۱۷۲)

''شیرز'' کی اصل تو قدیم ہے، لیکن آج اس نے جو وسعت اختیار کر لی ہے، ماضی میں ایسا نہیں تھا، بعض شیرز تو خالص تجارتی نوعیت کے ہیں، یعنی ایسی کمپنیوں کے ہیں جو ایک تجارتی گروپ ہے، سامان خریدتا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ اس کی ترسیل کرتا ہے، ایسے شیرز میں تو زکوٰۃ واجب ہونا ظاہر ہے۔ کیوں کہ یہ مال تجارت

ہے، بعض شیرز ایسے بھی ہیں جو صنعتی کمپنیوں کی نمائندگی کرتے ہیں، یعنی ان کے پاس مشینیں اور آلات ہیں، جن سے چیزیں تیار کی جاتی ہیں، اصولی طور پر ایسے شیرز کی اصل مالیت پر زکوٰۃ واجب نہ ہونی چاہئے کیونکہ یہ ''آلاتِ کسب'' کی نمائندگی کرتے ہیں نہ کہ سامان تجارت کی، صرف ان سے حاصل ہونے والے نفع پر زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے ـــ لیکن چونکہ آج کل کمپنی کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو، شیرز تجارتی مقصد ہی کے تحت خرید کئے جاتے ہیں، اس لئے علماء کا خیال ہے کہ ''شیرز'' مطلقاً مال تجارت ہیں اور ان کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

جن لوگوں نے اس نیت سے حصص خرید کئے ہوں کہ حصص کو باقی رکھتے ہوئے کمپنی سے حاصل ہونے والے نفع سے استفادہ کرنا ہے ان کو زکوٰۃ اس قیمت کے لحاظ سے ادا کرنی ہوگی جو کمپنی تسلیم کرتی ہو، اور جن حضرات نے حصص اس مقصد کے لئے خرید کیا ہو کہ قیمت بڑھنے کے بعد اسے فروخت کردیں گے، ان لوگوں کو موجودہ مارکٹ قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ مثلاً کمپنی کے نزدیک ایک حصہ کی قیمت ۲۵؍روپے ہے اور مارکٹ میں 250/ روپے، تو پہلی صورت میں ۲۵؍روپیہ اور دوسری صورت میں ڈھائی سو روپے کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

یہ حکم شیرز کا ہے۔ ''باونڈز'' کی حیثیت قرض کے دستاویز کی ہے اور اس پر جو نفع دیا جاتا ہے، وہ سود ہونے کی وجہ سے حرام ہے، اس لئے جتنی رقم کا باؤنڈز ہے، اتنی رقم کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، اور اس پر جو نفع ملتا ہے، وہ پورا کا پورا لائق صدقہ ہے۔

''پراویڈنٹ فنڈ'' میں تین طرح کی رقم شامل ہوتی ہے، ایک وہ جو خود گورنمنٹ تنخواہ میں سے کاٹ لیتی ہے، دوسرے: وہ جو اس کے برابر خود حکومت اپنی طرف سے بڑھا کر ادا کرتی ہے، تیسرے: وہ جو ملازم رضاکارانہ طور پر خود اپنی تنخواہ سے زائد رقم کٹواتا ہے، تاکہ اس کی P.F کی رقم زیادہ سے زیادہ ہوسکے ـــ ان میں سے وہ رقم جو حکومت جبراً کاٹ لیتی ہے اور وہ رقم جو حکومت اپنی طرف سے اضافہ کرکے دیتی ہے، خواہ جبراً وضع کی ہوئی رقم پر ہو یا رضاکارانہ وضع کرائی ہوئی رقم

پر، ان میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جب رقم وصول ہو جائے اور اس پر سال گذر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔ یہی رائے علماء برصغیر میں مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم کی ہے (امداد الفتاویٰ : ۲ / ۴۸۔۴۴) کیوں کہ اُجرت جب تک قبضہ میں نہ آجائے اس پر ملکیت ہی ثابت نہیں ہوتی، البتہ جو رقم اس نے خود ہی رضا کارانہ جمع کرائی ہے، چونکہ اس پر حکومت اور کمپنی کا قبضہ خود اس کے حکم سے ہے، تو سمجھا جائے گا کہ اپنے نائب اور وکیل کی وساطت سے اس نے اس رقم پر قبضہ کرلیا ہے۔ لہٰذا اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

''سامان تجارت'' جس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہے، اس کی تین قیمتیں ہوسکتی ہیں، ایک وہ قیمت جس میں سامان خرید کیا گیا تھا، دوسرے وہ قیمت جس میں تاجر آج اس سامان کو خرید کرسکتا ہے، تیسرے جس قیمت میں آج وہ اس سامان کو فروخت کرے گا، مثلاً : تاجر نے ایک قلم دس روپیہ میں چھ ماہ پہلے خرید کیا تھا، اگر اس وقت خرید کرنا چاہے تو اسے بارہ روپے فی قلم کے لحاظ سے خرید کرنا پڑے گا، اور پندرہ روپے فی قلم کے لحاظ سے وہ عام طور پر گاہک کو یہ قلم فروخت کرتا ہے، تو سوال یہ ہے کہ وہ اپنی دوکان میں موجود قلم کے اسٹاک کی قیمت کس لحاظ سے لگا کر اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا؟

اس مسئلہ میں گو فقہاء کی رائیں مختلف ہیں لیکن زیادہ قرین صواب امام ابوحنیفہؒ کے تلامذہ قاضی ابو یوسفؒ و امام محمدؒ کی رائے ہے کہ جس روز زکوٰۃ ادا کر رہا ہے اس دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا (مراقی الفلاح : ۳۹۱) کیوں کہ اصل میں زکوٰۃ کے طور پر خود قلم واجب ہے نہ کہ روپیہ، روپیہ قلم کے بدل کے طور پر دیا جاتا ہے، لہٰذا جتنی رقم میں اس تاجر کو زکوٰۃ میں واجب شدہ سامان حاصل ہوسکتا ہو اتنی رقم اس کے ذمہ واجب ہوگی۔ مذکورہ مثالوں کی روشنی میں اسے ۱۲ / روپے فی قلم کے حساب سے قیمت لگانی چاہئے اور اسی لحاظ سے زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے۔

سونے کا اصل نصاب ۲۰ / مثقال اور چاندی کا دوسو درہم ہے، ہندوستان کے قدیم اوزان میں اس کا وزن کیا ہوگا؟ اس میں علماء کی رائیں مختلف ہیں۔ راجح اور

محقق قول یہ ہے کہ سونے کا نصاب ساڑھے سات تولہ اور چاندی کا ساڑھے باون تولہ ہے، مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس پر بڑا تحقیقی رسالہ ''اوزان شرعیہ'' کے نام سے تالیف کیا ہے جو'' جواہر الفقہ ، حصہ اوّل'' میں شریک اشاعت ہے، یہی رائے مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ (فتاوی دارالعلوم : ۱۳۵/۶) اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی (فتاوی رضویہ : ۴۰۷/۴) کی بھی ہے، یہ ساڑھے باون تولہ موجودہ اوزان میں ۶۱۲،۳۵ گرام اور ساڑھے سات تولہ ۸۷،۴۷۹ گرام ہوتا ہے۔

(۸/جنوری ۱۹۹۹ء)

مصارف زکوٰۃ ــــ کچھ اہم پہلو!

اسلام کے تمام احکام کی بنیاد دو باتوں پر ہے، خالق کی اطاعت و بندگی، اور مخلوق سے محبت اور حسنِ سلوک۔ اسلام میں جو عبادتیں فرض کی گئی ہیں، ان میں بھی ان دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھا گیا ہے، جہاں نماز خدا کی بندگی اور اس کے سامنے سر جھکانے سے عبارت ہے، وہیں زکوٰۃ کا مقصد انسانیت کی حاجت روائی اور اس کی ضروریات کی تکمیل ہے، اور اللہ تعالیٰ نے دونوں کو یکساں طور پر فرض قرار دیا ہے، زکوٰۃ کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ عہد صدیقی میں جب کچھ لوگوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابوبکر ؓ نے ان سے جہاد کیا اور فرمایا کہ میں نماز اور زکوٰۃ کے درمیان تفریق کو گوارا نہیں کر سکتا، کہ کوئی گروہ نماز تو ادا کرنے کے لئے تیار ہو لیکن زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر جائے۔

زکوٰۃ صرف محتاجوں کی اعانت ہی نہیں ہے بلکہ ایک عبادت بھی ہے، اسی لئے جیسے عبادت کی تفصیلات اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے متعین ہوتی ہیں، اسی طرح زکوٰۃ کے بارے میں بھی تمام تفصیلات قرآن وحدیث کی صراحتوں سے ثابت ہیں، زکوٰۃ کن اموال میں واجب ہے، زکوٰۃ واجب ہونے کی شرائط کیا ہیں؟ کن لوگوں پر واجب ہے؟ کتنی مدت گذرنے پر واجب ہے؟ اور کس مقدار میں واجب ہے؟ یہ تمام باتیں کتاب وسنت میں مذکور ہیں، اور عام طور پر فقہاء ان کے بارے میں متفق ہیں۔ زکوٰۃ سے متعلق جن نکات کی وضاحت قرآن وحدیث میں آئی ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف کیا ہیں؟ کن لوگوں کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے، اور کن لوگوں کو نہیں دی جا سکتی ہے؟ مصارف زکوٰۃ کو لوگوں کی رائے پر نہیں چھوڑا گیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

" اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنَ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا

وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ'' (سورہ توبہ:۶۰)

'' صدقات (یعنی زکوٰۃ) کو مفلسوں محتاجوں اور کارکنان صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلب منظور ہے، اور قرض داروں (کے قرض ادا کرنے) میں اور خدا کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں (ہی یہ مال خرچ کرنا چاہئے، یہ حقوق) خدا کی طرف سے مقرر کردیئے گئے ہیں اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔''

ان مصارف کے سلسلہ میں چند باتیں ضرور پیش نظر رہنی چاہییں۔ پہلی بات یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں زکوٰۃ کے لئے جو تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ اس میں مالک بنائے جانے کے معنیٰ پائے جاتے ہیں، گویا زکوٰۃ میں مستحق شخص کو مالک بنانا ضروری ہے، جن میں مالک بننے کی صلاحیت نہ ہو ان مدات میں زکوٰۃ کی رقم خرچ نہیں کی جاسکتی، جیسے مردوں کی تجہیز وتکفین میں، قبر کے انتظام میں، کہ موت کے بعد انسان میں مالک بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی، آج کل بعض حلقوں سے یہ بات اٹھائی جارہی ہے کہ زکوٰۃ کی سرمایہ کاری کی جائے، اور اس سے جو نفع حاصل ہو وہ غرباء پر تقسیم کیا جائے، دو چار نا قابل ذکر افراد کو چھوڑ کر علماء ہند اور عالم اسلام کے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ یہ صورت جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس میں کسی خاص شخص کو زکوٰۃ کے مال بنائے جانے کی صورت نہیں پائی جاتی، بلکہ زکوٰۃ کی رقم تو اپنی جگہ مصروف رہتی ہے، صرف اس کا نفع غرباء تک پہونچتا ہے، پھر سرمایہ کاری میں جتنا امکان نفع کا ہوتا ہے، اتنا ہی نقصان کا بھی، اور اسی قدر خیانت کا بھی، تو اموالِ زکوٰۃ کی سرمایہ کاری میں یہ اندیشہ ہے کہ غرباء کا اصل حق بھی مارا جائے، اور زکوٰۃ ادا کرنے والوں کی زکوٰۃ جو ادا نہیں ہو پائی وہ نقصان اپنی جگہ ہے، پھر اس صورت میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اہلِ ثروت غرباء کے اس حق کا بھی استحصال کریں، کیوں کہ مال زکوٰۃ کی سرمایہ کاری کے لئے لامحالہ تجربہ کار تاجروں، اور اہلِ ثروت کاروباریوں ہی کا سہارا لینا پڑیگا، اور آج کل شب وروز جو تجربات سامنے آرہے ہیں، ان کی روشنی میں یہ

اندازہ کرنا چنداں دشوار نہیں کہ جب رقم جمع کرنے والوں کی طرف سے مطالبہ کے باوجود آئے دن بدمعاملگی سامنے آتی رہتی ہے، تو وہ لاوارث رقم جس کا کوئی مالک متعین نہیں، اس کا کیا حشر ہوگا؟۔

یہ بات مقصدِ زکوٰۃ کے بھی خلاف ہے، کیوں زکوٰۃ کا مقصد ان ضروریات کو پورا کرنا ہے، جس سے لوگ اس وقت دوچار ہیں، اگر آپ اس رقم کو مستقبل کے لئے محفوظ کر دیں تو ان کی فوری ضروریات کیسے پوری ہوں گی؟ اس لئے مالِ زکوٰۃ کی سرمایہ کاری نہ زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے کافی ہے اور نہ اس سے زکوٰۃ کے مقصد ومنشاء کی تکمیل ہوتی ہے، بلکہ اس سے مستحقینِ زکوٰۃ کا استحصال اور ان کی حق تلفی ہے — آج کل بعض گوشوں سے یہ بات بھی کہی جارہی ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کو بینک میں فکس ڈپازٹ کر دیا جائے اور اس کا انٹرسٹ مستحقین کو دیا جائے، یہ تو زکوٰۃ جیسی عبادت کو سود کی نجاست میں آلودہ کرنا اور خود گناہ گار ہونا اور دوسروں کو گناہ گار بنانا ہے، اولاً تو زکوٰۃ کی رقم کو بینک میں محفوظ کرنے سے زکوٰۃ میں ادا نہیں ہوئی، پھر اس رقم کو سود کے لئے ذریعہ ووسیلہ بنانا زکوٰۃ جیسی عبادت کی کھلی ہوئی اہانت ہے، اور اس رقم کو فقراء میں تقسیم کرنا، لوگوں کو سود کھلانا اور سودخواری کا مرتکب بنانا ہے، ایسے ناشائستہ اور ناروا عمل کی کیوں کر گنجائش ہوسکتی ہے؟ اس لئے اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے، کہ اگر زکوٰۃ کی رقم مستحقین کے ہاتھ گئے بغیر فکس ڈپازٹ کرادی گئی تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی۔

زکوٰۃ کا مصرف فقراء اور مساکین ہیں، اس لئے ایسی چیزیں جو رفاہی مقاصد کے لئے ہیں، اور تمام لوگوں کے استعمال میں آتی ہیں، ان میں زکوٰۃ کی رقم استعمال نہیں کی جاسکتی، چنانچہ فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ مسجد کی تعمیر میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا درست نہیں، وَاتَّفَقُوْا عَلٰی اَنَّهٗ لَایَجُوْزُ اَنْ یُّخْرِجَ الزَّکٰوۃَ اِلٰی بِنَاءِ مَسْجِدٍ (الافصاح: ۱/۲۳۱)۔ اس طرح پلوں کی تعمیر، سڑکوں کی درستگی، ڈرنج کے پشتوں کی مرمت، پانی پینے کے لئے سبیلوں کی تعمیر وغیرہ میں زکوٰۃ کی رقم خرچ نہیں کی جاسکتی، (المغنی مع شرح الکبیر: ۲/۵۲۷، بدائع الصنائع: ۲/۳۹)۔ اسی لئے ہاسپٹلوں یالائبریریوں کی تعمیر اور کتابوں کی فراہمی وغیرہ

میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا درست نہیں، ہاں علاج کے لئے فقراء کو زکوٰۃ کی رقم سے دوا خرید کر یا نقد رقم دی جاسکتی ہے۔

زکوٰۃ کا مقصد خالصۃً لوجہ اللہ کسی عوض اور بدل کے بغیر مستحقین کی اعانت ہے، لہٰذا کسی بھی ایسے کام میں زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی جس میں زکوٰۃ کی حیثیت عوض اور اجرت کی ہوجائے، جیسے مساجد میں امام ومؤذن کی تنخواہ کے لئے، مدارس اور اسکولوں میں اساتذہ کی تنخواہوں کے لئے، مساجد کے صباحی اور مسائی معلمین کے لئے، اگر ان کو بطور تنخواہ یا اُجرت کے زکوٰۃ کی رقم میں سے دیا جائے تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، اس لئے جن مدارس میں غریب طلبہ کے لئے مفت قیام وطعام کا نظم نہ ہو ان کو زکوٰۃ نہیں دینی چاہئے۔

آج کل ایک سلسلہ یہ بھی شروع ہوگیا ہے کہ خوش حال ماں باپ اپنے بچوں کی میڈیکل، انجینیرنگ تعلیم اور ڈونیشن کے لئے لاکھوں روپے زکوٰۃ کی رقم وصول کرتے ہیں، یہ صورت بھی مناسب نہیں ہے، اور زکوٰۃ کا جو اصل مقصد ہے کہ زیادہ سے زیادہ محتاجوں اور ضرورت مندوں کی حاجت اس سے پوری ہو اس کے خلاف ہے، اسی لئے فقہاء نے ایک شخص کو ایک مقدار نصاب سے زیادہ زکوٰۃ دینے سے منع کیا ہے، ایک مقدار نصاب یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کم وبیش پانچ ہزار روپے ہوتی ہے، ایک لاکھ روپے میں بیس اشخاص کی ضروریات پوری ہوسکتی تھی، لیکن اب اس رقم سے صرف ایک شخص کو خوب سے خوب تر مستقبل کی تعمیر میں ہی مدد مل سکے گی، اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ دینی مدارس اور ان اعلیٰ فنی تعلیمات کی نوعیت میں فرق ہے، دینی مدارس میں ایک طالب علم کی سال بھر کی تعلیم اور ضروریات پر صرف دس بارہ ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں، پھر جو لڑکے پڑھ کر نکلتے ہیں، وہ امت کے دین وایمان کی حفاظت کا ذریعہ بنتے ہیں، گویا وہ امت کا سرمایہ اور اس کا مفاد ہیں، اور جو طالب علم ڈاکٹر یا انجینئر بنتا ہے، وہ اپنے مستقبل کی فکر لے کر اٹھتا ہے، اور اپنے اور اپنے خاندان کے لئے کسب زر کی مشین بنتا ہے، دینی مدارس میں بہت بڑی تعداد ان طلبہ کی ہوتی ہے کہ وہ اور ان کے والدین اپنے معاشی پس منظر کے اعتبار سے زکوٰۃ کے مستحق ہوتے ہیں، اور جو طلباء انجینئرنگ یا میڈیکل

میں تعلیم کے لئے جاتے ہیں وہ کھاتے پیتے گھرانے کے ہوتے ہیں، پھر ان عصری علوم سے چوں کہ مستقبل کی خوش حالی متعلق ہوتی ہے، اس لئے ان شعبوں میں آنے کے لئے ترغیب دینے کی ضرورت پیش نہیں آتی، بلکہ مادیت کی چمک دمک خود ہی شخص کی نگاہ کو خیرہ کئے رہتی ہے، برخلاف دینی تعلیم کے، کہ اس سے معاد متعلق ہے نہ کہ معاش، خوف آخرت کی کمی اور بڑھتی ہوئی دنیا طلبی کی وجہ سے اس کی طرف لوگوں کا میلان کم ہوتا ہے، اس لئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کر کے انہیں دینی تعلیم کی طرف راغب کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

مصارفِ زکوٰۃ بھی اہمیت کے اعتبار سے درجات ہیں اور اس لحاظ سے دو باتیں، خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں: اوّل یہ کہ اپنے قرابت دار اور اعزہ زکوٰۃ کے زیادہ مستحق ہیں، ماں باپ دادا، دادی، نانا، نانی اولاد اور ان کا سلسلہ اولاد، شوہروں بیویوں کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی، باقی دوسرے اقرباء بھائی بہن، پھوپھی، خالہ خسر، خوشدامن، چچا، ماموں وغیرہ کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، ان کو زکوٰۃ دینے میں دوہرا اجر ہے، زکوٰۃ بھی ادا ہوگی اور قرابت داری کا حق بھی، خاندان میں جو بیوہ، مطلقہ عورتیں، شوہر کی بے توجہی کی وجہ سے بے سہارا خواتین، یتیم لڑکے اور لڑکیاں وغیرہ ہوں، ان پر پہلے توجہ دینی چاہئے، زکوٰۃ دیتے وقت اس کا اظہار بھی ضروری نہیں کہ زکوٰۃ کی رقم ہے، ہدیہ وتحفہ، عیدی اور قرض وغیرہ کے نام سے بھی زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے، صرف اتنا اطمینان کر لینا کافی ہے کہ وہ شخص زکوٰۃ کا مستحق ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ مجموعی طور پر زکوٰۃ کے دو مقاصد ہیں، فقراء کی ضرورت پوری کرنا، اور اللہ کے دین کی سربلندی، چنانچہ زکوٰۃ کے آٹھ مصارف (جن کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے) میں سے چھ میں حاجت مندوں کی حاجت پوری کرنا ملحوظ ہے، اور فی سبیل اللہ اور مؤلفۃ القلوب، ان دو مدات میں دین کی حفاظت وسربلندی اور اس کی اشاعت مقصود ہے، اس وقت دینی مدارس ان دوہرے مقاصد کو پورا کرتے ہیں، ایک طرف ان مدارس میں جو طلباء زیرِ تعلیم ہیں وہ زکوٰۃ کے مستحق ہوتے ہیں، اور بہت سے طلباء ایسے دیہاتوں

سے آتے ہیں جہاں ہماری رسائی نہیں ہو سکتی، دوسری طرف یہ مدارس پوری دنیا میں عموماً اور برصغیر میں خصوصاً اسلام کی بقاء اور اس کی حفاظت وصیانت کا سامان بنے ہوئے ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر یہ مدارس نہ ہوتے تو کم سے کم ہمارے ملک میں مسلمانوں کے اکثریتی تہذیب میں جذب ہو جانے سے کوئی چیز مانع نہ ہوتی، اس لئے ان مدارس کے تعاون سے زکوۃ کے دونوں مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے، مسلمانوں میں اب تک ایک طبقہ نے ان دینی درسگاہوں کی اہمیت کو نہیں سمجھا ہے، لیکن مسلمانوں کا مذہبی وملی تشخص جن فرقہ پرست طاقتوں کی آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھتا ہے وہ ان مدارس کی اہمیت اور اس کے کردار کو محسوس کر رہے ہیں، اس لئے موجودہ حالات میں جب کہ عالمی سطح پر دینی مدارس کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے اور ان کے دائرہ کار کو محدود کرنے کی کوشش کی جارہی ہے ہمارا فریضہ ہے کہ ہم انہیں تقویت پہونچائیں اور ان کی شعاعوں کو اور تیز و روشن کریں۔

(۲۳رنومبر ۲۰۰۱ء)

سرمایہ کار کمپنیوں کا تلخ تجربہ

اسباب وعوامل

گذشتہ ایک دہے میں متعدد مالیاتی تجارتی کمپنیاں ہیں جنہوں نے سنہرے خوابوں کی بہشت سجا کر لوگوں سے ان کی گاڑھی کمائیاں وصول کیں، اور سرمایہ کاروں کا اعتماد بڑھانے کی غرض سے ابتداءً خوب خوب نفع دیا، لیکن اچانک ایسی صورتِ حال پیش آئی کہ ان کا خواب ایک ''سراب'' ثابت ہوا۔ اور یوں محسوس ہوا کہ ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا'' ۔۔ خواہ اس کا سبب ان اداروں کی اقتصادی ناتجربہ کاری ہو یا دیانت وصداقت کی کمی؛ لیکن ان واقعات نے کتنے ہی دلوں کو رلایا اور تڑپایا ہے، ان میں بہت سے لوگ وہ تھے جنہوں نے وظیفہ یاب ہونے کے بعد اپنی پوری زندگی کا حاصل لگا دیا تھا، تاکہ بڑھاپے کی بے بسی اور بے کسی میں یہ سہارا بن سکے، بہت سی بیوائیں تھیں جنہوں نے اسے اپنے یتیم بچے اور بچیوں کی کفالت کا ذریعہ تصور کر کے ساری پونجی اس میں ڈال دی تھیں، کتنے ہی ضرورت مند اور محتاج تھے کہ شب و روز محنت کر کے انہوں نے اپنی لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی غرض سے کچھ سرمایہ اکٹھا کیا اور اسے حفاظت اور نفع کی امید پر ان اداروں کے سپرد کیا تھا۔ اب امیدوں اور آرزوؤں کے خوبصورت تاج محل زمین بوس ہیں اور بہت سی حسرتوں کا مدفن بنے ہوئے ہیں۔

یہ تو ان واقعات کا اقتصادی اور سماجی پہلو ہے۔ لیکن ان سب کے ساتھ ساتھ سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان واقعات کے نتیجہ میں غیر سودی اور حلال بنیاد پر سرمایہ کاری سے لوگوں کا اعتماد اٹھتا جا رہا ہے، اور ان سرکاری اور نجی اداروں پر

لوگوں کا اعتماد و اعتبار بڑھ رہا ہے جو سود پر یقین رکھتے ہیں، اور علانیہ سود کا لین دین کرتے ہیں، یہودی نظامِ معیشت اور اس کے زیرِ اثر مغرب کا معاشی نظام تو کہتا ہی ہے کہ غیر سودی سرمایہ کاری نا قابلِ عمل اور غیر محفوظ صورت ہے، ساتھ ہی ساتھ خود مسلمانوں کے ہاتھ قائم ہونے والے یہ ادارے بھی بالواسطہ ان کے دعویٰ کو تقویت پہنچاتے ہیں، مسلمانوں کو اس سے جو معاشی نقصان پہنچتا ہے اس کا اثر تو ممکن ہے کہ چند سالوں میں ختم ہو جائے؛ اس لئے کہ زخم کتنا بھی گہرا ہو ایک نہ ایک دن مندمل ہو کر رہتا ہے، اور دل پر کیسی بھی چوٹ لگے آج نہ کل آنسو تھم ہی جاتے ہیں، لیکن اسلام کے غیر سودی سرمایہ کاری کے تصور پر ان واقعات کی وجہ سے جو چوٹ لگتی ہے اور اسلامی نظامِ معیشت سے سماج کا یقین جس طرح مجروح ہوتا ہے، شاید پچاس سال میں بھی اس کی تلافی ممکن نہ ہو؛ اس لئے ایسے تکلیف دہ واقعات گہرے غور و فکر کے متقاضی ہیں۔

اسلام کی نگاہ میں جو برائیاں بہت ہی سنگین ہیں، ان میں سے ایک سود بھی ہے، سود کی شناعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے نہ صرف سود لینے والے پر لعنت فرمائی بلکہ سود دینے والوں، سودی معاملات کے لکھنے والوں، اور ایسے معاملہ پر گواہ بننے والوں پر بھی آپ ﷺ نے لعنت کی ہے (مسلم، عن جابر بن عبد اللہ) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر یہ بات لازم کر لی ہے کہ وہ چار آدمیوں کو جنت میں داخل نہیں فرمائیں گے اور ان کو جنت کی نعمتوں کا مزہ تک چکھنے سے محروم رکھیں گے۔ ایک شراب کا خوگر، دوسرے سود خوار، تیسرے ناحق یتیم کا مال کھانے والا، اور چوتھے والدین کا نافرمان (حاکم عن ابی ہریرۃ) ـــــ لیکن ظاہر ہے کہ کسی برائی سے روکنا اس وقت تک مفید اور مؤثر نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے لئے جائز اور حلال متبادل پیش نہ کیا جائے۔ اسلام نے سودی لین دین کا راستہ بند کرنے کے لئے بنیادی طور پر دو طریقے اختیار کئے۔ ایک تو قرض کے لین دین کو آسان فرمایا، لوگوں کو اس کی ترغیب دی؛ تا کہ لوگ سود دینے پر مجبور نہ ہوں۔ جب

معاشرہ میں سود دینے والے لوگ نہ رہیں گے، تو اس سے سودخواروں کی حوصلہ شکنی ہوگی، اور سودی کاروبار پروان نہیں چڑھ سکے گا، دوسری طرف ''شرکت'' اور ''مضاربت'' کے کاروبار کو جائز قرار دیا؛ بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی۔ شرکت سے ایسا کاروبار مراد ہے جس میں مختلف لوگوں کا سرمایہ شریک ہو، محنت چاہے تمام سرمایہ کاروں کی ہو یا بعض کی ہو، لیکن نفع میں حسب معاہدہ سب شریک ہوں، مضاربت یہ ہے کہ کچھ لوگوں کا مال ہو اور کچھ لوگوں کی محنت، اور نفع ونقصان میں دونوں شریک ہوں، کاروبار کی یہ دونوں صورتیں جائز نفع کا راستہ کھولتی ہیں، اور سودی نظام کو بند کرنے میں معاون ہیں۔

اصل یہ ہے کہ بعض لوگوں کے پاس سرمایہ ہوتا ہے، لیکن سرمایہ کو کس طرح نفع آور بنایا جائے؟ یا تو ناتجربہ کاری کی وجہ سے وہ اس سے ناواقف ہوتے ہیں، یا واقف ہونے کے باوجود کام کرنے کی قوت نہیں رکھتے یا وقت نہیں پاتے، اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا سرمایہ لگا رہے۔ اور بیٹھے بیٹھائے ان کا نفع آتا رہے۔ یہی خواہش سودی کاروبار کرنے والوں کے لئے اپنے کاروبار کو وسعت دینے کا ذریعہ اور وسیلہ بنتی ہے۔ اسلام نے ''شرکت'' اور ''مضاربت'' کے ذریعہ اپنے سرمایہ سے نفع اٹھانے کا موقع فراہم کیا ہے، شرکت ہی کی طرح مضاربت میں بھی نفع کا تناسب متعین ہونا چاہئے۔ نہ کہ قطعی مقدار، اگر قطعی مقدار متعین ہو جیسے دس ہزار پر پانچ سو روپیہ، تو یہ سود میں شامل ہے اور حرام ہے، البتہ یہ ضروری نہیں کہ سرمایہ کار اور عامل کے نفع کی شرح میں یکسانیت ہو، اس میں کمی بیشی ہو سکتی ہے، مثلاً ساٹھ فیصد، اور چالیس فیصد یا پچھتر فیصد اور پچیس فیصد کی شرح سے نفع متعین ہو، یہ درست ہے۔

بنیادی طور پر سرمایہ کاری کی یہ دو صورتیں ہیں، جو زیادہ نفع آور بھی ہیں، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس میں نقصان کا خطرہ بھی زیادہ ہے، کیونکہ ایک تو کاروبار میں نشیب وفراز ہوتا ہی ہے، دوسرے آج کل دیانت وامانت کی بھی کمی ہے، اور شرکت و مضاربت کا زیادہ تر انحصار دیانت اور ایمانداری پر ہے، اس لئے اسلامی خطوط پر

سرمایہ کاری کے لئے جو ادارے قائم ہوں، ان کے لئے ان طریقوں کا اختیار کرنا دشواری کا باعث ہوتا ہے، --- سرمایہ کاری کی دو اور صورتیں نسبتاً زیادہ محفوظ بھی ہیں اور آسان بھی، ان میں ایک صورت ''مرابحہ'' کی ہے، اور دوسری ''اجارہ'' کی، مرابحہ سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کو خرید کر نفع کے ساتھ فروخت کیا جائے، اور خریدار پر یہ بات واضح بھی کردی جائے کہ اس نے کتنی قیمت میں خرید کیا ہے، اور اس پر کتنا نفع حاصل کررہا ہے؟ مثلاً ایک شخص کو پچاس لاکھ روپے کی مشنریز خرید کرنی ہے، کمپنی اس کو پیسہ دینے کے بجائے مشینیں خرید کرے، اور اپنے قبضہ میں لے کر اسے ساٹھ لاکھ میں فروخت کرے؛ اور اس کو مہلت دے دے کہ وہ دس ماہ کے بعد اس کی قیمت ادا کر دے، یا مثلاً چھ لاکھ روپے ماہانہ کی قسط ادا کرنے کی سہولت دے دے، یہ صورت شرعاً جائز ہے، اور اس میں سرمایہ کو نسبتاً کم خطرہ ہوتا ہے، نقد کے مقابلہ ادھار قیمت زیادہ ہو، یہ جائز ہے، اور یہ بھی جائز ہے ایک مشت کے بجائے اقساط پر قیمت وصول کی جائے، البتہ اس میں دو باتیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ ایک ہی قیمت متعین ہو، یہ بات درست نہیں، کہ اگر دس ماہ کے بجائے اس نے گیارہ ماہ میں قیمت ادا کی تو قیمت ساٹھ لاکھ کے بجائے پینسٹھ لاکھ وصول کی جائے۔ دوسرے اس صورت میں یہ بات بھی ضروری ہوگی کہ کمپنی اس چیز کو اپنے قبضہ میں لے کر فروخت کرے، کیوں کہ جب تک کوئی چیز اپنے قبضہ میں نہ لے لی جائے اس وقت تک نہ اس کو بیچنا جائز ہے، اور نہ ہی اس کا نفع حلال ہے، البتہ قبضہ کی کوئی ایک صورت متعین نہیں، ہر عہد کے رواج اور ہر چیز کی حیثیت کے لحاظ سے اس کا قبضہ ہوگا۔

''اجارہ'' سے مراد کسی چیز کو کرایہ پر دینا ہے۔ یعنی اجارہ لیزنگ (Leassing) کا نام ہے۔ اجارہ میں اصل سامان محفوظ رہتا ہے، اور اس کے استعمال کی اجرت حاصل کی جاتی ہے۔ جیسے گاڑیاں خرید کی جائیں اور ان کو کرایہ پر لگایا جائے، کسی فیکٹری کو مشینیں مطلوب ہوں، مشین خرید کر ان کو کرایہ پر دیا جائے، یہ صورت بھی نسبتاً محفوظ کہی جاسکتی ہے، اجارہ میں مدت اور اجرت کی تعیین ضروری ہے،

جو انویسٹ منٹ کمپنیاں اسلامی بنیادوں پر قائم ہیں ان کو چاہئے کہ جمع سرمایہ کا کچھ حصہ شرکت و مضاربت میں لگائے، اور کچھ حصہ مرابحہ اور اجارہ میں استعمال کرے، اس طرح پورے سرمایہ کے ڈوب جانے کا خطرہ نہیں ہوگا۔ اور ان کے پاس ٹھوس سرمایہ کی صورت میں بھی بہت سارا سرمایہ رہے گا، جس سے سرمایہ کاروں کا اعتماد قائم رکھنے میں بھی مدد ملے گی، اور کمپنی مکمل طور پر دیوالیہ بھی نہیں ہوگی۔

اس وقت پورے ہندوستان اور خاص کر شہر حیدرآباد میں تجارتی کمپنیوں کا کا ایک سیلاب سا آیا ہوا ہے، جن میں بعض تو سرمایہ کاروں سے اسّی فیصد نفع تک کا بھی وعدہ کر رہے ہیں۔ بہ ظاہر یہ سبز باغ دکھانے سے زیادہ کچھ نہیں، ان چھوٹی چھوٹی نومولود کمپنیوں میں زیادہ تر سرمایہ متوسط الحال مسلمانوں کا ہے۔ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ریزرو بینک آف انڈیا اور گورنمنٹ ان کمپنیوں کے معاملہ میں خاموش تماشائی بنی رہتی ہے۔ گورنمنٹ کے زیر کنٹرول ذرائع ابلاغ میں ان کی خوب تشہیر ہوتی ہے، سرکاری افسران اور سیاسی قائدین ان کی تقریبات میں شریک ہوتے ہیں، اور کمپنی کے مالکان کو قوم کا مسیحا قرار دیتے ہیں، جب عوام کا پیسہ ڈوبتا ہے اور پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے، تو گورنمنٹ حرکت میں آتی ہے اور پولیس تفتیش شروع ہوتی ہے، یہ محض اشک شوئی اور سانپ کے گذر جانے کے بعد لکیر کو پیٹنا ہے، ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ خود مسلمان ملک گیر سطح پر یا کم سے کم شہر حیدرآباد کی سطح پر سرمایہ کاروں کے لئے ایک مشاورتی بورڈ قائم کریں جس میں کچھ علماء وارباب افتاء، چند معاشی منصوبہ بندی کے ماہرین اور دو ایک اکاؤنٹنٹ اور قانون داں شامل ہوں، سرمایہ کاروں کو ترغیب دی جائے کہ یہ بورڈ جب تک کسی کمپنی کی تصدیق نہ کردے وہاں سرمایہ کاری سے اجتناب کیا جائے، یہ بورڈ شرعی، اقتصادی، قانونی، اور حساب و کتاب کی شفافیت کے پہلو سے ہر چھ ماہ پر کمپنی کا مکمل غیر جانبدارانہ جائزہ لینے کے بعد ہی اس کی تصدیق کرے، اور اپنے جائزہ کا اعلان کرے۔ اس طرح ایک طرف ایسی مالیاتی کمپنیوں کو مفید اقتصادی مشورے مل سکیں گے، ان کا کاروبار شریعت کے

دائرہ میں ہوگا، ان کے کاروبار کی عوامی نگرانی ہو سکے گی، اور دوسری طرف سرمایہ کاروں کی گاڑھی کمائی محفوظ اور نفع آور ہوگی۔ کسی عملی تدبیر کے بجائے محض ایسے واقعات پر وقتی بیانات دے دینا اور سرمایہ کاروں سے لفظی ہمدردی کا اظہار کر دینا مسئلہ کا مؤثر اور مستقل حل نہیں، کاش ہمارے قائدین، علماء اور اہلِ دانش اس جانب کوئی توجہ کریں۔

(۱۲/ مارچ ۱۹۹۹ء)

اسلام میں سرمایہ کاری کے اصول اور موجودہ حالات کا تقاضا

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں نعمتوں اور صلاحیتوں کی ایسی تقسیم فرمائی ہے کہ ہر شخص اپنے آپ میں نامکمل اور دوسرے کا محتاج ہے، اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہی اپنی منزل تک پہونچ سکتا ہے، کسی کے پاس دولت ہے، لیکن وہ جسمانی قُویٰ سے محروم ہے، کوئی شخص صحت مند اور محنت کرنے کے لائق بھی ہے، لیکن علم و آگہی سے تہی دامن ہے، جیسے اندھا اور لنگڑا ایک دوسرے کی مدد کر کے اپنا سفر طے کر سکتے ہیں، اسی طرح یہ مختلف صلاحیتوں کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اپنی مطلوبہ منزل کو پا سکتے ہیں۔

معاشی نظام میں بھی یہی طریقۂ کار کسی قوم اور سماج کی ترقی کا راز ہے، کچھ لوگوں کے پاس سرمایہ ہے، لیکن خود کاروبار اور تجارت کی قوت یا اس کا تجربہ نہیں، کچھ لوگ کاروبار کی صلاحیت رکھتے ہیں، لیکن ان کے پاس سرمایہ نہیں، اگر سرمایہ کاروں کا منجمد سرمایہ اور اس دوسرے گروہ کی محنت کا اشتراک ہو، تو اس سے دونوں طبقوں کو نفع ہوگا، اور بحیثیت مجموعی قوم اور ملک کو بھی اس کا نفع پہونچے گا، اسی لئے اسلام نے ایسے اشتراک کی نہ صرف گنجائش رکھی ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔

اسلام نے بنیادی طور پر اس کے لئے دو طریقے رکھے ہیں: شرکت اور مضاربت، شرکت کے معنی ساجھے دار ہونے کے ہیں، یعنی ایسا کاروبار جس کو متعدد لوگ مل کر کریں، جو شخص کسی چیز میں کچھ حصہ کا مالک ہو، عربی زبان میں وہ ''شریک'' کہلاتا ہے، فقہ کی اصطلاح میں شرکت ایسے کاروبار کو کہتے ہیں، جس میں ایک سے زیادہ لوگوں کا سرمایہ شریک ہو، اور نفع میں بھی وہ سب شریک ہوں، ''عقد بین المتشارکین فی راس

المال و الربح" قرآن مجید میں گو احکامِ شرکت کی تفصیل تو مذکور نہیں، لیکن اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے احکام میراث کے ذیل میں چند ورثاء کے بارے میں ذکر فرمایا ہے کہ وہ سب ایک تہائی میں شریک ہیں، "فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ" (نساء:۱۲) حدیث میں نسبتاً زیادہ وضاحت کے ساتھ شرکت کا تذکرہ ہے، جائز اور حلال طریقہ مقرر فرمایا ہے، جس میں سرمایہ کار نفع کے ساتھ نقصان کا خطرہ بھی قبول کرتا ہے۔ اور اسی کو قبول کرنے کی وجہ سے اس پر حاصل ہونے والا نفع اس کے لئے جائز اور حلال ہے۔

اگر ایمانداری کے ساتھ شریعت کے اصولوں کو برتتے ہوئے شرکت اور مضاربت کے کاروبار کئے جائیں تو اس سے زیادہ نفع حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن خیانت اور بددیانتی آخرت ہی میں نہیں، دنیا میں بھی انسان کو نقصان سے دوچار کرتی ہیں۔ کاروبار کی کامیابی میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں: ایک دیانت و امانت، دوسرے تجربہ اور کاروبار سے واقفیت۔ اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں حضرت سائب بن سائب ؓ آپ ﷺ کے کاروباری شریک تھے۔ جب مکہ فتح ہوا تو خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، نبی کریم ﷺ نے ان کا استقبال کیا۔ اور فرمایا: میرے بھائی اور میرے شریک! تمہارا آنا مبارک، جو ایسے شریک تھے کہ نہ جھگڑتے تھے اور نہ ہیرا پھیری کرتے تھے۔ "مرحبا باخي و شريكي كان لايداري و لايماري" (فتح القدیر: ۵/۳۷۷) گویا جو لوگ شریف اور سلیم الطبع تھے، وہ زمانۂ کفر میں بھی امانت و دیانت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

اسلام میں امانت و دیانت کی جو اہمیت و تاکید ہے، وہ ظاہر ہے۔ خاص کر شرکت کے معاملہ میں آپ ﷺ نے اس کی خصوصی تاکید فرمائی۔ حضرت ابو ہریرۃ ؓ نقل کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب دو آدمی شرکت کے ساتھ کاروبار کرتے ہیں، تو جب تک ان میں سے کوئی اپنے ساتھی کے ساتھ خیانت نہ کرے میں ان میں کا تیسرا ہوتا ہوں۔ اور جب ان میں سے کوئی خیانت کرتا ہے میں ان کے بیچ سے نکل جاتا ہوں۔ "انا ثالث الشريكين مالم يخن احدهما صاحبه، فاذا خانه خرجت من بينهما"، (ابوداؤد: ۲/۱۲۴)

بدقسمتی سے آج کل جو لوگ سرمایہ کاری کی دعوت دیتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ پہلے ہی دن سے ان کے گھر میں دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگیں، اور ایسی شاہ خرچی شروع ہوتی ہے کہ گذشتہ زمانہ کے فضول خرچ نواب اور جاگیردار بھی شرم سار ہو جائیں، عمدہ سے عمدہ مکان، اچھی سے اچھی گاڑیاں، شاہی دعوتیں، اور ہر سماجی محفل میں پیسے دے کر مہمان خصوصی بننے کا شوق، اور ان سب سے سواء اخبارات میں آنے کی خواہش، اور ہر روز اپنی تصویر کی نمائش، اور کتنی ہی ایسی خواہشیں کہ ہر خواہش پہ دم نکلے! اور یہ سب کچھ غریب اور متوسط الحال محنت کش عوام، بیواؤں اور یتیموں کے پیسوں کے بل پر —— یہ کتنی شرمناک اور افسوس ناک بات ہے۔ اس سے جہاں سرمایہ کاروں کو نقصان پہنچتا ہے، وہیں خود وہ بھی نقصان سے دوچار ہوتا ہے، اگر دیانت اور ایمانداری سے کاروبار کو چلایا جائے تو لوگوں کا اعتماد قائم رہے گا۔ اور یہ کاروبار مدتوں جاری رہے گا، اور سرمایہ کاروں سے زیادہ نفع خود اس شخص کو حاصل ہوگا، خیانت اور بددیانتی سے اللہ تعالیٰ کی مدد اٹھ جاتی ہے۔ جن لوگوں نے سرمایہ لگایا ہے ان کا بھی نقصان ہوتا ہے۔ اور جن کے پاس سرمایہ مشغول کیا گیا ہے وہ دنیا میں ذلیل وخوار بھی ہوتا ہے، مستقل نفع سے محروم بھی اور اس اجتماعی ظلم پر اللہ کے یہاں جو پکڑ ہے وہ اس کے سوا ہے۔

کسی بھی کاروبار کے کامیاب ہونے کے لئے تجربہ اور واقفیت ضروری ہے، آدمی خواہ کتنا بھی مخلص ہو، دیانت دار اور سچا بھی ہو، لیکن وہ ایسے کاروبار میں ہاتھ رکھے جس سے خود کما حقہ واقف نہ ہو، تو زیادہ امکان نقصان ہی کا ہے، کسی بھی تجارت کے لئے تین چیزیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں، اوّل یہ کہ سامان کہاں سے خرید کیا جائے کہ اس کو کم سے کم قیمت میں حاصل کر سکے، دوسرے یہ سامان کہاں بہتر طور پر فروخت ہو سکے گا؟ کہاں اس کی مانگ زیادہ ہے؟ تیسرے جو لوگ اس مال کے خواہاں ہیں وہ کس طرح کا مال پسند کرتے ہیں؟ ان تینوں امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کوشش بھی کرنی ہے کہ اس کے لانے اور فروخت کرنے میں کم سے کم اخراجات آئیں، یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ پورا سرمایہ ایک ہی یونٹ میں نہ لگایا جائے، اگر مختلف نوعیت کے کاروبار میں سرمایہ مصروف کیا جائے

تو اگر ایک یونٹ میں نقصان بھی ہو تو دوسری یونٹوں کے نفع سے اس کی بھرپائی ہوسکتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ماضی قریب میں جو کمپنیاں قائم ہوئیں، انہوں نے اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا۔ کسی نے پوری رقم چمڑے میں مصروف کردی۔ کسی نے بلڈنگوں کی تعمیر میں، کسی نے اسکراپ کی خرید و فروحت میں، نتیجہ یہ ہوا کہ جب کاروبار میں انحطاط ہوا تو پورا کاروبار ہی بیٹھ گیا، جو لوگ سرمایہ کاروں کو شرکت کی دعوت دیں ان کو چاہئے کہ وہ پہلے سرمایہ کاری کے فائدہ بخش مواقع کو ماہرین کی مدد سے خوب اچھی طرح سمجھ لیں، پھر قدم اٹھائیں۔

جو لوگ اپنا سرمایہ مشغول کریں، ان کے لئے بھی ضروری ہے کہ سنہرے خواب دکھانے والوں کی طرف آنکھ بند کر کے نہ دوڑیں، بلکہ پہلے خوب اچھی طرح تفتیش کریں کہ کمپنی سرمایہ کہیں مشغول بھی کر رہی ہے یا نہیں؟ اگر مشغول کر رہی ہے تو کیا اس کاروبار سے وہ نفع حاصل ہوسکتا ہے جس کا وعدہ کیا جارہا ہے؟ اس کے بارے میں ماہرین سے دریافت کریں، پھر خوب سوچ سمجھ کر سرمایہ لگائیں، یہ کہنا کہ آٹھ دس ہزار روپے لگائیں اور کل ہی سے اس پر نفع حاصل کریں، بلکہ پہلے مہینہ کا نفع رقم دیتے ہوئے ہی وضع کرلیں، نا قابلِ فہم باتیں ہیں، دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی تجارت ہو جو شروع ہونے سے پہلے ہی یا شروع ہوتے ہی نفع دینے لگے —— اللہ تعالیٰ نے دنیا میں نفع ونقصان کو ظاہری اسباب سے متعلق رکھا ہے، ان اسباب کو نظر انداز کر کے کام کرنا توکل نہیں، بے وقوفی اور بے عملی ہے، اور اس کی وجہ سے نقصان اٹھانا اور حسرت وافسوس سے دوچار ہونا نوشتۂ دیوار!!

(۱۹ رمارچ ۱۹۹۹ء)

آزاد مارکٹ —— اسلامی نقطۂ نظر

یکم اپریل ۲۰۰۱ء ہندوستان کی معاشی اور تجارتی تاریخ میں ایک انقلابی اور یادگار تاریخ ہے۔ ۱۹۹۱ء میں ہندوستان نے مغربی نقطۂ نظر کے مطابق معاشی اصلاحات کا آغاز کیا تھا، ان اصلاحات کے تحت مختلف مرحلوں میں بیرون درآمدات پر مقداری پابندیوں کو برخواست کیا گیا ہے، ۱۹۹۶ء میں ۱۱۶۱ اشیاء، ۱۹۹۷ء میں ۴۸۸ اشیاء، ۱۹۹۸ء میں ۳۹۱ اشیاء، ۱۹۹۹ء میں ۸۹۴ اشیاء اور اب باقی ۷۱۴ اشیاء پر مقداری تحدید ختم کردی گئی ہے اور اس طرح ہندوستان کی مارکٹ عملی طور پر آزاد مارکٹ میں تبدیل ہو چکی ہے —— اس فیصلہ نے عوام کے بہت بڑے حصہ کو مسرور وشادکام کیا ہے، اور لوگ امید کررہے ہیں کہ آئندہ چند مہینوں میں اشیاء کی قیمتوں میں نمایاں کمی ہوگی، اور انہیں سستے دام، معیاری چیزیں مل سکیں گی۔ دوسری طرف ملک کے صنعت کار اور ان سے بڑھ کر کاشت کار اس صورتِ حال سے بہت پریشان اور خوف زدہ ہیں، وہ اس اندیشہ میں حق بجانب ہیں کہ ملک کی تجارت پر بیرونی تاجروں اور صنعت کاروں کا قبضہ ہو جائے گا، ہندوستان کی صنعتیں تباہ ہو جائیں گی، اور ہندوستانی معیشت کا سب سے اہم شعبہ زراعت پر بھی غیر معمولی اثر پڑے گا، کیوں کہ بیرونی ممالک اپنی ترقی یافتہ ٹکنالوجی کی وجہ سے اتنی ارزاں قیمت میں اناج فراہم کردیں گے کہ ہندوستانی کسانوں کو ان کا مقابلہ دشوار ہو جائے گا۔ اور جب کسانوں کو اپنی محنت کی صحیح اجرت حاصل نہ ہو سکے گی، تو وہ کاشتکاری کیوں کریں گے؟ اور محنت ومشقت برداشت کر کے ہمارے لئے کیوں اناج پیدا کریں گے؟۔

ملک کے بہت سے بہی خواہ اور عاقبت اندیش لوگوں کو بھی حکومت کے اس فیصلہ پر تشویش ہے، کیوں کہ یہ معاشی اعتبار سے دوسرے ملکوں کی غلامی قبول کرنے کے مترادف

ہے، اس سے اندرون ملک بے روزگاری میں اضافہ ہوگا، اور یہ بے روزگاری اور محرومی عدمِ استحکام کو جنم دے گی، جب ایک ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' پورے ملک کو اپنا غلام بنا سکتی ہے، تو اتنی ساری کمپنیاں کیا کچھ نہیں کر سکتی ہیں؟ — حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں پہلو اہم ہیں، تجارت میں مسابقت ضروری ہے، اس سے قیمتوں میں توازن قائم رہتا ہے، اور عوام کو فائدہ پہنچتا ہے، اور ایسی تدبیر بھی ضروری ہے کہ ملکی صنعت کاروں اور کاشتکاروں کے لئے ان کا ذریعۂ معاش بوجھ نہ بن جائے، ان دونوں پہلوؤں کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ تجارت کا نظام 'طلب ورسد' کے اصول پر قائم ہے، اگر کسی چیز کی طلب بڑھ جائے، لیکن اس کی تیاری اور فراہمی طلب کے مطابق نہ ہو پائے، تو قیمتیں چڑھیں گی، اور اگر وہ طلب کے برابر ہو، تو قیمت میں توازن رہے گا، اور طلب کے مقابلہ اشیاء کی فراہمی اور تیاری زیادہ ہو، تو قیمتیں گر جائیں گی، تاجروں کا عام قاعدہ یہ ہے کہ وہ اس کو اپنی فطرت پر قائم رہنے نہیں دیتے، بلکہ بازار میں مصنوعی قلت پیدا کر دیتے ہیں، تاکہ قیمتیں غیر فطری طریقہ پر بڑھ جائیں، تجار نے ہمیشہ اس حربہ کو اختیار کیا ہے، اور غریب عوام کی زندگی کو اپنے نفع کے لئے بوجھل بنا کر رکھا ہے۔

اسلام سے پہلے بھی عربوں میں ایسے طریقے مروج تھے، مثلاً ایک طریقہ یہ تھا کہ اگر کوئی تجارتی قافلہ باہر سے آتا، تو شہر کے سرمایہ کار تاجر باہر نکل کر ان کے مال سستے داموں خرید لیتے، اور انہیں باور کراتے کہ کھلے بازار میں یہ سامان اسی قیمت میں فروخت ہو رہا ہے، اس سے دو نقصان ہوتا، ایک تو جو لوگ زراعت کے ذریعہ پیداوار حاصل کرتے، یا محنت کر کے مال تیار کرتے، انہیں بازار کے عام نرخ کے مقابلہ کم قیمت ملتی اور اپنی محنت کا کما حقہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا، دوسری طرف کھلے بازار میں مال آنے سے پہلے اس کے خرید لینے کی وجہ سے مارکٹ میں اس سامان کی مصنوعی قلت پیدا ہو جاتی، اور جب لوگوں کی ضروریات کے لحاظ سے اشیاء کم پڑتیں، تو قیمتیں بڑھ جاتیں، اور عوام نقصان اٹھاتے، گویا چند سرمایہ دار تاجروں کی وجہ سے پیدائش کار اور

عوام دونوں کو نقصان ہوتا، اس طریقہ کو ''تلقی رکبان'' کہا جاتا تھا، رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔

اسی طرح ایک طریقہ یہ تھا کہ دیہات کے لوگ جب اپنی پیداوار شہر میں لے کر آتے، تو دیہات کی قیمتوں کے معیار نیز شہر کے حالات سے ناآگہی کی وجہ سے کم قیمت میں اپنا مال فروخت کر دیتے، شہر کے جو چالاک تاجر ہوتے، وہ اسے ترغیب دیتے کہ اپنا مال ان کے حوالے کر دیں، وہ اس کو ان کے لئے گراں قیمت میں فروخت کر دیں گے، اس طرح دیہات سے سامان آنے کی وجہ سے شہر میں جو ارزانی ہو سکتی تھی وہ پیدا نہیں ہو پاتی، اس کو ''بیع حاضر للبادی'' کہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقہ کو بھی منع فرمایا

سامان کے نرخ کو مصنوعی طور پر بڑھانے کا ایک پرانا طریقہ ذخیرہ اندوزی کا رہا ہے، یعنی اشیاء ضروریہ کو روک کر رکھنا تاکہ بازار میں اس کی قلت پیدا ہو جائے اور اس طرح ان چیزوں کا نرخ اونچا ہو جائے، یہ طریقہ آج بھی مروج ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی بڑی مذمت فرمائی ہے، اور ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ نے ایسے لوگوں پر لعنت بھی فرمائی ہے، حضرت عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو احتکار کا مرتکب پایا، تو اسے منع کیا اور کہا کہ حضور ﷺ نے ایسے شخص کے بارے میں جذام کا خیال ظاہر فرمایا ہے، راویؒ کا بیان ہے کہ واقعی وہ شخص جذام میں مبتلا ہوا (ابن ماجہ: باب الحکرۃ والجلب، مسند احمد: ۱/۲۱) احتکار کی ممانعت کی وجہ یہی ہے کہ اس سے قیمتیں غیر فطری طریقہ پر بڑھتی ہیں، اور عام لوگوں کو نقصان پہونچتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ''نجش'' سے منع فرمایا، نجش سے مراد یہ ہے کہ کسی سامان کی ڈاک لگائی جائے، اور ایک شخص کا سامان لینے کا ارادہ نہ ہو، لیکن وہ محض قیمت چڑھانے کے لئے بڑھ کر بولی لگائے، تاکہ دوسرے خواہش مند حضرات خواہ مخواہ قیمت بڑھا دیں اور اس طرح مناسب قیمت سے زیادہ میں مال فروخت ہو، رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ اشیاء کی قیمتوں کو فطری حالت پر رہنے دیا جائے، نہ مصنوعی طور پر قیمت بڑھائی جائے، اور نہ قیمت گرائی جائے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص خدمتِ

اقدس میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! اشیاء کی قیمتیں متعین فرما دیجئے، آپ ﷺ نے کہا: اسے چھوڑ دو، پھر ایک دوسرے صاحب نے یہی بات کہی، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ ہی قیمت کو اٹھاتے اور گراتے ہیں، میں اس حال میں اللہ سے ملنا چاہتا ہوں کہ مجھ پر کسی کا دعوای ظلم نہ رہے، (ابوداؤد: حدیث نمبر، ۳۴۵۰) حضرت انس ؓ کی ایک روایت میں ہے کہ لوگوں نے عرض کیا: قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں، آپ ﷺ ہمارے لئے نرخ متعین فرما دیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیمت مقرر کرنے والا اللہ ہے، وہی تنگی اور کشادگی پیدا کرتا ہے۔ اور وہی رزاق ہے، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۴۵۱)

غرض منشأ نبوی یہ ہے کہ مارکٹ کو فطری حالت پر رہنا چاہئے، کبھی طلب کے اعتبار سے رسد بڑھ گئی، اور عوام کو فائدہ ہوگیا، اور کبھی رسد کے اعتبار سے طلب زیادہ رہی اور تاجروں کو معمول سے زیادہ فائدہ ہوگیا، چنانچہ حضرت جابر ؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگوں کو چھوڑ دو، اللہ ہی بعض کو بعض سے رزق فراہم کرتا ہے،'' دعوا الناس یرزق الله بعضهم من بعض ''، (مسلم: حدیث نمبر، ۱۵۲۲) — تاہم اگر گراں فروشی حد برداشت سے بڑھ جائے، اور تجار اخلاق کی زبان سمجھنے سے قاصر ہوں، تو حکومت کو حق ہے کہ وہ قانون کی لاٹھی استعمال کر کے اس مسئلہ کو حل کرے، اسی لئے فقہاء نے اجازت دی ہے کہ خصوصی حالات میں ذخیرہ اندوزی کے سدِ باب کے لئے ذخیرہ اندوزوں کا مال زبردستی نکالا جا سکتا ہے، اور اشیاء ضروریہ کا نرخ متعین کر کے تجار کو پابند کیا جا سکتا ہے کہ وہ اسی قیمت پر سامان کو فروخت کریں۔

یہ اسوۂ نبوی اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اسلام کا اصل مزاج یہی ہے کہ تمام لوگوں کو اپنا مال مارکٹ میں لانے کی آزادی حاصل رہے، اور وہ بے روک ٹوک خرید و فروخت کر سکیں تا کہ مسابقت برقرار رہے، اس سے لوگوں کو سستی اور معیاری اشیاء حاصل ہو سکیں گی۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی طبقہ کو ضرر سے بچانا اور ان کے ساتھ ناانصافی کا سدِ باب کرنا اسلامی تعلیمات کا اہم تقاضا ہے، اللہ تعالیٰ نے عدل کا عمومی حکم دیا

ہے، "ان اللہ یامر بالعدل والاحسان" (النحل: ۹۰) ملکی صنعتوں کی تباہی اور کاشتکاروں کی مایوسی میں نہ صرف ان لوگوں کا نقصان ہے، بلکہ مجموعی اعتبار سے اس کی مضرت کا اثر پورے ملک پر پڑتا ہے، کیوں کہ جب بے روزگاری بڑھے گی، تو لوگوں کی بنیادی ضروریات کا پورا ہونا بھی مشکل ہو جائے گا، ملک میں لوٹ کھسوٹ اور جرائم کا رجحان بڑھے گا، اور جب بیرونی کمپنیاں تجارت کے کسی شعبہ پر حاوی ہو جائیں گی، اور اندرونِ ملک صنعتوں پر غلبہ حاصل کرلیں گی، تو پھران کا استحصال سے باز رہنا دشوار ہوگا، اور اندیشہ ہے کہ وہ اپنی منمانی قیمت لگا کر لوگوں کو اسی قیمت میں خرید وفروخت کرنے پر مجبور کر کے رکھ دیں گی، پھر تو یہ ارزانی بھی بے ثبات ثابت ہوگی اور گرانی پر کنٹرول مشکل ہو جائے گا۔

اس لئے ضروری ہے کہ جب کسی کمپنی کو ملک کے بازار میں بلاتحدید داخل ہونے کی اجازت دی جائے، تو اس سے ایسے معاہدے کئے جائیں کہ بتدریج وہ اپنی ٹکنالوجی بھی فراہم کرے، اور ملک میں اپنی صنعتیں قائم کرے، ان صنعتوں میں مقامی ہنرمندوں اور مزدوروں کو کام کے مواقع دئے جائیں، اس طرح بے روزگاری کا یہ سیلاب تھم سکے گا، اور عام لوگوں کے لئے اس کے فوائد دیرپا ہوں گے، قدیم زمانہ میں صنعت وحرفت میں، وسائل اور ٹکنالوجی کا اتنا فرق نہیں ہوتا تھا، کہ قیمتوں پر اس کا بہت زیادہ اثر پڑے، البتہ مزدور اور نقل وحمل کی اجرت کے فرق کی وجہ سے اشیاء کی پیداوار مہنگی یا سستی ہوا کرتی تھی، اس تفاوت کو دور کرنے، قیمتوں میں توازن رکھنے اور ملکی پیداوار کو بچانے کی غرض سے ایک طریقہ تجارتی ٹیکس کا مروج تھا، چنانچہ فقہاء نے غیر ملکی تاجروں سے تجارتی ٹیکس وصول کرنے کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، اس کے بدلے انہیں تجارت کے مواقع بھی دیئے جاتے تھے، اور ان کی حفاظت ونگہداشت کی ذمہ داری بھی قبول کی جاتی تھی، اب ٹکنالوجی کے ترقی یافتہ اور پسماندہ ہونے کا بھی قیمت پر نمایاں اثر پڑتا ہے اس لئے اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، مارکٹ کو ملکی اور

بیرونی تاجروں کے لئے کھولنا تاکہ گرانی کم ہو، اور سرمایہ داروں کو عوام کا استحصال کرنے کا موقع نہ ملے، اور ایسے قوانین وتحدیدات بھی ضروری ہیں، جن کے ذریعہ جدید ٹکنالوجی سے محروم ملکی صنعت کاروں اور کاشتکاروں کے مفادات کا بھی تحفظ ہو، اور ان کے حقوق بھی پامال نہ ہونے پائیں، کہ یہی تقاضۂ عدل ہے، اور اسلام کی تمام تعلیمات اور شریعت کی تمام ہدایات کا لُبِّ لُباب یہی ہے کہ انسانوں کی یہ بستی عدل پر قائم رہے، کہ یہی تقویٰ سے قریب ترین راہ ہے، "اعدلوا هوا قرب للتقوىٰ" (المائدۃ:۸)۔

(۱۳/اپریل ۲۰۰۱ء)

خدا سے پانی مانگئے !

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کو جن نعمتوں سے سرفراز کیا ہے، وہ بے شمار ہیں، ان میں کچھ نعمتیں روحانی ہیں اور کچھ مادی ہیں۔ یہ مادی نعمتیں انسانوں کی اس بستی میں جینے اور رہنے کے لئے ناگزیر ہیں، ان ضرورتوں میں سب سے اہم ہوا اور ہوا کے بعد پانی ہے، ہوا اور پانی اس فراوانی کے ساتھ مہیا ہیں کہ ہمیں کبھی ان کی اہمیت اور قدر و قیمت کے بارے میں سوچنے کا خیال بھی نہیں گذرتا، غور کیجئے کہ ایک لیٹر صاف و شفاف پانی ہم بازار سے دس تا بارہ روپے میں خرید کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے پانی کی بے حساب مقدار کھیت اور باغات کی آبیاری، انسان کی سیرابی اور انسان سے متعلق چیزوں کی صفائی اور دھلائی کے لئے پیدا فرمائی ہے، اگر اس پانی کی قیمت بارہ کے بجائے پانچ یا دو ہی روپے لیٹر کے حساب سے انسان سے وصول کی جاتی تو یہ انسان کے لئے کس قدر گراں بار ہو جاتا ؟ اگر آکسیجن کا ایک سیلنڈر حاصل کیا جائے تو سینکڑوں روپے قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، انسان کو سانس لینے کے لئے ہر وقت آکسیجن مطلوب ہے، اگر اسے اس آکسیجن کی قیمت ادا کرنی پڑتی تو کتنا دشوار ہوتا! یہ اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت ہے، کہ کائنات کے اس چھوٹے سے محلہ میں جسے زمینی دنیا کہا جاتا ہے، پانی اور ہوا کی نہایت ہی وافر مقدار موجود ہے، جب کہ فضاء میں اس سے بڑے سیارے موجود ہیں، لیکن وہاں نہ پانی کا کوئی قطرہ دستیاب ہے، اور نہ ہوا کا کوئی جھونکا، اس سے اندازہ کیجئے کہ حضرت انسان کی ضیافت و مہمان نوازی اور راحت رسانی کا کس خوبی سے انتظام کیا گیا ہے۔

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی جن نعمتوں کا بار بار ذکر کیا ہے، ان میں ایک پانی بھی ہے، بلکہ فرمایا گیا کہ ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی ہی سے پیدا کیا ہے، ''وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ'' (الانبیاء: ۳۰) انسان کی زندگی کا مدار تو پانی پر ہی ہے، جتنے بھی ذی روح جانور ہیں، ان کی زندگی کا بقاء بھی پانی ہی پر منحصر ہے، چونکہ مادہ تخلیق میں بھی پانی کا ایک جزء موجود ہوتا ہے،

اسی لئے قرآن نے انسانی نطفہ کو بھی "ماء دافق" یعنی اچھلتے ہوئے پانی سے تعبیر کیا ہے۔ (الطارق:۶) اور یہ بھی فرمایا گیا کہ تمام جاندار کی تخلیق اصل میں پانی ہی سے ہوئی ہے، "وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ" (النور:۴۵) نباتات کا تو وجود ہی پانی پر موقوف ہے، کہ اسی سے زمین سے کونپلیں نکلتی ہیں، اور پھر آہستہ آہستہ سایہ دار درختوں اور لہلہاتے ہوئے سرسبز پودوں کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں، "وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ" (لقمان:۱۰) جو جمادات ہیں، وہ بھی پانی سے بے نیاز نہیں، چاہے زمین ہو یا نمو پذیر زندہ پتھر ہوں، سب کو پانی کی ضرورت ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ زمین جب مردہ ہو جاتی ہے تو آسمان سے آبِ حیات بن کر بارش اس سے ہم آغوش ہوتی ہے، اور اس طرح اس کے لئے زندگی کا ایک نیا سروسامان مہیا کرتی ہے، "وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا" (النحل:۶۵)

پھر خدا کی قدرت دیکھئے کہ انسان کے لئے کس طرح پانی کا انتظام کیا جاتا ہے، دنیا بھر کا استعمال شدہ گندہ اور آلودہ پانی دریاؤں، نہروں اور ندیوں کے ذریعہ اپنی تمام غلاظتوں کے ساتھ سمندر تک پہنچتا ہے، سمندر کا نمکین پانی اس آلودگی کو جذب کر لیتا ہے، اگر سمندر کے کھارے پانی میں آلودگی کو جذب کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو انسان کے لئے اس کرۂ ارض پر جینا دوبھر ہو جاتا، پھر ایک طرف سمندر کی تہہ میں گندھک کی بچھی ہوئی چادر پانی کو کھولاتی ہے، اور دوسری طرف سورج اپنے جگر کو بھون بھون کر سمندر کی اوپری سطح کو گرم کرتا ہے، یہاں تک کہ سمندر سے بھاپ اٹھتا ہے، اور ہوائیں اسے گود لے کر اڑن کھٹولا بن فضاؤں میں گھومتی پھرتی ہیں، اور ایک ایسی سطح پر لے جاتی ہیں، کہ اسی بھاپ میں کثافت پیدا ہوتی ہے، اور اب یہ ابرِ رحمت بن کر ہوا کے دوش پر سوار فضاء کی سیر کرتا رہتا ہے، اور جہاں چاہے برس جاتا ہے۔

پھر اس میں بھی خدا کا نظامِ قدرت یہ ہے کہ صحراؤں اور ریگستانوں کو چونکہ اپنے بقاء کے لئے پانی کی چنداں ضرورت نہیں، اس لئے وہاں کم سے کم بارش ہوتی ہے، جہاں سرسبز و شاداب کھیت ہوں، درخت اور جنگلات ہوں، وہاں پانی کی ضرورت زیادہ ہوتی

ہے، کہ ان کا بقاء پانی ہی پر موقوف ہے، اس لئے یہاں بادل کی نگاہ التفات بھی بڑھ جاتی ہے، غالبًا اللہ تعالیٰ کے اسی نظام ربوبیت کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ پودوں اور جانوروں کی وجہ سے اللہ بارش نازل فرماتے ہیں، چونکہ جہاں درخت اور جنگلات ہوتے ہیں، وہیں پالتو اور جنگلی، چلنے والے اور رینگنے والے جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کی بہتات ہوتی ہے۔

یہ پانی کا ظاہری اور نظر آنے والا نظام ہے، لیکن اصل قوت خدا کی قوت ہے، جس کے اشارے اور حکم سے ہی انسان کو کوئی نعمت حاصل ہوتی ہے اور وہ کسی نعمت سے محروم کیا جاتا ہے، اب یہی دیکھئے کہ سمندر کے پانی کی حرارت اور سورج کی تپش کم وبیش ہمیشہ رہتی ہے، ہوائیں بھی ایک طرف سے دوسری طرف اپنا سفر جاری رکھتی ہیں، بادل بھی فضاء میں جگہ جگہ اپنے گھروندے بنائے رہتا ہے، سوکھی ہوئی زمین اور نیم مردہ درخت ہر سال موسم گرما میں آسمان کی طرف دست سوال پھیلائے رہتے ہیں، لیکن کسی سال معتدل بارش ہوتی ہے، کسی سال ضرورت سے زیادہ، اور کسی سال خشک سالی اور قحط کی وجہ سے زمین قطرہ قطرہ کو ترس جاتی ہے، یہ وہی مشیت خداوندی کا کرشمہ ہے، کہ جب اس کی مشیت نہیں ہوتی تو ظاہری اسباب کے موجود ہونے کے باوجود مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔

اس وقت ہندوستان کا بڑا حصہ قحط کی جس کیفیت سے دوچار ہے، اور کسان کی آنکھوں میں دوپہر کی دھوپ میں بھی جس طرح اندھیرا چھایا ہوا ہے، یہ بہت ہی تشویشناک ہے، اس سلسلہ میں ایک طرف تو ہمیں اپنا احتساب کرنا چاہئے، کہ کہیں ہماری بداعمالیاں تو اللہ کی اس پکڑ کا باعث نہیں ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا کرنا چھوڑ دیتی ہے تو اس سے بارش روک لی جاتی ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں حساب کے ساتھ پوری زکوٰۃ ادا کرنے والوں کا تناسب کم ہے، اگر تمام صاحب نصاب مسلمان اپنی پوری زکوٰۃ ادا کریں تو اس ملک میں کوئی بھوکا مسلمان نہ رہے، حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی گروہ آمادۂ ظلم وجور ہو جاتا ہے تو اس پر آسمانی آزمائشیں مسلط کر دی جاتی ہیں، جیسا کہ اہلِ مکہ پر قحط نازل کیا گیا تھا، ظاہر ہے

ہمارے ملک میں جس بے دردی کے ساتھ انسانوں کا خون بہایا جارہا ہے، بوڑھوں کو تہہ تیغ کیا جاتا ہے، عورتوں اور معصوم بچوں کو زندہ جلایا جاتا ہے، برسرِ عام خواتین کی بے آبروئی کی جاتی ہے، یہاں تک کہ پیٹ میں پلنے والے بچے کو بھی نہیں بخشا جاتا، ایسی قوم پر اللہ کے عذاب کے لئے کسی اور حجت کی ضرورت ہے؟ یہ تو ایسے واقعات ہیں کہ اگر آسمان کی آنکھیں خون کے آنسو برسائیں تب بھی تعجب نہیں ہونا چاہئے۔

یہ تو اپنے احتساب کا پہلو ہے، دوسرا پہلو خدا سے مانگنے اور رب کائنات سے رجوع کرنے کا ہے، اللہ تعالیٰ نے نماز اور صبر کو اللہ سے مدد مانگنے کا ذریعہ ووسیلہ قرار دیا ہے، "اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ" (البقرۃ:۱۵۳) رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی عملی تطبیق فرمائی ہے کہ ہر ضرورت کے لئے آپ ﷺ نے نماز رکھی، کوئی خوشی کی بات پیش آئے تو نمازِ شکر، کسی مسلمان کی موت ہو جائے تو استغفار کے لئے نمازِ جنازہ، کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو نمازِ توبہ، کسی معاملہ میں خیر وشر اور نفع ونقصان سمجھ میں نہ آتا ہو، تو نمازِ استخارہ، سورج گہن ہو تو نمازِ کسوف، چاند گہن ہو تو نمازِ خسوف، کوئی ضرورت درپیش ہو تو نمازِ حاجت، اسی طرح اگر بارش رُک جائے تو نمازِ استسقاء۔

رسول اللہ ﷺ نے استسقاء یعنی اللہ تعالیٰ سے بارش طلب کرنے کے لئے نماز بھی پڑھی ہے، اور صرف دعاء پر بھی اکتفا فرمایا ہے، ایک بار آپ ﷺ خطبہ جمعہ ارشاد فرمارہے تھے، کہ ایک دیہاتی آیا، انہوں نے عرض کیا کہ مویشی ہلاک ہو رہے ہیں، اور بال بچے بھوکے مر رہے ہیں، آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے بارش کے لئے دعاء مانگئے، آپ ﷺ نے تین بار دعاء کی، کہ اے اللہ! ہمیں بارش عطا فرما، بعض روایت میں "اللھم أسقنا" کے الفاظ ہیں، اور بعض میں "أغثنا" کے، اس وقت آسمان بالکل صاف تھا، لیکن آپ ﷺ کی دعاء ایسی قبول ہوئی کہ فوراً بادل ظاہر ہوا، اور چھ دن تک بارش ہوتی رہی، اگلے جمعہ جب آپ ﷺ خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے، تو پھر وہی دیہاتی یا کوئی اور شخص عرض کناں ہوا کہ اللہ کے رسول! گھر گر رہے ہیں، اور جانور غرقاب ہو رہے ہیں، آپ دعاء فرمایئے کہ بارش تھم جائے، آپ نے دعاء فرمائی کہ ہمارے گرد بارش ہو، ہم پر نہ ہو، "اللھم حوالینا ولا

علینا''، چنانچہ مدینہ پر بارش تھم گئی اور گرد و پیش بارش کا سلسلہ ایک ماہ کے قریب جاری رہا، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۳۳) حضور ﷺ نے ہاتھ اٹھا کر بارش کے لئے دعاء فرمائی تھی، اور آپ ﷺ کے ساتھ تمام لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر دعاء کی، حالاں کہ خطبہ میں ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنے کا معمول نہیں تھا، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے دستِ مبارک اتنا اونچا اٹھایا کہ بغل کی سفیدی نظر آتی تھی، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۲۹، ۳۰، ۳۱) حضور ﷺ کے اسی عمل کی بناء پر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک استسقاء کے لئے نماز پڑھنا ہی ضروری نہیں، دعاء پر بھی اکتفا کیا جا سکتا ہے۔ (رد المحتار: ۳/۷۱)

بہتر یہ ہے کہ دعاء کرنے کے ساتھ ساتھ نماز استسقاء بھی پڑھی جائے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے دو رکعت نماز بھی خاص اس مقصد کے لئے ادا فرمائی ہے، متعدد حدیثوں میں اس کا ذکر موجود ہے، اکثر فقہاء اور حنفیہ میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ مستحب ہے، نماز استسقاء دو رکعت ہے، جس میں زور سے قرأت کی جائے گی، عباد بن تمیم نے اپنے چچا کے واسطہ سے رسول اللہ ﷺ کا یہی عمل نقل کیا ہے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۲۴) بہتر ہے کہ ''سبح اسم ربك الاعلیٰ اور هل أتك حديث الغاشيه ''کی سورت پڑھی جائے۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۲/۴۱۵)

نماز کے بعد زمین پر کھڑے ہو کر اور عصا کا سہارا لے کر عید کی طرح دو خطبے دیے جائیں، یہ رائے فقہاء حنفیہ میں امام محمدؒ کی ہے، اور اسی کے قائل مالکیہ اور شوافع ہیں، (رد المحتار: ۱/۷۱، الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۲/۴۲۰) کیونکہ متعدد حدیثوں میں خاص کر عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے نمازِ عید کی طرح نمازِ استسقاء ادا فرمائی ہے، اس خطبہ میں زیادہ تر استغفار کے کلمات کہے جائیں، اور جیسے خطبۂ عیدین میں کلماتِ تکبیر بار بار کہے جاتے ہیں، اس میں استغفار کیا جائے، کیونکہ یہ موقع ہی اللہ تعالیٰ سے استغفار کا ہے، یہ رائے حنفیہ میں حضرات صاحبینؒ کی ہے۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۲/۴۲۰) اور امام شافعیؒ کے نزدیک تو جیسے خطباتِ عیدین میں تکبیرات تشریق کہی جاتی ہیں، اسی طرح استسقاء کے خطبہ اولی میں نو بار اور خطبہ ثانیہ میں سات بار کلمہ استغفار کہنا مستحب ہے۔ (حوالۂ سابق: ۲/ ۴۲۱)

خطبہ شروع کرنے کے بعد جب کچھ حصہ گذر جائے، تو امام اپنی چادر کی ہیئت بدل دے، اگر کپڑا چوکور ہو، تو اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا حصہ اوپر کردے، اور گول ہو تو دائیں طرف کا حصہ بائیں اور بائیں طرف کا حصہ دائیں کردے، لیکن یہ صرف امام کرے، مقتدیوں کو اس طرح نہیں کرنا چاہئے، عبداللہ بن زید ﷺ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی رداء مبارک کی ہیئت اسی طرح تبدیل فرمائی ہے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۱۱) یہ چادر کا پلٹنا گویا زبان حال سے اللہ کے سامنے اپنی عرض داشت پیش کرنا ہے، کہ قحط کی حالت کو اسی طرح بدل دیجئے۔

نماز کے لئے جاتے ہوئے بہتر ہے کہ ننگے پاؤں ہوں، جسم پر نئے کپڑے نہ ہوں، بلکہ پرانے دھلے ہوئے، یا پیوند لگائے ہوئے کپڑے ہوں، جبین ندامت سے جھکی ہوئی ہو، دل میں خشیت ہو، اور ظاہر میں بھی اللہ کے سامنے تذلل اور درماندگی کا اظہار ہو، مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے علاوہ جہاں کہیں ہو، تو بہتر ہے کہ نماز استسقاء آبادی سے نکل کر میدان میں کھلی جگہ ادا کی جائے۔ (الدر المختار مع الرد: ۲/۳۰۷) یہ بھی مستحب ہے کہ نماز استسقاء کے موقع سے بوڑھوں، اور بچوں کو بھی ساتھ رکھا جائے، بلکہ یہ بھی کہ بے زبان جانور بھی ساتھ ہوں (رد المختار: ۲/۳۰۷) کہ ان کمزوریوں کو دیکھ، اللہ کا دریائے رحمت جوش میں آجائے۔

اگر بارش نہ ہو تو مسلسل تین دن نماز ادا کی جائے، یہ بھی بہتر ہے کہ نماز استسقاء پڑھنے سے پہلے تین دنوں تک لوگ روزہ رکھیں، اور توبہ کا خوب اہتمام کریں، نیز اگر کسی کا حق غصب کئے ہوئے ہوں، تو حق ادا کردینے کی کوشش کریں۔ (درمختار ورد المحتار: ۲/۲۰۷) اس نماز کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں، لیکن امام ابوداؤد نے حضرت عائشہؓ سے جو روایت نقل کی ہے، اس میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سورج نکلتے وقت نمازِ استسقاء کے لئے تشریف لے گئے۔ (ابوداؤد، باب رفع الیدین فی الاستسقاء) اس لئے ظاہر ہے کہ اس وقت نمازِ استسقاء ادا کرنی زیادہ بہتر ہے، اس کا بھی اہتمام کرنا چاہئے کہ نماز میں سماج کے دیندار لوگوں کو شامل رکھا جائے، حضرت عمر ﷺ نے خاص طور پر حضرت عباس ﷺ کو اور

حضرت معاویہ ؓ نے یزید بن اسود ؓ کو نماز استسقاء میں شامل رکھا تھا، اور انہیں سے دعاء کرائی تھی۔

امام خطبہ کے درمیان بارش کے لئے دعاء کرے گا، اور دعاء کے وقت اپنا رخ قبلہ کی طرف کرلے گا، جیسا کہ گذرا ہاتھ اٹھا کر دعاء کرے گا اور لوگ اس کی دعاء پر آمین کہتے جائیں گے، استسقاء کے لئے رسول اللہ ﷺ کی مختلف دعائیں منقول ہیں، غالباً سب سے مختصر دعاء وہ ہے جس کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے، تین بار ''اللھم اغثنا'' کے الفاظ، یہاں ایک تفصیلی دعاء کا نقل کردینا بھی مناسب ہوگا، جسے امام ابوداؤد نے نقل فرمایا ہے:

''اللھم اسقنا غيثاً مغيثاً مرئياً مريعاً نافعاً غير ضار عاجلاً غير اجل، اللھم أسق عبادك وبهائمك وانشر رحمتك و أحي بلدك الميت''

(ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۱۶۹، ۱۱۷۶)

اے اللہ! ہمیں بارش سے سیراب فرما، ایسی بارش جو ہماری فریاد کو پوری کرے، ہلکی پھواریں، غلہ اگانے والی ہوں، نفع دینے والی، نہ کہ نقصان پہنچانے والی، جلد آنے والی نہ کہ دیر لگانے والی، خداوندا! اپنے بندوں اور جانوروں کو سیراب کر، اپنی رحمت کو پھیلا، اور اپنے مردہ شہروں کو زندہ کردے۔

(۹/اگست ۲۰۰۲ء)

قنوتِ نازلہ — احکام ومسائل

اللہ قادر مطلق ہے، اور انسان اپنے خالق کے مقابلہ عاجز محض، دنیا میں کوئی بھی واقعہ جو پیش آتا ہے، اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر وہ وقوع پذیر نہیں ہوسکتا؛ اس لئے ایک صاحبِ ایمان کا کام یہ ہے کہ جب بھی وہ کسی مصیبت یا آزمائش سے دوچار ہو، اللہ کی طرف رجوع کرے، اور اللہ کے خزانۂ غیب سے مدد کا طلب گار ہو؛ اسی لئے اسلام میں ایک مستقل نماز نمازِ حاجت رکھی گئی، کہ انسان کی کوئی بھی ضرورت ہو، دو رکعت نماز خاص اسی نیت سے پڑھ کر اللہ کے سامنے دستِ سوال پھیلائے، بعض دفعہ ضرورتیں یا ابتلائیں غیر معمولی ہو جاتی ہیں، ان مواقع کے لئے شریعت نے مخصوص نمازیں رکھی ہیں، جیسے کسی کی وفات ہو جائے تو نمازِ جنازہ، بارش نہ ہو تو نماز استسقاء، کسی معاملہ کے بارے میں اضطراب ہو کہ کیا پہلو اختیار کرنا چاہئے؟ تو نمازِ استخارہ، سفر کے موقع پر دوگانۂ سفر۔

اسی طرح اگر دشمنوں سے مقابلہ ہو، خواہ مسلمان اعداءِ اسلام کے خلاف اقدامی جہاد کررہے ہوں، یا مدافعت کے موقف میں ہوں، یا ظلم وابتلاء سے دوچار ہوں، تو ایسے مواقع کے لئے کوئی مستقل نماز تو نہیں رکھی گئی، لیکن ایک خصوصی دعاء رکھی گئی ہے، جس کو ''قنوتِ نازلہ'' کہتے ہیں، نازلہ کے معنی مصیبت وآزمائش کے ہیں، اور قنوت کے متعدد معانی آتے ہیں، جن میں سے ایک معنی دعاء ہے، اور اس تعبیر میں یہی معنی مراد ہے، پس قنوتِ نازلہ کے معنی ہوئے مصیبت کے وقت کی دعاء، رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں جو کمزور لوگ پھنسے ہوئے تھے، اور اہلِ مکہ انہیں ہجرت کی اجازت نہیں دیتے تھے، ان کے لئے قنوتِ نازلہ پڑھی ہے، اسی طرح ایک خاص واقعہ پیش آیا،

جس میں حفاظ کی ایک بڑی تعداد شہید کردی گئی، یہ واقعہ سیرت کی کتابوں میں بئر معونہ سے مشہور ہے، اس موقع پر بھی آپ ﷺ نے ایک ماہ تک قنوت نازلہ پڑھی ہے۔

قنوتِ نازلہ کے سلسلہ میں کئی باتیں قابلِ ذکر ہیں، قنوتِ نازلہ کا حکم رسول اللہ ﷺ کے لئے مخصوص تھا، یا آج بھی امت کے لئے باقی ہے؟ قنوتِ نازلہ کن مواقع پر پڑھی جائے گی؟ کس نماز میں پڑھی جائے گی؟ اور نماز میں قنوت پڑھنے کا کیا محل ہے؟ کون پڑھے گا؟ بآوازِ بلند پڑھی جائے یا آہستہ؟ جب امام قنوتِ نازلہ پڑھے تو مقتدی کیا کرے؟ قنوتِ نازلہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ سے کن الفاظ میں منقول ہے؟

بعضِ اہلِ علم کا خیال ہے کہ قنوتِ نازلہ آپ ﷺ کے لئے مخصوص تھی، لیکن تمام قابلِ ذکر فقہاء، وائمۂ مجتہدین کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی قنوتِ نازلہ کا حکم باقی ہے، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ سے مروی ہے کہ مسیلمہ کذاب سے جنگ کے وقت آپ نے قنوتِ نازلہ پڑھی، حضرت عمرؓ نے بھی بعض مواقع پر قنوتِ نازلہ پڑھی ہے، آپ کی قنوت کے الفاظ بھی کتبِ احادیث میں تفصیل کے ساتھ منقول ہیں، خلیفۂ راشد سیدنا حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان جنگ کے موقع پر دونوں نے قنوتِ نازلہ پڑھا ہے۔ (دیکھئے: منحۃ الخالق علی البحر: ۲/۴۴) — اس لئے صحیح یہی ہے کہ قنوتِ نازلہ کا حکم رسول اللہ ﷺ کے لئے مخصوص نہیں تھا، اور اب بھی یہ حکم باقی ہے، ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں۔ (دیکھئے: حلبی: ۴۲۰، شرح مہذب: ۳/۵۰۶، المقنع: ۴/۱۳۵)

فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ وجدال کے علاوہ دوسری مصیبتوں کے مواقع پر بھی قنوتِ نازلہ پڑھنی مسنون ہے، امام نووی شافعیؒ نے وباء اور قحط میں قنوت پڑھنے کا ذکر کیا ہے۔ (روضۃ الطالبین وعمدۃ المفتین: ۱/۲۵۴) حنابلہ کے یہاں بھی ایک قول یہ ہے کہ وبائی امراض پھوٹ پڑنے پر بھی قنوتِ نازلہ پڑھی جاسکتی ہے۔ (دیکھئے: الانصاف مع المقنع: ۴/۱۳۹) حنفیہؒ نے بھی لکھا ہے کہ طاعون کی بیماری پھیل جائے تو اس کا شمار بھی نوازل میں ہوگا، (ردالمحتار: ۲/۴۴۷) ویسے رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ سے وبائی امراض وغیرہ میں قنوتِ نازلہ پڑھنا ثابت نہیں، چنانچہ حضرت عمرؓ

کے عہد میں جو طاعون عمواس کا واقعہ پیش آیا، تو اس موقع پر قنوت نہیں پڑھی گئی (الانصاف:۴/۱۳۹) گویا اصل میں تو قنوتِ نازلہ جنگ کے موقع پر پڑھی گئی ہے، لیکن اس پر قیاس کرتے ہوئے فقہاء نے دوسری مصیبتوں میں بھی قنوتِ نازلہ کی اجازت دی ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ ﷛ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ صبح میں قنوت اسی وقت پڑھتے تھے، جب کسی گروہ کے حق میں دعاء کرنا یا کسی گروہ کے خلاف بددعاء کرنا مقصود ہوتا۔ (اعلاء السنن، حدیث نمبر:۱۷۱۵) اسی مضمون کی روایت حضرت انس ﷛ سے بھی مروی ہے۔ (اعلاء السنن: حدیث نمبر:۱۷۱۴)

گویا جب مسلمان اعداءِ اسلام سے جنگ کی حالت میں ہوں تب تو خاص طور پر قنوتِ نازلہ مسنون ہے، لیکن دوسری اجتماعی مصیبتوں کے موقع پر بھی قنوتِ نازلہ پڑھنے کی گنجائش ہے۔

قنوتِ نازلہ کس نماز میں پڑھنی چاہئے؟ اس سلسلہ میں روایتیں مختلف ہیں، حضرت عبداللہ ابن عباس ﷛ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے مسلسل ایک ماہ ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر میں آخری رکعت کے رکوع کے بعد قنوتِ نازلہ پڑھی ہے، جس میں آپ بنوسلیم، رعل، ذکوان، عصیہ قبائل کے لئے بددعاء فرمائی ہے۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر:۱۴۴۳)، بخاری میں حضرت انس ﷛ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ مغرب اور فجر میں قنوتِ نازلہ پڑھا کرتے تھے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۰۴) رسول اللہ ﷺ کا فجر اور مغرب میں قنوتِ نازلہ پڑھنا حضرت براء بن عازب ﷛ سے بھی مروی ہے۔ (طحاوی:۱/۱۴۲) حضرت ابوہریرہ ﷛ کی ایک روایت میں نمازِ عشاء میں قنوتِ نازلہ پڑھنے اور مکہ کے مستضعفین کے لے دعاء کرنے کا ذکر ہے، امام طحاوی نے اس کو متعدد سندوں سے نقل کیا ہے۔ ــــ چنانچہ فقہاء شوافع کے نزدیک تو پانچوں نمازوں میں قنوتِ نازلہ پڑھنے کی گنجائش ہے۔ (شرح مہذب:۳/۵۰۶، روضۃ الطالبین:۱/۲۵۴) حضرت امام احمد ﷬ کا بھی ایک قول یہی ہے، ایک قول کے مطابق فجر اور مغرب میں قنوتِ نازلہ پڑھنی چاہئے، ایک قول

یہ ہے کہ تمام جہری نمازوں میں پڑھ سکتا ہے، اور ایک قول کے مطابق صرف نماز فجر میں۔ (دیکھئے الشرح الکبیر ۴/۱۳۷، الانصاف مع المقنع : ۴/۱۳۷) غرض حنابلہؒ کے مختلف اقوال اس سلسلہ میں منقول ہیں۔

فقہاء احناف کے یہاں دو طرح کی تعبیرات ملتی ہیں، ایک یہ کہ تمام جہری نمازوں میں قنوتِ نازلہ پڑھنا چاہئے، فقہ حنفی کی اکثر متون یعنی بنیادی کتابوں میں یہی لکھا ہے، ''فیقنت الامام فی الصلوٰۃ الجھریۃ '' (ملتقی الابحر علی ہامش المجمع : ۱/۱۲۹) مشہور حنفی فقیہ علامہ حصکفیؒ نے بھی بعینہ یہی الفاظ لکھے ہیں۔ (در مختار مع الرد : ۲/۴۴۸) مشہور محقق امام طحطاوی نے بھی جہری نمازوں میں قنوت کی اجازت نقل کی ہے۔ (طحطاوی علی المراقی : ۲۰۶) یہی بات بعض دوسرے فقہاء احناف سے بھی منقول ہے، (دیکھئے : ردالمحتار : ۲/۴۴۸) ماضی قریب کے اہلِ علم میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے۔ (فیض الباری : ۲/۳۰۲) اور علامہ حموی نے اسی قول کو زیادہ درست قرار دیا ہے۔ (منحۃ الخالق علی البحر : ۲/۴۴) —— دوسری رائے یہ ہے کہ صرف نمازِ فجر میں قنوتِ نازلہ پڑھنا درست ہے، علامہ شامیؒ کا رجحان اسی طرف ہے، شامیؒ کا گمان ہے کہ ممکن ہے کہ بعض نقل کرنے والوں نے '' صلاۃ الفجر '' کو غلطی سے '' صلاۃ الجہر '' لکھ دیا ہو۔ (دیکھئے : ردالمحتار : ۲/۴۴۸) لیکن جب اتنی ساری نقول موجود ہیں، تو محض ظن وتخمین کی بناء پر اسے رد نہیں کیا جاسکتا، اسی لئے خود علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ شاید اس سلسلہ میں احناف کے دو قول ہیں، '' ولعل فی المسئلۃ قولین ''۔

(منحۃ الخالق علی ہامش البحر : ۲/۴۴)

پس، جو بات راجح معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ قنوتِ نازلہ مغرب، عشاء اور فجر تینوں میں پڑھنے کی گنجائش ہے، جیسا کہ اس سلسلہ میں احادیث موجود ہیں، البتہ چونکہ فجر کے بارے میں اتفاق ہے، اور دوسری نمازوں کی بابت اختلاف؛ اس لئے بہتر ہے کہ فجر میں قنوتِ نازلہ پڑھنے پر اکتفا کا جائے —— رہ گئی حضرت عبد اللہ ابن عباس ﷺ کی

روایت جس میں ظہر وعصر میں قنوتِ نازلہ پڑھنے کا ذکر ہے، تو اکثر فقہاء کے نزدیک وہ منسوخ ہے، اور احادیث میں بعض قرائن اس کے منسوخ ہونے پر موجود ہیں۔

نماز میں قنوتِ نازلہ کب پڑھی جائے گی؟ تو اس سلسلہ میں احادیث قریب قریب متفق ہیں کہ قنوتِ نازلہ رکوع کے بعد پڑھی جائے۔ (دیکھئے بخاری: حدیث نمبر۱۰۰۲، ابوداؤد: حدیث نمبر:۱۴۴۴) فقہاء نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔

(منحۃ الخالق علی ھامش البحر: ۲؍۴۴)

دعاءِ قنوت زور سے پڑھی جائے یا آہستہ؟ اس سلسلہ میں حضرت ابو ہریرہ کی صحیح روایت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبیلۂ مضر کے خلاف بد دعاء کرتے ہوئے جہراً قنوت پڑھی ہے۔ (بخاری کتاب التفسیر، باب قولہ: لیس لک من الامر شئی) اس لئے راجح قول یہی ہے کہ قنوتِ نازلہ امام کو جہراً پڑھنا چاہئے، اسی کو اہلِ علم نے ترجیح دیا ہے۔ (دیکھئے: اعلاء السنن: ۶؍۱۱۲) یوں دعاء آہستہ کرنا بھی درست ہے بلکہ عام حالات میں آہستہ دعاء کرنا افضل ہے، لہٰذا آہستہ دعاء کرنے کی بھی گنجائش ہے۔

— جب امام قنوتِ نازلہ پڑھے تو مقتدی کیا کرے؟ اس سلسلہ میں علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ اگر امام جہراً دعاء قنوت پڑھے، تو مقتدی آمین کہنے پر اکتفاء کرے، اور اگر آہستہ قنوت نازلہ پڑھے تو مقتدی بھی دعاء کو دہرائے۔ (ردالمحتار: ۲؍۴۴۹)

— اس بات پر حنفیہ کا اتفاق ہے کہ جیسے نماز سے باہر ہاتھ اٹھا کر دعا کی جاتی ہے، اس طرح قنوتِ نازلہ میں ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں کی جائے گی۔ لیکن ہاتھ باندھ کر رکھا جائے؟ یا چھوڑ دیا جائے؟ اس سلسلہ میں کوئی صریح حدیث موجود نہ ہونے کی وجہ سے فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ہاتھ باندھنا بہتر ہے، اور امام محمدؒ کے نزدیک ہاتھ چھوڑے رکھنا بہتر ہے۔ (دیکھئے: اعلاء السنن: ۶؍۱۲۲) چونکہ قنوتِ نازلہ ''قومہ'' کی حالت میں پڑھا جاتا ہے، اور قومہ کی حالت میں ہاتھ چھوڑے رکھنا مسنون ہے، اس لئے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے، کہ ہاتھ چھوڑے رکھے، البتہ بعض شوافع اور حنابلہ کے نزدیک قنوتِ نازلہ میں بھی اسی

طرح ہاتھ اٹھانے کی گنجائش ہے، جس طرح عام دعاؤں میں ۔ (دیکھئے: المغنی: ۲ / ۵۸۴ بہ تحقیق ترکی وغیرہ) مگر خاص نماز کی حالت میں ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنے میں غالباً کوئی حدیث نہیں ۔

رہ گئے قنوتِ نازلہ کے الفاظ، تو اس سلسلہ میں کچھ خاص الفاظ ہی کی پابندی ضروری نہیں، ''واما دعاءہ فلیس فیہ دعاء موقت'' (البحر الرائق: ۲ / ۴۱) البتہ ظاہر ہے کہ جو الفاظ رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ سے ثابت ہوں، ان کو پڑھنے کا اہتمام کرنا بہتر ہے، اس سلسلہ میں ایک تو حضرت علی ؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو ان الفاظ میں دعاء سکھائی:

''اَللّٰهُمَّ اهْدِنِي فِيْ مَنْ هَدَيْتَ وَعَافِنِيْ فِيْمَنْ عَافَيْتَ وَتَوَلَّنِيْ فِيْمَنْ تَوَلَّيْتَ، وَ بَارِكْ لِي فِيْمَا اَعْطَيْتَ وَقِنِي شَرَّ مَاقَضَيْتَ، فَاِنَّكَ تَقْضِيْ وَلَا يُقْضٰى عَلَيْكَ وَاِنَّهٗ لَا يَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ ، تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ'' ۔

(ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۴۲۵)

اے اللہ ! مجھے بھی ان لوگوں کیساتھ ہدایت عطا فرمایئے، جنہیں آپ نے ہدایت دی ہے، اور مجھے بھی ان لوگوں کے ساتھ عافیت میں رکھئے، جن کو آپ نے عافیت سے سرفراز فرمایا ہے، اور میری بھی ان لوگوں کے ساتھ نگہداشت فرمایئے، جن کو آپ نے اپنی نگہداشت میں رکھا ہے، جو کچھ آپ نے عطا فرمایا ہے اس میں میرے لئے برکت عطا فرمایئے، قضاء وقدر کے شر سے میری حفاظت فرمایئے، کیوں کہ آپ فیصلہ کرتے ہیں، آپ کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، جسے آپ دوست بنالیں وہ ذلیل نہیں ہوسکتا، اور جس کے آپ دشمن ہوں وہ باعزت نہیں ہوسکتا، پروردگار! آپ کی ذات، مبارک اور بلند ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی ایک دعاء پڑھنا منقول ہے، جس کو امام نوویؒ نے بیہقی کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ (الاذکار: ۹۷) اور علامہ شامیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کا اضافہ نقل کیا ہے، جو وتر والی دعاء قنوت پڑھنے کے بعد وہ پڑھا کرتے تھے، اس دعاء میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دعاء کا عطر بھی آ گیا ہے، اس لئے اس دعاء کے الفاظ کا نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

''اللهم اعفر للمومنين والمومنات والمسلمين والمسلمات والف بين قلوبهم واصلح ذات بينهم وانصرهم على عدوك وعدوهم، اللهم العن كفرة اهل الكتاب الذين يكذبون رسلك ويقاتلون اولياء ك، اللهم خالف بين كلمتهم وزلزل أقدامهم وأنزل بهم باسك الذى لا ترده عن القوم المجرمين''

(ردالمحتار: ۲/۴۴۲-۴۴۳)

الٰہی! اصحابِ ایمان مردوں اور عورتوں اور مسلمان مردوں اور عورتوں کی مغفرت فرما دیجئے، ان کے دلوں کو جوڑ دیجئے، ان کے باہمی اختلاف کو دور فرما دیجئے، ان کی آپ کے دشمن اور ان کے دشمن کے مقابل مدد فرمائیے، اے اللہ! کفار اہلِ کتاب پر آپ کی لعنت ہو جو آپ کے رسولوں کو جھٹلاتے ہیں، اور آپ کے اولیاء سے برسرِ پیکار ہیں، اے اللہ! ان کے درمیان اختلاف پیدا کر دیجئے، ان کے قدم کو متزلزل فرما دیجئے، اور ان کو آپ اپنے اس عذاب میں مبتلا فرمائیے، جو مجرم لوگوں سے ہٹایا نہیں جاتا۔

علامہ حصکفیؒ نے لکھا ہے کہ دعاءِ قنوت کے بعد رسول اللہ ﷺ پر درود شریف بھی بھیجنا چاہئے ''ويصلى على النبى ﷺ و به يفتى'' (درالمختار: ۲/۴۴۲)

یہ وقت ہے کہ ہر مسلمان اپنی جبین بندگی خدا کے سامنے خم کر دے، اور پورے الحاح اور فروتنی کے ساتھ اللہ کے سامنے دستِ سوال پھیلائے، کہ دنیا میں اسلام کا نام سربلند ہو، اور اسلام اور مسلمانوں سے بغض رکھنے والے بالآخر آخرت کی طرح دنیا میں بھی محرومی کا حصہ لے کر واپس ہوں۔ ''وما ذالك على الله بعزيز، إنه على كل شئي قدير''۔

(۱۹/۱ اکتوبر ۲۰۰۱ء)

سورج گہن ـــــ اسلامی نقطۂ نظر

سورج، چاند، زمین و آسمان اور تمام سیارے جو فضا میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں، ان کے وجود پر غور کیا جائے تو اللہ کی قدرت اور اس کی طاقت پر یقین بڑھتا ہے، اور ایمان تازہ ہوتا ہے، اس زمینی کرہ سے جن سیاروں کا مشاہدہ کھلی آنکھوں کیا جاسکتا ہے، ان میں سورج سب سے بڑا بھی ہے، اور نظامِ کائنات میں اللہ کے حکم سے سب سے زیادہ اثر انداز بھی، ایک شعلۂ جوالہ ہے، جو مسلسل اپنے سینہ کو جلا رہا ہے، اور اپنی تپش سے کائنات کو زندگی کی حرارت بخشتا ہے۔ خدا کی شان ربوبیت دیکھئے کہ ایسے بڑے طاقتور اور شعلہ بار سیارہ کو بھی ایک دائرہ میں قید کر کے رکھا گیا ہے، جو اس زمینی کرہ کے لئے نہایت موزوں اور مناسب ہے، اگر وہ موجودہ مدار سے ہٹ کر زمین کے قریب آجائے تو پوری کائنات جل کر خاکستر ہو جائے، اور اگر اس کا زمین سے موجودہ فاصلہ اور بڑھ جائے تو پوری زمین برف سے ڈھک جائے، اور کسی جاندار کا زمین پر زندہ رہنا دوبھر ہو جائے، یہ اللہ کی قدرت ہے، کہ اس نے ہم انسانوں کے لئے ایک ایسا چراغ جلایا ہے، جس سے کائنات کا ذرہ ذرہ دمک اٹھتا ہے، لیکن کبھی اس کی لو بڑھ کر زمین میں آگ نہیں لگاتی، انسان اس سے فائدہ تو اٹھاتا ہے لیکن اس کے نقصان سے محفوظ رہتا ہے، اسی لئے اسے اللہ کی ایک نشانی اور آیت قرار دیا گیا ہے۔

اسلام سے پہلے شرک کے غلبہ کی وجہ سے لوگوں پر توہمات کے بادل چھائے ہوئے تھے اور لوگ ہر غیر معمولی واقعہ کو کسی خود ساختہ تصور سے متعلق کئے ہوئے تھے، سورج گہن اور چاند گہن کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ کسی بڑے اور برگزیدہ آدمی کی پیدائش یا وفات پر یہ گہن لگا کرتا ہے۔ اتفاق کہ جس دن صاحبزادۂ رسول حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا، اسی دن سورج گہن لگا، اور لوگوں کو خیال ہوا کہ شاید صاحبزادۂ رسول کی وفات

کی وجہ سے یہ سورج گہن لگا ہے، رسول اللہ ﷺ حالانکہ صاحبزادہ کی وفات کی وجہ سے بہت رنجیدہ خاطر اور دل گیر تھے، لیکن ایسے مواقع پر تنبیہ اور غلط فہمی کے ازالہ کو آپ ﷺ ضروری سمجھتے تھے، اور بروقت اس جانب توجہ فرماتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھائی اور ایک خطبہ ارشاد فرمایا، خطبہ کے درمیان آپ ﷺ نے فرمایا کہ سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، کسی کی زندگی اور موت سے ان میں گہن لگنے کا کوئی تعلق نہیں، جب تم گہن لگتے ہوئے دیکھو تو نماز کی طرف دوڑو۔

(بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۵۸)

یہ رسول اللہ ﷺ کا خاص طریقۂ تربیت تھا کہ جس واقعہ کو لوگ کسی مشرکانہ عقیدہ کی بنیاد بناتے آپ ﷺ اسی کو اللہ کی وحدانیت کی طرف متوجہ کرنے اور عقیدۂ توحید کو تازہ کرنے کا ذریعہ بنالیتے، چنانچہ سورج گہن کے موقعہ پر آپ ﷺ نے جہاں لوگوں کی تفہیم فرمائی اور ایک جاہلانہ توہم پرستی کا ازالہ فرمایا، وہیں آپ ﷺ نے اس موقعہ سے دو رکعت نماز ادا کرنے کی سنت بھی جاری فرمائی، نماز اللہ تعالیٰ کی توحید کا عملی اظہار ہے، اور اس کے ایک ایک عمل سے اللہ سے تعلق اور غیر اللہ سے بے تعلقی کا اظہار ہوتا ہے، جب نمازی نماز شروع کرتے ہوئے ''اللہ اکبر'' کہتا ہے، تو وہ اللہ کی بڑائی کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ غیر اللہ سے بڑائی کی نفی بھی کرتا ہے، سورۂ فاتحہ تمام تر توحید کا بیان اور شرک کی نفی و تردید ہے، غرض نماز کے ایک ایک جز کی روح یہی ہے کہ خدا سے تعلق اور غیر اللہ سے بے تعلقی کا اظہار ہو۔

یہ کچھ اسی موقعہ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ احکامِ شریعت میں متعدد ایسی مثالیں ملتی ہیں، کہ جس موقعہ پر لوگ شرک کے مرتکب ہوتے تھے، اسلام نے اسی موقعہ کو توحید کی تبلیغ و اشاعت اور اس کی دعوت کا ذریعہ بنایا، اسلام سے پہلے لوگ اپنے معاملات میں خیر وشر کو سمجھنے اور نفع ونقصان کا اندازہ کرنے کی غرض سے فال نکالا کرتے تھے، یہ فال بتوں کے سامنے نکالے جاتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی جگہ استخارہ کی نماز کا حکم فرمایا کہ جن اُمور کے بارے میں انسان کے دل میں تذبذب ہو اور وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائے، وہ دو

رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے رجوع ہو، کہ اس کے لئے جس بات میں خیر ہو، وہ اللہ اس کے دل میں ڈال دے، اسی طرح لوگ بتوں کے سامنے قربانی کیا کرتے تھے، آپ ﷺ نے قربانی کو باقی رکھا لیکن بندگی اور عقیدت کی سمت تبدیل کردی، تا کہ یہی عمل جو شرک کا مظہر ہے، توحید کا شعار بن جائے اور اللہ کی بندگی کے رنگ میں رنگ جائے۔ مسلمان دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں، ان کا یہی طور و طریق ہونا چاہئے، کہ وہ خود مشرکانہ تصورات سے متاثر ہونے کے بجائے ہر جگہ اسلامی فکر کو غالب کرنے اور معاشرہ کو توحید کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کریں، نہ یہ کہ ہم خود دوسری قوموں کی نقل کرنے لگیں۔

سورج گہن کو عربی زبان میں ''کسوف'' کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے اس موقعہ سے حضرات صحابہ کو دو رکعت نماز پڑھائی، جس میں بہت طویل قراءت فرمائی، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے پہلی رکعت میں سورۂ بقرہ اور دوسری رکعت میں سورۂ آل عمران کی تلاوت کی۔ (ابوداؤد عن عائشہ حدیث نمبر:۱۰۸٦) جتنی طویل آپ ﷺ نے قرأت فرمائی، اتنا ہی طویل رکوع فرمایا۔ (بخاری، حدیث نمبر:۱۰۵۸) حضرت اسماء کی روایت میں ہے کہ ان پر نماز میں غشی سی طاری ہوگئی، یہاں تک کہ انہیں اپنے سر پر پانی ڈالنا پڑا۔ (بخاری، حدیث نمبر:۱۰۸٦) حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاصؓ سے مروی ہے کہ جب آپ ﷺ رکوع میں گئے تو ایسا لگتا تھا کہ آپ ﷺ رکوع سے اٹھیں گے نہیں، اور جب رکوع سے اٹھے تو اتنی دیر کھڑے رہے کہ گویا کھڑے ہی رہیں گے، اسی طرح آپ ﷺ نے نماز کے تمام ارکان کو ادا فرمایا۔

(ابوداؤد، حدیث نمبر:۱۱۹۴)

نماز میں آپ ﷺ پر اس قدر گریہ طاری تھا کہ بعض روایتوں میں ہے کہ دوسری رکعت کے آخری سجدہ میں آپ ﷺ کی سانس پھولنے لگی، آپ ﷺ روتے جاتے تھے۔ (نسائی، حدیث نمبر:۱۴۸۲) ایک روایت میں ہے کہ بے ساختہ زبان مبارک سے ''اُف اُف'' نکل جاتا تھا، پھر آپ ﷺ خدا کے حضور عرض کناں ہوئے، میرے پروردگار! کیا آپ نے مجھ سے وعدہ نہیں فرمایا کہ میں جب تک ان کے درمیان رہوں آپ انہیں عذاب نہیں دیں گے؟ کیا آپ نے مجھ سے وعدہ نہیں فرمایا کہ جب تک وہ لوگ استغفار کرتے رہیں،

آپ انہیں عذاب میں مبتلا نہیں فرمائیں گے؟۔ (ابو داؤد، حدیث: ۱۱۹۴) غرض ایک گھبراہٹ اور اضطراب کی کیفیت آپ ﷺ پر طاری تھی، نماز سے فارغ ہونے کے بعد بھی جب تک سورج اچھی طرح کھل نہیں گیا، آپ ﷺ قبلہ رخ دعاؤں میں مشغول رہے۔

(ابوداود، حدیث نمبر: ۱۱۸۲)

سورج گہن کے موقع سے آپ ﷺ نے دعاء، تکبیر اور صدقہ کرنے کی بھی تلقین فرمائی، ''فاذا رایتم ذالك فادعوا الله وکبروا وصلوا وتصدقوا'' (بخاری، باب الصدقۃ فی الکسوف) اسی موقعہ سے آپ ﷺ کو جنت کی نعمتوں اور دوزخ کی دردناک سزاؤں کی جھلکیاں بھی دکھائی گئیں، جنت کا خوشگوار نظارہ ایسا تھا کہ بے ساختہ آپ ﷺ کے قدم آگے بڑھ جاتے، اور دوزخ کی ہیبت ناکیاں ایسی تھیں کہ قدم پیچھے ہٹ جاتے۔ (بخاری عن عبداللہ بن عباس، باب صلوٰۃ الکسوف جماعۃ) اس لئے آپ ﷺ نے خاص طور پر اس موقعہ سے صحابہؓ کو اس جانب متوجہ فرمایا کہ وہ عذاب قبر سے حفاظت کی دعا کریں، ''ثم امرهم ان يتعوذوا من عذاب القبر'' ۔ (بخاری، باب التعوذ من عذاب القبر) وجہ اس کی ظاہر ہے۔ سورج جیسا روشن سیارہ جس سے کائنات کا ذرہ ذرہ روشنی کی بھیک حاصل کرتا ہے، خدا کی قدرت ہے کہ اس دنیا سے آج وہ تاریک نظر آرہا ہے، یہ اس لئے کہ چاند، سورج اور زمین کے درمیان چند لمحوں کے لئے حائل ہو گیا ہے، جو معمول کے خلاف ہے، اگر اللہ تعالیٰ سیاروں کی گردش کے نظام میں ایسی تبدیلی فرمادے کہ مسلسل یہ کیفیت برقرار رہے تو زمین کے لئے روشنی کا حصول کس قدر دشوار ہو جائے؟ پھر اگر سورج اپنے مدار سے ہٹ جائے، زمین سے قریب آجائے اور سورج زمین کو اپنی طرف کھینچ لے، تو شاید وہی لمحہ قیام قیامت کا ہوگا، لیکن یہ رحمت خداوندی ہے کہ کائنات کے مختلف سیاروں میں ایسی قوت کشش رکھی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے فاصلہ رکھتے ہوئے اس وسیع وعریض فضا میں سورج گہن یا چاند گہن کا واقعہ قیامت کی، قبر کی، اور آخرت کی یاد دلاتا ہے۔

سورج گہن اور چاند گہن سے متعلق بعض خیالات وتصورات جو عوام میں گردش کرتے رہتے ہیں، ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، ہاں میڈیکل اعتبار سے انسان کی

بینائی یا زیرِحمل جنین پر گہن کا اثر پڑتا ہو، تو ایسا ممکن ہے، اور اس سلسلہ میں ڈاکٹرس اور طبی ماہرین ہی صحیح نقطۂ نظر پیش کر سکتے ہیں، لیکن عوام میں جو یہ بات پھیل گئی ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے سورج گہن کے درمیان حاملہ عورتوں کے لئے کچھ خصوصی احکام ہیں، یہ صحیح نہیں، اسلامی تعلیمات کا خلاصہ بس اسی قدر ہے کہ اس موقع کو کھیل، تماشہ اور لہو ولعب کا سامان بنانے کے بجائے عبرت وموعظت اور رجوع الی اللہ کا ذریعہ بنایا جائے، اور یہ واقعہ ایمان کی تجدید، یقین میں اضافہ، آخرت کے استحضار اور رجوع الی اللہ کا ذریعہ اور محرک بنے، یہی اس عظیم کائناتی واقعہ کا پیغام اور اس کی دعوت ہے۔

(۱۳؍اگست ۱۹۹۹ء)

شہابِ ثاقب ـــــ اسلامی نقطہ نظر

۱۷ر اور ۱۸ر نومبر کی شب قدرت کی آتش بازی کی شب تھی۔ اس رات آسمان سے شہاب ثاقب کی ایسی خوبصورت بارش ہوئی کہ ایک طرف آنکھیں اس کی دید کے لئے مشتاق تھیں اور دوسری طرف سائنس داں لرزہ براندام تھے کہ کہیں ان شوخ انداز پری پیکر شہابیوں کے قدم ناز فضا میں بنائے ان کے مصنوعی گھروندوں (سیاروں) کو نقصان نہ پہنچائیں۔ یہ شہاب ثاقب پانچ ہزار فی گھنٹہ کی تعداد میں زمین کی طرف لپک رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے ۱۸۳۳ء اور ۱۹۶۶ء میں بھی لوگوں کو یہ خوشگوار منظر دیکھنے کو ملا تھا۔ ۱۸۳۳ء میں شہاب ثاقب کی بارش کا یہ منظر ایک مؤرخ آر۔ایم۔ڈیونس کو اس قدر بھایا کہ اس نے اسے امریکہ کی تاریخ کے سو یادگار واقعات میں شمار کیا، اس قدرتی فلکیاتی واقعہ نے ہفتوں اخبارات اور جرائد میں کلیدی اہمیت حاصل کرلی اور فکر ونظر کا موضوع بنا رہا، اس کے فوائد اور نقصانات پر گفتگو ہوتی رہی اور امکانی خطرات اور اندیشے غور وفکر کا محور بنے رہے۔ آیئے! اس مسئلہ کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے، کہ کوئی سا بھی واقعہ پیش آئے ایک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اسی پہلو سے اس پر غور کرے اور اس کو اپنے لئے عبرت وموعظت کا، ایمان میں اضافہ کا اور ذکر واصلاح کا ذریعہ بنائے۔

قرآن نے خدا کو صرف زمین ہی کا رب قرار نہیں دیا ہے بلکہ خدا کو ''ربّ العالمین'' کہا ہے، یعنی پوری کائنات اور تمام عالموں کا رب۔ اس لئے اس دنیا کی فضا میں جو بے شمار بڑے چھوٹے، گرم اور ٹھنڈے، حیات کے لائق اور اس کے لئے غیر موزوں جتنے سیارے ہیں، وہ سب ایک نظام سے مربوط ہیں اور حکمِ الٰہی کے تابع ہیں۔

سورج یا کسی سیارہ سے شہابیوں کا گرنا قرآن مجید نے تسلیم کیا ہے۔ (الحجر:۱۵) حدیثوں میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ (بخاری:۶۸۲/۲)

اللہ تعالیٰ نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ ہم نے آسمان میں ''برجیاں'' یعنی حفاظتی قلعے بنائے ہیں، ''ولقد جعلنا فی السماء بروجًا'' (الحجر:۱۶) عربی زبان میں ''سماء'' آسمانی کائنات کو بھی کہتے ہیں، جس کا ٹھوس وجود ہے اور واقعۂ معراج میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے گو انسان کی عقل کوتاہ نے وہاں تک رسائی حاصل نہیں کی ہے اور ''سماء'' کے معنی فضا کے بھی ہیں، جو بظاہر محض ایک خلا محسوس ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں اَن دیکھے قلعے تعمیر کئے ہوئے ہیں۔ یہ جہاں ایک طرف زمین سے اوپر کی طرف چڑھنے والی آلودگیوں کو تحلیل کرتی ہے اور انسان کو اس کے نقصان اور مضر اثرات سے بچاتی ہے وہیں دوسری طرف فضا میں جو بے شمار سیارے شب و روز مصروف رقص ہیں اور چلتے چلتے کبھی ان کے پاؤں نہیں تھکتے، ان کی طرف سے ہماری اس زمینی دنیا کو نقصان پہنچانے والے جو فضلات گرتے ہیں، ان کو بھی تحلیل کرتی جاتی ہے، یا تو ان کو زمین تک پہنچنے نہیں دیتی یا زمین تک پہنچتے پہنچتے ان کا حجم بہت ہی معمولی ہو جاتا ہے۔ عجب نہیں کہ یہی فضائی قلعے ہوں جن کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے۔

دنیا میں شہابی پتھروں کے جو نمونے پائے گئے ہیں، ان میں سب سے بڑا پتھر چھ سو پینتالیس (۶۴۵) پونڈ وزن کا ہے، جو گرنے کے بعد گیارہ فٹ زمین کے اندر دھنس گیا، ایک اور مقام پر'' ساڑھے چھتیس ٹن لوہے کا تودہ'' پایا گیا، جس کے بارے میں سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ شہاب ثاقب ہی ہے جو زمین تک آ پہنچا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر شہاب ثاقب اپنی اصل صورت میں زمین پر وارد ہوتا رہے تو یہ زمین پر بسنے والوں کے لئے کتنی بڑی آزمائش ہوگی؟ یہ تو شہاب ثاقب کا حجم ہے اور یہ کتنی بڑی تعداد میں ہر دن زمین کی طرف گرتے ہیں اس کا اندازہ ان اعداد و شمار سے کیجئے جن کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۴۶ء، ۱۵/۳۰_۳۳۷) کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

''زمانۂ حال کے مشاہدات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ دور بین سے دکھائی دینے والے شہاب ثاقب جو فضائے بسیط سے زمین کی طرف آتے نظر آتے ہیں، ان کی تعداد کا اوسط ۱۰ کھرب روزانہ ہے، جن میں سے دو کروڑ کے قریب ہر روز زمین کے بالائی خطے میں داخل ہوتے ہیں اور بمشکل ایک زمین کی سطح تک پہنچتا ہے، ان کی رفتار بالائی فضا میں کم و بیش ۲۶ میل فی سکنڈ ہوتی ہے اور بسا اوقات ۵۰ میل فی سیکنڈ تک دیکھی گئی ہے، بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ برہنہ آنکھوں نے بھی ٹوٹنے والے تاروں کی غیر معمولی بارش دیکھی ہے، چنانچہ یہ چیز ریکارڈ پر موجود ہے کہ ۱۳ر نومبر ۱۸۳۳ء کو شمالی امریکہ کے مشرق علاقے میں صرف ایک مقام پر نصف شب سے لے کر صبح تک ۲ لاکھ شہاب ثاقب گرتے ہوئے دیکھے گئے''۔

(تفہیم القرآن: ۲/۵۰۱)

یہ تو شہاب ثاقب کے سلسلہ میں وہ فلکیاتی حقائق ہیں جن کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے۔ قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ اس ''نظر آنے والی حقیقت'' کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی ''غیبی حقیقت'' کو بھی متعلق کر دیا ہے، جسے انسان نہیں دیکھ سکتا اور وہ یہ کہ عالم بالا پر اللہ تعالیٰ کے جن فیصلوں کا اعلان فرشتوں کے درمیان کیا جاتا ہے، شیاطین ان کو سننے اور جاننے کے لئے اُوپر چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، شہاب ثاقب کی یہ بارش ان کو اس سے روکتی ہے اور آسمان تک رسائی سے محروم رکھتی ہے۔ قرآن نے کئی مواقع پر اس کا ذکر کیا ہے۔ (الحجر: ۱۸، الملک: ۵)

بعض لوگوں کو اس طرح کی باتیں خلافِ عقل معلوم ہوتی ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ قانونِ فطرت کے تابع ہے، شیطان کے بھگانے اور اس کے سفر آسمانی کو روکنے سے اس کا کیا تعلق؟ لیکن اس اعتراض میں کوئی وزن نہیں، ایک ہی واقعہ کا ایک ظاہری سبب ہوسکتا ہے، جو نگاہ کے احاطہ میں ہو۔ اور ایک چھپا ہوا سبب، جسے دیکھا نہ جاسکے، اسی اَن دیکھے سبب تک

پہنچنے اوراس کو ماننے کا نام ''ایمان بالغیب'' ہے۔انسان اپنے وجود ہی پر غور کرے، بظاہر انسان کا وجود ایک مرد اور ایک عورت کے ملاپ کا نتیجہ ہے، لیکن کیا روح و زندگی کے پیدا ہونے کے لئے یہی کافی ہے؟ کیا یہ بات انسان کی قدرت میں ہے کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے کسی زندہ انسان کو وجود بخشے؟ اور کیا انسان کا یہ صنفی عمل ہمیشہ ہی تولید کا ذریعہ بنتا ہے؟ یقیناً اس کا جواب ''نفی'' میں ہے۔صنفی تعلق ایک ظاہری سبب ہے، لیکن اس کے پیچھے ''حکمِ خداوندی'' کا حقیقی سبب کارفرما ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہی ہے جو انسان کے وجود کا سبب بنتا ہے ورنہ کوئی جوڑا لاولد نہیں ہوتا اور ہر ماں باپ کے کتنے ہی بال بچے ہوتے۔

اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ اس نے انسان کے امتحان کے لئے بہت سی حقیقتوں کو چھپا رکھا ہے۔تاکہ اس بات کی آزمائش ہو سکے کہ انسان اَن دیکھی حقیقتوں پر بھی یقین کرنے کو تیار ہے! اللہ تعالیٰ انسانوں کی سرزنش اور تنبیہ کے لئے بارش روکتے ہیں اور کبھی حد سے زیادہ بارش بھیجتے ہیں، سیلاب بلاخیز، علاقہ کے علاقہ کو تباہ و تاراج کر دیتا ہے، طوفان اور زلزلہ کا عذاب آتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ایک عذاب یہ بھی ہے کہ کوئی قوم باہمی افتراق میں مبتلا ہو اور ان کے دل ایک دوسرے سے ٹوٹ جائیں۔یہ سب خدا کی طرف سے پیش آنے والے غیر معمولی واقعات ہیں، لیکن ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے ظاہری اسباب سے متعلق کر دیا ہے، تاکہ خدا جن باتوں کو بن دیکھے منوانا چاہتا ہے وہ بے حجاب ہو کر انسان کے سامنے آجائیں۔آخرت کی دنیا وہ دُنیا ہوگی جس میں یہ تمام حقیقتیں بے حجاب ہو کر انسان کے سامنے آجائیں گی، فرشتے ان کی نگاہوں میں ہوں گے، جنت و دوزخ کو وہ اپنے سر کی آنکھوں دیکھے گا، صالحین تجلی ربانی کو اپنا سرمۂ چشم بنائیں گے، اس دن ان حقیقتوں پر ایمان لانے کا کوئی وزن نہ ہوگا، کیوں کہ یہ ایک دیکھی ہوئی حقیقت کا اقرار ہوگا۔غرض شہابِ ثاقب کے ٹوٹنے کا ایک ظاہری سبب ہے، جو انسانی عقل کی گرفت میں آچکا ہے اور ایک غیبی سبب ہے جس کو انسان کی عقل نارسا دریافت نہیں کر سکتی اور جس کا

علم ہمیں خود خدا کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات سے ہوتا ہے۔ یہ بات نہ خلافِ عقل ہے اور نہ خلافِ فطرت۔

ایسے غیر معمولی کائناتی واقعات پیش آنے کی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ کیا کائنات محض ایک تماشہ گاہ ہے اور ہم اس کے تماشہ بیں؟ یا ایسے واقعہ کے لئے کوئی اسوۂ نبوی بھی موجود ہے؟...... یقیناً موجود ہے! آپ نے سورج گہن کے موقع سے نماز ادا کی ہے، کیوں کہ یہ ایک غیر معمولی کائناتی واقعہ ہے، چاند گہن کے موقع سے بھی آپ ﷺ نے نماز پڑھنے کی ہدایت دی ہے۔ (بخاری: ۱/۱۴۵) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے زلزلہ کے موقع سے نماز ادا فرمائی۔ (سنن ابی داود) اسی لئے فقہاءِ حنفیہ اور شوافع نے زلزلہ، مسلسل بجلی کی چمک، تیز ہوا، دن کے وقت تاریکی، رات کے وقت غیر معمولی روشنی، مسلسل بارش اور برف باری، وبائی امراض کے پھوٹ پڑنے اور اس طرح کی آفتوں کے موقع پر تنہا تنہا دو رکعت نماز ادا کرنے کو مستحب قرار دیا ہے۔ (مراقی الفلاح: ۹۲، بدائع الصنائع: ۱/۲۸۳، شرح مہذب: ۵/۵۸) اور زلزلہ میں تو فقہاءِ حنابلہ نے بھی اس طرح نماز پڑھنے کو مستحب کہا ہے۔ (کشاف القناع: ۲/۶۷، المغنی: ۲/۲۲۹) اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ: جب تم اس طرح گھبراہٹ والی چیز دیکھو تو دُعاء کے ذریعہ اللہ کی طرف متوجہ ہو اور بعض روایتوں میں ہے کہ اللہ کا ذکر اور استغفار کرو۔

(نصب الرایہ ۲/۲۳۴)

ظاہر ہے کہ معمول سے بڑھ کر شہاب ثاقب کی بارش کا واقعہ یقیناً گھبرا دینے والا واقعہ ہے، کیوں کہ اگر یہ شہاب ثاقب اپنے اصل حجم میں زمین پر آپہنچے اور فضا سے گزر کر زمین پر یہ بارش ہونے لگے، تو شاید ہی کائنات کی کوئی چیز بچ سکے اور اگر وہ ان مصنوعی سیاروں ہی کو تباہ کر دے جن کو انسان نے فضا میں بھیجا تو یہی کچھ کم تکلیف دہ نہ ہوگا اور جو لوگ آج کی ترقی یافتہ دُنیا میں رہنے کے عادی ہو چکے ہیں، مواصلات اور ابلاغ کے جدید ذرائع پر جن کا کاروبار اور بہت سی بنیادی ضروریات موقوف ہیں، ان کے لئے یہ حادثہ

زندگی کو کتنا بے لطف کر کے رکھ دے گا۔

اس لئے ایسے موقع پر مستحب طریقہ یہ ہے کہ دو رکعت نفل نماز عام نمازوں کی طرح ادا کی جائے، نماز تنہا ادا کی جائے نہ کہ جماعت سے، دعاء کی جائی کہ خداوند!! اس واقعہ کے شر سے ہماری اور پوری انسانیت کی حفاظت فرمایئے۔

(۲۷ر نومبر ۱۹۹۸ء)